مجموعه تحقیقات علمیه

جامعہ عثمانیہ

(شعبه هائے دینیات و فنون)

جلد هفتم

سنه ۱۳۴۹ فصلی م سنه ۱۹۳۹-۴۰ عیسوی م سنه ۱۳۵۸-۵۹ هجری

مجالس تحقیقات علمیه (دینیات و فنون) جامعۂ عثمانیا

حیدرآباد۔ دکن

مجموعۂ تحقیقات علمیہ

جامعۂ عثمانیہ

(شعبہ ہائے دینیات و فنون)

جلد ہفتم

سنہ ۱۳۴۹ فصلی م سنہ ۱۹۳۹ تا ۴۰ عیسوی م سنہ ۱۳۵۸ تا ۵۹ ہجری

من جانب

مجالس تحقیقات علمیہ (دینیات و فنون) جامعۂ عثمانیہ
حیدرآباد دکن

حصّہ اردو مطبوعہ اعظم اسٹیم پریس گورنمنٹ ایجوکیشنل پرنٹرز حید

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اداریہ

مختلف وجوہ کی بناء پر یہ مناسب خیال کیا گیا کہ
مجموعۂ تحقیقات علمیہ جامعۂ عثمانیہ کو دو حصّوں میں
تقسیم کیا جائے۔ ایک میں سائنس کے مضامین ہوں
دوسرے میں دینیات وفنون کے۔ اس شمارہ سے اس تقسیم کا
آغاز کیا جاتا ہے۔ حسب سابق مضامین
اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں شائع ہوں گے
البتہ عام فائدہ کی مدنظر ہر مقالہ کا خلاصہ جو کسی
ایک زبان میں لکھا گیا ہو دوسری زبان میں دیا جائے گا۔

مجالس تحقیقاتِ علمیہ دینیات و فنون

قاضی محمد حسین، ام اے، ال ال، بی (کنٹب)، نائب معین امیر جامعہ (صدر)

ارکان

شعبۂ دینیات

۱۔ جسٹس نواب ناظر یار جنگ بہادر ...... (میر شعبہ)

۲۔ عبدالحق، بی لٹ؛ ڈی، فل (آکسن) ...... (رکن)

۳۔ ظہیرالدین احمد، ڈی، لٹ (مصر) .... (رکن)

۴۔ محمد حمید اللہ ام اے، ال ال، بی (عثمانیہ)
ڈی فل (بون)، ڈی لٹ (پاریس)، وغیرہ۔ (رکن)

۵۔ مولانا مناظر احسن گیلانی .... (معتمد)

شعبۂ فنون

۱۔ حسین علی خاں، بی، اے (آکسن) بار اٹ لا (میر شعبہ)

۲۔ خلیفہ عبدالحکیم ام اے، ال ال، بی (پنجاب)
ڈی، فل (ہائیڈل برگ) .... (رکن)

۳۔ ہارون خاں شیروانی، ام، اے (آکسن) بار اٹ لا (رکن)

۴۔ محمد نظام الدین، مولوی فاضل (حیدرآباد)
پی ایچ ڈی (کنٹب) ... (رکن)

۵۔ عبدالحق، بی، لٹ، ڈی، فل (آکسن) ...... (معتمد)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عہد نبوی کے میدان جنگ

باعثِ تحریر حالیہ چند صدیوں میں علوم و فنون کی ترقی سے جنگ کے طریقوں اور اصولوں میں اتنا کچھ انقلاب آگیا ہے کہ قدیم زمانے کی لڑائیاں، چاہے اپنے زمانے میں کتنی ہی عہد آفریں کیوں نہ رہی ہوں، اب بچوں کا کھیل معلوم ہوتی ہیں۔ آج کل بڑی سلطنتوں کے لئے ایک ایک کروڑ کی فوج کو بیک جنبش قلم حرکت میں لا لینا معمولی بات ہے۔ اسلحہ میں اتنی کچھ ترقی ہوگئی ہے کہ قدیم ہتیار عجائب خانوں میں رکھنے کے سوائے بہت کم کچھ کام آسکتے ہیں۔ ذرائع حمل و نقل بھی اب پہلے سے اتنے بدل گئے اور تیز اور کثیر ہوگئے ہیں کہ مہینوں کا کام گھنٹوں میں ہوجاتا ہے۔ اور انھیں وجوہ سے شاید ایک عامی یہ خیال کرتا ہوگا کہ قدیم زمانے کی جنگوں کا تذکرہ چاہے مورخ کے لئے کتنا ہی اہم ہو، ان کا عملی فائدہ آج کل کچھ نہیں۔

لیکن انگلستان میں طلبائے حربیات کو پہلے ہی دن سنا دیا جاتا ہے کہ:-

"It must be understood by all officers that the most important part of their individual training is the work they do by themselves . . . Military history must unquestionably have the most important place in such study as being the best means of learning the true meaning of the principles of war and their application, and of studying the preponderating part which human nature

"جملہ افسروں کو یہ جان لینا چاہیے کہ ان کی انفرادی تربیت کا سب سے اہم جزء وہ کام ہے جسے وہ خود انجام دیں .... فوجی تاریخ کو بلا شک و شبہہ اس قسم کے مطالعے میں سب سے اہم جگہ ملنی چاہئے کیونکہ اصول جنگ کے صحیح مفہوم اور ان کے اطلاق کو سمجھنے اور یہ معلوم کرنے کا کہ ہر فوجی کارروائی میں انسانی فطرت ہی سب سے زیادہ موثر حصہ لیتی ہے، یہی سب سے بہتر ذریعہ ہے

plays in all operations ... Military history, as already stated, is of great importance in the instruction of officers. It is for this reason that a special campaign, or a special period of a campaign, is selected every year for general study during the individual training season.

..... جیسا کہ بیان ہوا، افسروں کی تعلیم میں فوجی تاریخ کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انفرادی تربیت کے موسم میں ہر سال عام مطالعے کے لئے کوئی خاص فوجی مہم یا کسی مہم کا کوئی خاص دور منتخب کیا جاتا ہے۔

"In the study of military history the object should be to derive from the records of the past campaigns lessons applicable to the present. To read with a view to acquire merely knowledge of historical events is of little value. The size of modern armies and their improved armaments and means of communication render many lessons of the past inapplicable to the present. But human nature and the underlying principles of war do not change, and it is for this reason that valuable lessons can be learned from even the most ancient campaigns."

(War Office Training Regulations, 1934, pp. 23-25)

"فوجی تاریخ کے مطالعے کا مقصد یہ ہونا چاہیئے کہ گزشتہ فوجی معرکہ آرائیوں کی یادداشت سے ایسے سبق حاصل کریں جن کا اب اطلاق ہو سکے۔ صرف اس غرض سے پڑھنا کہ محض تاریخی واقعات کا علم ہو جائے کچھ زیادہ مفید نہیں۔ زمانہ حال کی فوجوں کی وسعت، اور ان کے ترقی یافتہ اسلحہ اور ذرائع حمل و نقل کے باعث ماضی سے حاصل ہونے والے بہت سے سبق حال پر منطبق نہیں ہو سکتے۔ لیکن انسان کی فطرت اور وہ قواعد جن پر جنگ مبنی ہوتی ہے بدلتے نہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ نہایت قدیم زمانے کی معرکہ آرائیوں سے بھی قیمتی سبق سیکھے جا سکتے ہیں۔"

یہ ظاہر ہے کہ گزری ہوئی معرکہ آرائیوں کے مطالعے سے پورا فائدہ اسی وقت اٹھایا جا سکتا ہے جب اس بات کا نہایت احتیاط کے ساتھ پتہ چلایا جائے کہ سپہ سالاروں نے اصول کا کس طرح انطباق کیا اور اس سے کیا نتائج پیدا ہوئے۔

عہد نبوی کی جنگیں تاریخ انسانی میں غیر معمولی طور سے ممتاز ہیں۔ اکثر دگنی تگنی اور بعض وقت دس دس گنی قوت سے مقابلہ ہوا۔ اور قریب قریب ہمیشہ ہی فتح حاصل ہوئی۔ دوسرے، چند محلوں پر مشتمل ایک شہری مملکت 'City-State' (سٹی اسٹیٹ) سے جو آغاز ہوا وہ روزانہ دو سو چوہتر مربع میل کے اوسط سے وسعت اختیار کرتی ہے اور دس سال بعد جب آنحضرت صلعم کی وفات ہوئی تو دس لاکھ سے بھی زیادہ مربع میل کا رقبہ آپ کے زیر اقتدار آ چکا تھا۔ اس تقریباً ہندوستان کے برابر وسیع علاقے کی فتح میں، جس میں یقیناً ملیونوں کی آبادی تھی، دشمن کے بمشکل ڈیڑھ سو آدمی قتل ہوئے۔ مسلمان فوج کا مشکل سے اس دس سال میں ماہانہ ایک سپاہی شہید ہوتا رہا۔ انسانی خون کی یہ عزت تاریخ عالم میں بلا خوف تردید بے نظیر ہے۔

حدود حرم بر سمت حدیبیہ

۱/۲ قریۂ شمیسی اور میدان حدیبیہ
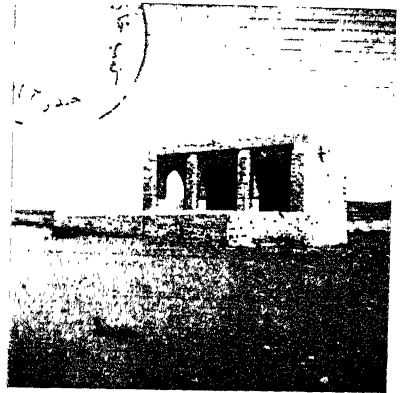
۱/۳ مسجد شجرہ (حدیبیہ)
جہاں بیعت تحت الشجرہ ہوئی تھی

۱/۴ مسجد عقبہ جہاں ہجرت سے پہلے
بیعت ہائے عقبہ ہوئی تھیں

غار حرا جس میں پہلی وحی نازل ہوئی تھی

غار ثور جہاں ہجرت کے وقت

پھران فتوحات کا دوسرا پہلو، قبضے کا استحکام، مفتوحوں کی ذہنیت کی کایا پلٹ اور ان کا مکمل طور سے اپنا لیا جانا اور ایسے افسروں کی تربیت کرجانا کہ آپؐ کی وفات کے پندرہ ہی سال بعد تین براعظموں (ایشیا، افریقا اور یورپ[1]) پر پھیلنے کی حکومت کا قائم ہو جانا یہ تمام اور دیگر امور ہیں عہد نبوی کی جنگوں کا مطالعہ کرنے کا غیر معمولی طور سے شایق بنا دیتے ہیں۔

مشکلات سیرت نبویؐ پر دنیا کی ہر مہذب زبان میں کم یا زیادہ تفصیل کے ساتھ مواد فراہم ہو چکا ہے۔ اس مواد کے فراہم کرنے والے دوست بھی ہیں، مخالف و معاند بھی۔ سیرت نبویؐ کے جنگی حصے پر بھی مواد کی کوئی کمی نہیں لیکن غزوات نبویؐ پر تاریخی نہیں بلکہ حربیاتی (فن حرب کے) نقطۂ نظر سے میرے پڑھنے یا سننے میں اب تک کوئی چیز نہیں آئی۔ ساڑھے تیرہ سو سال پہلے کی جنگوں پر کچھ لکھنے کے لئے حربیاتی اور تاریخی دو بالکل مختلف قسم کی مہارتیں درکار ہیں۔ میں ان دونوں سے بھی محروم رہا ہوں۔ لیکن "مردی از عیب برون آید و کاری بکند" کا یا خود میں ان صلاحیتوں کے پیدا ہونے اور "نو من تیل" کے فراہم ہونے کا انتظار کرنا ان تھوڑے بہت معلومات کو بھی ضائع کر دینا تھا جو مطالعے اور سفر سے اتفاقاً مجھے حاصل ہوئے ہیں۔ اس لئے جو بھی مجھ سے ہو سکا مرتب کیا گیا ہے۔ اور اس کی کوتاہیوں کے پورے احساس و اعتراف کے ساتھ۔ افادے و اعلام کے لئے نہیں بلکہ اصلاح و ترمیم کی غرض سے ـــ اہل علم کی خدمت میں پیش ہے۔

تمہید

وجوہات جنگ عام طور سے معلوم ہے کہ ۱۳ قبل ہجرت (۶۱۰ء) میں رسول کریم صلعم نے شہر مکہ[2] سے توحید کی دعوت دینی شروع کی (دیکھئے تصویر غار حرا)۔ چونکہ یہ بلاوا ایک تو ملک کے عام بت پرستانہ موروثی رسم و رواج کے خلاف تھا اور دوسرے اس دعوت پر لبیک کہنا اس کے داعی کو اپنا سردار بنا لینا تھا جو سرداری کو ایک جونیر گھرانے میں منتقل کرنے کے مترادف ہونے کے باعث، اور تو اور خود رسول اللہ کے خاندان (بنی ہاشم) کے متعدد و معمر لوگوں کو سخت ناپسند تھا۔ سینیر گھرانا عملی مخالفت پر اتر آیا تو عوام بھی گھاس پھوس کی طرح ہوا کا ساتھ دینے اور اس کی رو کے رخ جھک جانے پر مجبور تھے۔

---

[1] ۲۷ھ میں حضرت عثمانؓ کے زمانہ میں طبری کے بیان کے مطابق مسلمانوں نے اندلس کے کچھ حصے پر قبضہ کر لیا اور باوجود کمک نہ آنے کے وہیں حاکمانہ و قابضانہ مقیم رہے تاآں کہ ۹۲ھ میں طارق نے آکر فتح کو مکمل کیا۔ (تاریخ طبری صفحہ ۲۸۱۷ Decline and Fall of Roman Empire مؤلفہ گبن ج۵ صفحہ ۵۵۵ وغیرہ

[2] مکے کے سیاسی نظام وغیرہ کے لئے دیکھئے میرا خصوصی مضمون City-State of Mecca رسالۂ اسلامک کلچر حیدر آباد جولائی ۱۹۳۸ء میں

دنیا کی ہر چیز سے منہ موڑ کر تن من دھن سے اس تحریک کو چلانے اور آٹھ دس سال گزر جانے کے باوجود مکے کا چھوٹا سا قصبہ بھی (جیسا کہ وہ اس وقت تھا) ہمنوا نہ ہو سکا بلکہ مخالفت سے جان کے لالے پڑ گئے، شفیق بیوی اور بزرگ خاندان اور حامی و محافظ چچا (ابو طالب) کی ایک ساتھ وفات آپؐ کے لیے معمول سے زیادہ دشواریوں کا باعث بنی کیونکہ نئے بزرگِ خاندان چچا (ابو لہب) سے شروع ہی سے مخالفت تھی اور اب چچا نے بزرگِ خاندان بننے پر ابتداءً تنبیہ کی اور پھر صاف صاف "ذات باہر" کر دیا۔ مجبوراً آنحضرت کو نئے محافظ ڈھونڈھنے پڑے۔ آپؐ کو خیال آیا کہ آپ کے ماموؤں (اخوال) کا خاندان بنو عبد یالیل طائف میں بستا ہے[۵۱]۔ آپؐ کے چھوٹے چچا اور ولی رفیق حضرت عباس طائف میں رقمی لین دین کر کے کافی رسوخ رکھتے تھے[۵۲]۔ یہ مقام مکے سے زیادہ دور بھی نہ تھا۔ یہ پچاس میل ہوتا ہے آج بھی مکے سے عصر کے بعد پانچ بجے کے قریب گدھے پر سوار ہوں تو آدھی رات کو جبل کرا کے دامن میں پہنچ جاتے ہیں۔ فجر کو چڑھائی شروع کریں تو قبل ظہر گدھا طائف پہنچا دیتا ہے۔ اونٹ بیس پچیس میل روز کر کے طریق الجعرانہ پر دو دن لیتا ہے۔ جدید "طریق السیارہ" کے ستر میل ڈاک کی موٹر لاری تین چار گھنٹوں میں طے کر لیتی ہے۔ غرض طائف، جو عام اہل مکّہ کے لئے اس زمانے میں بھی ہر سال گرما میں وہی کشش رکھتا تھا جو اب ہم نیلگری یا شملہ کے لئے محسوس کرتے ہیں، آنحضرت صلعم کو اپنی طرف کھینچتا ہے اور آپؐ بڑی امنگوں کے ساتھ ایک خادم کے ہمراہ وہاں پہنچتے اور وہاں کے رشتہ دار سرداروں میں پرچار آغاز کرتے ہیں۔ مکہ چونکہ طائف کے مال کے لئے نکاسی کی منڈی تھا اور ہر سال گرمیوں میں مکے کے مالدار تاجر طائف آکر اس "ٹورسٹ ٹرافک" کے ذریعے سے وہاں کی آمدنی کا ایک بہت بڑا ذریعہ بنتے تھے اس لئے طائف کے لئے مشکل تھا کہ مکے کو ناراض کرے۔ پھر یوں بھی توحید کی دعوت طائف میں بھی سیاسی اور مذہبی وجوہ سے وہ تمام مشکلیں رکھتی تھی جو مکے میں تھیں۔

طائف میں آج تک وہ باغات اور مقامات محفوظ ہیں جہاں آنحضرت صلعم نے شہر کے شریر بچوں اور ان کے پتھراؤ سے تنگ آکر پناہ لی تھی اور بعض فراخ دل باغبانوں نے آپ کی میوے سے ضیافت کی تھی۔ یہ شہر پناہ کے باہر جنوب مغربی سمت میں دریائے وَجّ کے کنارے کنارے جائیں تو انگور، انجیر وغیرہ کے باغات میں چھوٹی چھوٹی مرمت طلب مسجدوں کی صورت میں ملتے ہیں۔ (دیکھئے تصاویر طائف [۵۳])

غرض طائف کا سفر اتنا بے نتیجہ رہا کہ باوجود جان کے خطرے کے آنحضرت مکّہ ہی واپس ہونا پسند کرتے ہیں اور شہر کے باہر ٹھیر کر بعض شناساؤں کی مدد سے شہر کے متعدد و فیاض سردار ان قبائل سے یکے بعد دیگرے اپنی حفاظت میں لینے کی درخواست کرتے ہیں۔ عام حالتوں میں کوئی عرب کبھی ایسی درخواست کو رد نہیں کرتا مگر آنحضرتؐ کو اپنی پناہ (جوار) میں لینے کے لئے اس وقت غیر معمولی کردار کی ضرورت تھی اور دو تین آدمیوں کے انکار کے بعد آخر ایسا ایک شخص نکل ہی آیا[۵۴]۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ اس پناہ دہی کے معاوضے میں یہ اقرار کرنا پڑا کہ شہر میں تبلیغی تقریریں نہیں کی جائیں گی۔

---

[۵۱] المنتقی لابی نعیم فصل (۲۰)
[۵۲] ابن ہشام ص ۲۵۱
[۵۴] سیرۃ ابن ہشام ص ۲۷۳

مکے کے باہر تبلیغ پر پابندی نہ تھی اور حج کے زمانے میں مکے سے مشرق میں ڈھائی تین میل پر منا کا اجتماع ایک شکل سہی لیکن بہرحال کھلا میدان عمل تھا۔ چنانچہ طائف سے واپس آتے ہی ذیحجہ ۱۰ نبوی میں آپؐ نے منا میں عرب کے شمال وجنوب اور مشرق و مغرب سے آنے والے حجاج کی پندرہ جماعتوں کو یکے بعد دیگرے ٹٹولا[50]۔ اور ایک تو انھیں اپنی تحریک کے اصول اور غرض وغایت سمجھائی اور دوسرے ان سے درخواست کی "مجھے اپنے ملک میں لے چلو اور مجھے اپنی حفاظت میں اس تحریک کو چلانے دو جلدی ہی تم نہ صرف پورے عرب کے سردار ہو جاؤ گے بلکہ قیصر و کسرا کے خزانے بھی تمھارے پاؤوں میں نچھاور ہوجائیں گے[51]"۔ اس بہ ظاہر بڑے بول پر کسی نے مذاق کیا، کسی نے جھڑک دیا، کسی نے قریش کا ڈر بتا کر اخلاق سے معذرت کرلی۔ استقلال کا کیا ٹھکانا ہے کہ یکے بعد دیگرے پندرہ جماعتوں سے یہی کوشش کی۔ ہروقت قریش کا ایک خدائی فوجدار ساتھ لگا رہتا اور دور ہی سے اہل قبیلہ کو لگا بجھا کر کہہ دیتا کہ اس کو مدد دینا نہ صرف ایک مجنون اور جادوگر کا ساتھ دینا ہے بلکہ ہم (قریش) سے لڑائی مول لینا ہے[52]۔

منا کے قریب راستے کے دونوں طرف پہاڑوں کی ایک مسلسل دیوار ہے۔ مکّے سے جائیں تو حدودِ منا شروع ہونے کو بمشکل ایک فرلانگ رہتا ہے کہ بائیں ہاتھ پر اس پہاڑی دیوار میں ایک چھوٹا سا خم آتا ہے جو کمان بلکہ نصف دائرے کی شکل کا ہے اور اتنا بڑا کہ دلی کی جامع مسجد یا حیدرآباد کی مکہ مسجد مع اپنے صحنوں کے اس کے اندر سما سکیں۔ یہ مقام عقبہ کہلاتا ہے[53] اس کے اندر ایک بہت بڑا کنواں ہے اور اندر آج کل زراعت بھی ہوتی ہے، اور جس مقام پر مشہور بیعت ہائے عقبہ ہوئی تھیں، وہاں ایک کافی بڑی مسجد بھی ہے جس پر گو چھت نہیں ہے لیکن قبلہ رخ اور منا کی سمت کی بیرونی دیوار پر دو قدیم کوفی کتبے ہیں اسے آج کل مسجد العشرۃ کہتے ہیں اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ یہی مسجد بیعت عقبہ ہے کیونکہ تاریخ مکہ کے مشہور ماہر تقی الدین الفاسی نے اپنی تاریخ مکہ کے آخری اڈیشن "تحصیل المرام فی اخبار البلد الحرام" (مخطوطہ قرویین، فاس) میں لکھا ہے "مسجد البیعۃ ... وھذا المسجد بقرب عقبۃ منیٰ و بینہ و بین العقبۃ غلوۃ او اکثر وھو علی یسار الذاھب الی منیٰ وعمر فی سنۃ ۱۴۴ ثم ۶۲۹ من قبل المستنصر العباسی والعمارۃ السابقۃ من قبل المنصور۔"

مسجد البیعہ ... یہ مسجد منا کی گھاٹی کے قریب ہے اتنا کہ اس کا اور گھاٹی کا فاصلہ پتھر پھینکنے کی زد یا اس سے کچھ زیادہ ہے اور یہ منا کو جانے والے کے بائیں ہاتھ پر ہے۔ یہ مسجد ۱۴۴ھ میں بنی اور پھر ۶۲۹ھ میں مستنصر باللہ عباسی نے تعمیر کی۔ پہلی تعمیر منصور کے زمانے کی ہے۔

غرض یہ عقبہ ایسا ہے کہ پچیس پچاس آدمی وہاں رہیں تو منا آنے جانے والے اُسے محسوس بھی نہیں کرتے۔ مدینے کے پانچ چھے آدمیوں سے آنحضرتؐ کی یہیں ملاقات ہوئی۔

منا
گھاٹی
کنواں
مسجد
مکہ کو

توضیحی نقشۂ عقبہ مع مسجد العشرہ

---

[50] ابن سعد ج ۱ ص ۱۴۵؛ ابن ہشام ص ۲۸۲ تا ۲۸۳؛ المنتقی لابی نعیم ورق ۱۰۵ تا ۱۰۷ [51] ابن ہشام ص ۲۸۰ [52] ابن ہشام ص ۲۸۲

[53] عقبہ اصل میں پہاڑی راستے یا گھاٹی کو کہتے ہیں اور یہ مقام اصل میں "عند العقبۃ" (گھاٹی کے پاس) کہلاتا ہے۔ گھاٹی سے منا کا راستہ مراد ہے۔
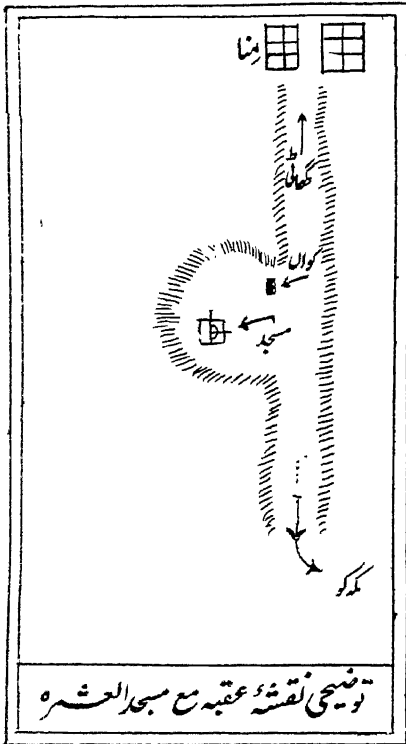
یہ واضح نہیں کہ آیا یہ چھوٹی سی جماعت یہیں اپنا خیمہ لگا کر مقیم تھی یا کسی وجہ سے اس ملاقات کے وقت اس عقبہ میں آئی ہوئی تھی۔ اس جماعت نے اسلام اور توحید کی دعوت سنی توشوق سے گفتگو کی اور ہر طرح امداد کا وعدہ کیا۔ (ابن ہشام ص۲۸۶ ومابعد)

اس جماعت کے اوروں سے اس ذہنی فرق کا باعث معلوم کرنا زیادہ مشکل نہیں۔ اصل میں یہ مدینے والے قبیلۂ خزرج کے لوگ تھے۔ آنحضرتؐ کی والدہ کا اسی قبیلے سے رشتہ تھا[1] چنانچہ اس تقریب سے بچپن میں آنحضرتؐ بھی ایک مرتبہ اپنی والدہ کے ساتھ مدینہ ہوآئے تھے اور اتنے دن رہے تھے کہ وہاں اچھی طرح تیرنا بھی سیکھ لیا تھا[2] آنحضرتؐ کے چچا اور رفیق حضرت عباسؓ بھی جب کبھی کاروبار کے سلسلے میں شام وغیرہ جاتے یا وہاں سے آتے تو راستے میں ضرور مدینے میں ٹھہرتے اور ان رشتہ داروں سے ملتے[3]۔ ان لوگوں کی مدینے کے بعض یہودی قبائل سے حلیفی اور بعض سے حریفی تھی، اور یہ ان یہودیوں سے اکثر سنا کرتے تھے کہ جب مسیح موعود آئے گا تو ہم اس کی مدد سے اپنے تمام دشمنوں کو مغلوب کرلیں گے[4]۔ نوفل اور عبدالمطلب کے جھگڑے کے وقت یہ لوگ آنحضرت کے دادا کی فوجی مدد بھی کرچکے تھے[5]۔ اس لئے ممکن ہے کہ اب آنحضرتؐ کے خاندان کی مدد کی وہ توقع رکھتے ہوں۔ بہرحال ان کی ذاتی صلاحیت کے ساتھ ساتھ ان کے اسلام لانے میں یہ محرکات بھی کام کرتے رہے ہوں گے۔

مدینے میں دو رشتہ دار قبائل اوس و خزرج میں نسلوں سے خونریزیاں ہوتی چلی آرہی تھیں اور اب دونوں اس قدر تھک گئے تھے کہ کسی بھی قیمت پر باہم دوستی کرلینے پر آمادہ تھے[6]۔ ان کی خودداری اور غیرت و رقابت کے باعث کسی غیر مدنی کے لئے دونوں کا مشترکہ سردار بننے کی زیادہ توقع تھی۔ جب مذکورہ چھے خزرجی مدینہ واپس آئے اور اسلام کا چرچا کیا تو سال بھر بعد حج کے موقع پر اوس اور خزرج دونوں کے دس بارہ آدمی آنحضرت سے ملنے کی ٹھان چکے تھے۔ چنانچہ پھر اسی عقبہ میں ان کی آنحضرتؐ سے ملاقات ہوئی اور انھوں نے نہ صرف اسلام قبول کیا بلکہ اپنے اپنے خاندانوں کے بھی اسلام اور آنحضرت کی اطاعت کا اظہار کیا۔ آنحضرتؐ نے ان سے علاوہ توحید، پاکبازی وغیرہ کے ہر اچھی بات (معروف) میں اپنی اطاعت کا وعدہ لیا[7]۔ اور اس طرح اوس و خزرج کے بارہ خاندانوں کے مشترکہ سردار بن گئے۔ ایک تربیت یافتہ مبلّغ مکّے سے ان کے ہمراہ مدینہ بھیجا گیا[8] اور اس نے نہ صرف اوس و خزرج کے متعدد سربرآوردہ لوگوں کو اسلام کا حامی بنا یا بلکہ اس بات میں بھی بدقت مگر مکمل کامیابی حاصل کی کہ اوس و خزرج کی باہمی رقابت اس بات میں مانع نہ آئے کہ یہ دونوں گروہ آنحضرت کی مشترکہ سرداری میں تعاون کریں۔

ایک اور سال گزرا اور سالِ آئندہ میں مدینے کے کوئی پانچ سو حجاج میں سے کوئی بہتر مرد اور عورتیں آنحضرتؐ سے شخصی طور پر اظہار اسلام کرنے اور آپؐ کو مدینہ مدعو کرنے کے لئے آئیں۔ ابھی تک اسلام وہاں اقلیت کا مذہب تھا اور نہ اکثریت قریش سے دوستی بڑھانے کی فکر میں تھی۔ نو دس بجے رات کا عمل تھا کہ یہ بہتر لوگ چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں چپکے چپکے اپنے پڑاؤ سے نکل کر عقبہ میں

---

[1] ابن ہشام ص۱۰۷ [2] سیرۃ الشامیؒ "احسنت العوم فی بئر بنی عدی بن النجار" [3] ابن ہشام ص۲۹۷ [4] ابن ہشام ص۲۸۶ [5] طبری تاریخ ص۱۰۸۰تا۸۲

[6] ابن ہشام ص۲۸۷ [7] ابن ہشام ص۳۰۵ نیز مسند ابن حنبل ج ۳ ص۳۲۲ [8] ابن ہشام ص۲۸۹ ۔

ج/۱

قلعۂ طائف

ج/۲

مسجد ابن عباس ۔ طائف

ج/۳

مقابر شہداء و ضریح حضرت زید بن ثابت ۔ طائف

ج/۴

زرخیز طائف کا عظیم الشان درخت انجیر

ج/۵

طائف کے راستے میں وادیاں

بچ نکلنے پر سخت جھنجھلائے اور کچھ نہ سوجھا تو آپ[۱۰] کی اور دیگر مہاجرین کی جائدادیں ضبط کرلیں۔............ ....(صحیح بخاری کتاب ۶۴ باب ۸۴ حدیث ۳ . سیرۃ ابن ہشام ص۳۲۱ تا ۲۲۲ و ۳۴۹) اور باقی غریب مسلمانوں کو زیادہ ستانے لگے۔

اب عمل کا اصل کٹھن وقت آیا۔ آنحضرت نے ایک طرف مہاجرینِ مکہ اور انصارِ مدینہ میں بھائی چارہ قائم کرا کے بے گھروں کو ٹھکانا مہیا کیا[۵۱] اور اصول یہ قرار دیا کہ جس مہاجر اور انصاری میں بھائی چارہ ہو وہ باہم وارث بھی ہوں[۵۲] اور مل کر رہیں۔ پھر اپنے اور اپنے جملہ متبعین کے حقوق و فرائض مرتب کرکے ان کو تحریری کی صورت دی[۵۳]۔ اس کے بعد مدینے میں رہنے والے یہودی قبائل سے بھی جنگی اور سیاسی حلیفی کی اور انھیں بھی اس پر آمادہ کیا کہ وہ آپ کو اپنا مشترکہ حاکم مانیں[۵۴]۔ مدنی عربوں کی طرح مدنی یہودیوں میں بھی دو رقیب و حریف پارٹیاں تھیں اور آنحضرت کی مشترکہ سرداری ان میں امن قائم کرانے کا باعث ہونے سے انھیں ناگوار بھی نہ تھی۔ یہودیوں کے یہ معاہدے بھی تحریر میں آئے اور ان تمام دستاویزات نے ایک مشترکہ "صحیفہ" کی صورت اختیار کی جسے "شہری مملکت مدینہ کا دستور" کہنا۔ جیسا کہ ولہاوزن[۵۵] نے کہا ہے۔ بے جا نہیں۔ خوش قسمتی سے دنیا کے اس سب سے پہلے تحریری دستور کو تاریخ نے لفظ بہ لفظ محفوظ رکھا ہے[۵۶]۔ اس دستور کے ذریعے سے شہر مدینہ ایک حَرَم اور ایک سیاسی وحدت یا ایک شہری مملکت قرار دیا گیا۔

اصطلاحِ "حَرَم" کے سلسلے میں شاید یہ واضح کردینا ضروری ہے کہ یہ ایک نیم مذہبی نیم سیاسی مفہوم رکھتی ہے اور اس کا رواج اسلام کے پہلے ہی سے نہ صرف عرب کے مختلف مقامات پر بلکہ فلسطین اور یونان وغیرہ میں بھی ملتا ہے۔ اس کا مذہبی مفہوم یہ تھا کہ وہاں کی ہر چیز کو ایک تقدس حاصل رہے۔ وہاں کے چرند و پرند کا شکار نہ کیا جائے، وہاں کے درخت نہ کاٹے جائیں اور وہاں خونریزی نہ کی جائے اور وہاں آنے والوں کو دورانِ قیام میں امن اور پناہ میں سمجھا جائے خواہ وہ مجرم ہی کیوں نہ ہوں۔ حَرَم کا سیاسی مفہوم یہ تھا کہ وہ اس شہری مملکت کے حدود کا تعین کرتا تھا۔ (میں نے ایک مستقل مقالے میں تفصیل سے شہری مملکت مکہ کے سیاسی نظام پر جو زمانۂ جاہلیت میں تھا، بحث کی ہے[۵۷]) مکے کے حدودِ حرم، کہتے ہیں کہ عہد ابراہیمؑ سے چلے آتے ہیں۔ بہرحال زمانۂ جاہلیت میں ان کا پتہ چلتا ہے اور فتح مکہ پر ۸ھ میں آنحضرت نے ان علاماتِ سرحد کی تجدید بھی کرائی تھی[۵۸]۔ جس کی حسبِ ضرورت اب تک برابر تجدید ہوتی چلی آرہی ہے (تصویر ۱، نقشہ ۲)

زیر ذکر دستور مملکت مدینہ میں مدینے کو بھی ایک حَرَم قرار دیا گیا ہے (نقشہ ۳) (۹ھ میں طائف نے اطاعت کی تو طائف کو بھی حَرَم تسلیم کیا گیا جیسا کہ اس کے معاہدے میں[۵۹] صراحت اور تفصیل سے لکھا ہوا ملتا ہے) لیکن یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ

---

[۵۱] ابن ہشام ص۳۴۴ [۵۲] دیکھو کسی تفسیر میں آیت "واولوا الارحام" (س ۸ ۔ ۷۵) [۵۳] ابن ہشام ص۳۴۱ تا ۳۴۴ نیز مجلۂ طیلسانین ۱۹۳۰ء "دنیا کا سب سے پہلا تحریری دستور مملکت" نیز کتاب الاموال [۵۴] ابن ہشام ص۳۴۱ تا ۳۴۴ نیز مجلۂ طیلسانین ۱۹۳۹ء "دنیا کا سب سے پہلا تحریری دستور مملکت" [۵۵] Well hausen, "Gemeindeordnung von Medina."

[۵۶] حوالۂ بالا۔ جملہ دیگر حوالے مجلۂ طیلسانین کے مذکورہ بالا مضمون میں ہیں۔ رسالہ برہان دہلی ۱۹۳۹ء تا ۱۹۴۰ء میں بھی اس پر حال میں بحث آئی ہے۔ [۵۷] رسالۂ اسلامک کلچر ۱۹۳۸ء [۵۸] مرآۃ الحرمین جلد اول

[۵۹] ابو عبید کی کتاب الاموال ۵۰۶ میں معاہدے کا پورا متن ہے۔ [۱۰] آنحضرت کا یہ مکان بی بی خدیجہ سے وراثت میں ملا تھا۔ (مبسوط سرخسی ۱/۵۲)

آیا مدینے میں بھی حدود حرم مقرر کئے گئے۔ صحیح بخاری[1] میں اتنا ذکر ہے کہ آنحضرتؐ نے ایک صحابی کو روانہ کیا تھا تاکہ حرم مدینہ کے حدود پر ستون نصب کریں۔ عام تاریخیں اور کتب حدیث میں حرم مدینہ "ما بین لابتین" اور "ما بین ثور و عیر" بیان کیا گیا ہے[2]۔ "لابة" یا "حرۃ" ان سنگلاخ میدانوں کو کہتے ہیں جہاں آتش فشاں پہاڑوں سے نکلا ہوا لاوہ جلے ہوئے پتھروں کی صورت میں پھیلا ہوا ہو۔ ایسے میدان شہر مدینہ کے مشرق اور مغرب دونوں طرف شمالاً جنوباً ملتے ہیں۔ ثور ایک پہاڑ ہے جو مدینے کے شمال میں جبل اُحد سے بھی کچھ پرے واقع ہے اور جبل عیر مدینے کے جنوب میں ایک بڑا پہاڑ ہے۔ المطری نے (جن کی وفات آٹھویں صدی ہجری کے وسط میں ہوئی) شہر مدینہ کی جو نہایت اہم تاریخ التعریف بما انست الہجرۃ من معالم دار الہجرۃ) لکھی ہے اور جو جملہ متاخرین کا ماخذ ہے، اس میں خوش قسمتی سے اس کی مزید تفصیل ملتی ہے جو یہ ہے:-

"عن کعب بن مالکؓ قال بعثنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اعلم علی اشراف حرم المدینة فأعلمت علی اشراف ذات الجیش وعلی مشیرب وعلی اشراف مخیض وعلی الحفیاء وعلی ذی العشیرة وعلی تیم۔ فاما ذات الجیش فنقب ثنیة الحفیرة من طریق مکة والمدینة واما مشیرب فما بین جبال فی شامی ذات الجیش، بینها وبین خلائق الضبوعة۔ واما اشراف مخیض فجبال مخیض من طریق الشام واما الحفیاء فبالغابة من شامی المدینة واما ذو العشیرة فنقب فی الحفیاء واما تیم فجبل فی شرقی المدینة وذلك كله يشبه ان يكون بريدا فی بريد... ذات الجیش فی وسط البیداء والبیداء هی التی اذا دخل الحجاج بعد الاحرام من ذی الحلیفة استقبلوها مصعدین الی جهة الغرب۔"

مدینہ منورہ کے مشہور سیاح اور وہاں کے کتب خانۂ شیخ الاسلام عارف حکمت بے کے مہتمم ابراہیم حمدی قربیطلی کا مجھ سے بیان تھا کہ مدینے کے مشرق میں ان حدودِ حرم کے کھنڈر اب تک موجود ہیں اور پائے سے کوئی ہاتھ بھر اونچے باقی ہیں۔ چونکہ عہد نبویؐ کے بعد ان حدودِ حرمِ مدینہ کی تجدید کا کہیں پتہ نہیں چلتا اس لئے جبل تیم کے یہ آثار خاص عہد نبوی کی متبرک تعمیر معلوم ہوتے ہیں۔

اس، ایک حد تک، غیر متعلق بحث کے بعد، جیسا کہ بیان کیا گیا، مدینہ آنے پر آنحضرتؐ کا پہلا کام ایک شہری مملکت کی بنیاد ڈالنا تھا۔ ادھر سے فراغت ہوئی تو آنحضرت نے آس پاس کے علاقے پر توجہ مبذول کی۔ عرب کے نقشے پر نظر ڈالیں تو واضح ہوتا ہے کہ مکے والے خشکی کی راہ اگر شام یا مصر جانا چاہتے تو انھیں مدینے کے قریب سے ساحل کے کنارے کنارے گزرنا پڑتا ہے۔ اگر مدینے

---

[1] بخاری [2] المطری (التعریف بما انست الہجرۃ من معالم دار الہجرۃ) بر موقع نیز بخاری جہاد ۲، وغیرہ

ینبوع تک بسنے والے قبائل اور آبادیوں کو ہمنوا کر لیا جائے تو مکے والوں کے قافلے کا ادھر سے گزرنا بڑی آسانی سے خطرناک کر دیا جا سکتا ہے۔ ان قبائل سے انصار کی پہلے ہی سے حلیفی تھی۔ اب آنحضرتؐ نے اس کی تجدید کی اور اس میں جنگی امداد کی دفعہ بھی بڑھائی۔[۵۱]
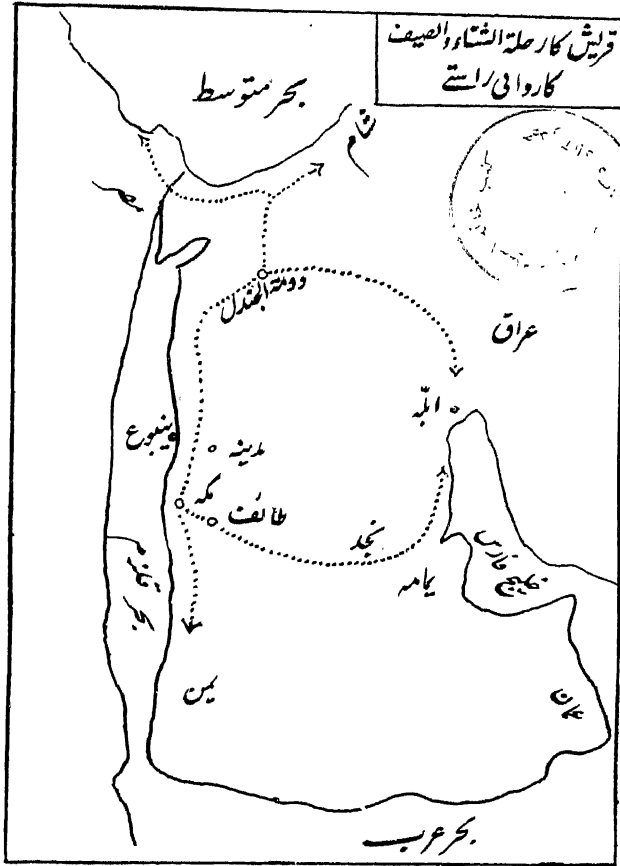
اس تنظیم اور خاموش تیاری میں کئی مہینے لگ گئے۔ اس کے بعد مدینے سے چھوٹی چھوٹی جماعتیں بھیج کر قریشی کاروانوں کو ہراساں کیا جانے[۵۲] اور ان کو یہ بتایا جانے لگا کہ اب انھیں اس اسلام کے زیر اثر علاقے سے گزرنا ہے تو سردار مدینہؐ کی اجازت کی ضرورت ہے۔ قریش نے زور دکھانا اور قوت کے ذریعے سے اپنا راستہ بنانا چاہا۔ اسی کشمکش نے ان خونریزیوں اور لڑائیوں کی صورت اختیار کی جن کے ایک خاص پہلو — میدان ہائے جنگ — پر آج یہاں روشنی ڈالنی مقصود ہے

قریش کا رحلۃ الشتاء والصیف
کاروانی راستے

بحر متوسط
شام
دومۃ الجندل
عراق
الابلہ
ینبوع
مدینہ
مکہ
طائف
نجد
یمامہ
بحیرۂ عرب
یمن
عمان
بحر عرب

بدر

(دیکھئے تصاویر ۱ ، ۲ ، ۳ ، نقشہ ۱)

محل وقوع

چونکہ حجاز یعنی عرب کے مغربی علاقے میں پہاڑ یاں ہی پہاڑیاں ہیں اس لئے وادیاں اور گھاٹیاں ہی آنے جانے کا راستہ ہیں۔ کاروانی راستہ عموماً چوڑی وادیوں سے گزرتا ہے۔ گھاٹیوں کا راستہ زیادہ دشوار گزار ہے۔ غرض کسی جگہ جانے کے یہاں ایک سے زیادہ راستے ہوتے ہیں۔ یہی حال بدر کا ہے۔ عہد نبوی اور اس سے پہلے مکے، مدینے اور بدر کا راستہ جن مقاموں یا منزلوں سے گزرتا تھا وہ اب بڑی حد تک بدل گیا ہے کیونکہ جب سے اسلام آیا اور حج کو جانے والے ہزاروں سے گزر کر لاکھوں ہونے لگے اور ابھی جنگ عظیم سے پہلے دس دس پندرہ پندرہ ہزار اونٹوں کے قافلے معمولی بات تھی تو لازمی طور پر پانی اور پڑاو کی ضرورتوں نے بعض منزلوں کو بدلنے پر مجبور کیا۔ اور ترکی زمانے کا "طریق سلطانیہ" وجود میں آیا۔ آج کل یہی اختیار کیا جاتا ہے۔ سعودی دور میں موٹریں بھی آ گئی ہیں۔ ان کے راستے کی ضرورتیں اور ہی ہیں۔ اسی طرح سفر صلح حدیبیہ کا راستہ الگ تھا۔ غزوہ فتح مکہ میں قریش کو خبر نہ ہونے دینے کے لئے ایک بالکل ہی اور راستہ اختیار کیا گیا تھا۔ اور سفر

---

۵۱ ابن ہشام، ابن سعد، وغیرہ میں یہ معاہدات ہیں تفصیل کے لئے دیکھئے میری کتاب مطبوعہ مصر ۱۹۴۱ء الوثائق السیاسیہ ۵۲ ابن سعد ج ۱ ق ۱ ص ۲ تا ۷

حجۃ الوداع کا ایک اور ۔ جن کی تفصیلیں ابن ہشام وغیرہ میں ملتی ہیں۔

بدر کو اب تک موٹر نہیں جا سکتی ہے کیونکہ راستے میں کئی جگہ متعدد بہت بلند گھاٹیاں ہیں اور بہت نرم ریت ملتی ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ خاص انتظام کے بغیر مکے اور مدینے کے مابین اونٹوں کے سفر پر بھی بدر پر سے نہیں گزر سکتے ۔

مدینے سے آنے والے مُسَیجد (تصویر ۲/۱) پر طریق سلطانیہ چھوڑ دیتے ہیں اور قصبۂ خیف (تصویر ۲/۳) سے گزر کر حمراءُ (تصویر ۱/۲) میں منزل کرتے ہیں پھر قصبۂ حصکیفہ سے گزر کر بدر پہنچتے ہیں۔ اس کے برخلاف مکے سے جانے والے بئرالشیخ پر سے کسی قدر آگے ورب العجرہ پر طریق سلطانیہ چھوڑتے ہیں اور صبح نکلیں تو شام تک بدر پہنچ جاتے ہیں۔ بدر سے مدینے تک کا راستہ بہت سرسبز ہے۔ میلوں لمبے نخلستان ملتے ہیں، راستے میں خاص کر بدر و حمراء کے مابین گھنے جنگل بھی ہیں۔ پانی بھی میٹھا ہے۔ اونٹوں اور بھیڑ بکریوں کے گلے بھی ہر جگہ چرتے نظر آتے ہیں۔
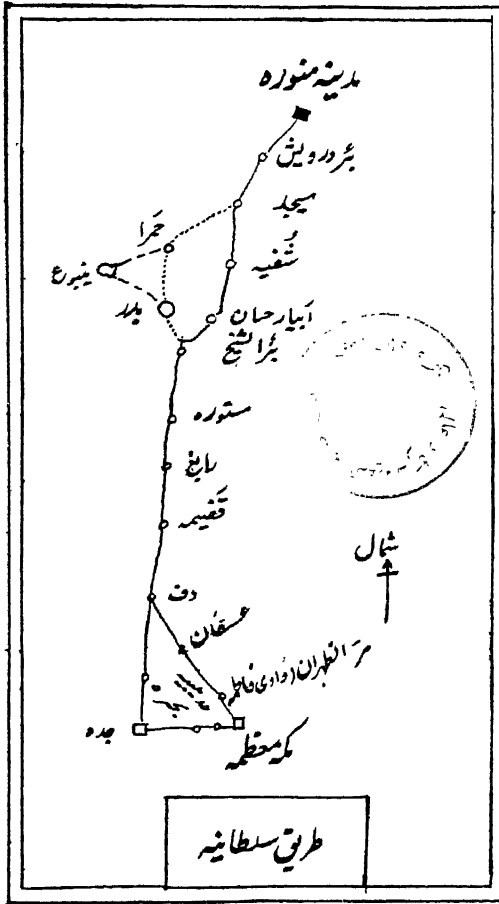
موجودہ شہر بدر

شہر بدر کی تاریخ سے یہاں بحث نہیں ہے۔ آج کل ایک بہت بڑا گاؤں ہے۔ کئی سو پختہ مکان پتھر کے بنے ہوئے ہیں جن کو مقامی اصطلاح میں قصر (جمع قصور) کہتے ہیں۔ شہر میں دو مسجدیں ہیں۔ ایک پنج وقتہ نماز کے لئے ہے جس میں ایک منارہ یا اذان دینے کا "مأذنہ" بھی ہے دوسری مسجد جسے مسجد غمامہ اور مسجد عریش بھی کہتے ہیں، یہاں کی جامع مسجد ہے یعنی اس میں جمعہ کی نماز بھی ہوتی ہے۔ یہ ایک نہایت اہم تاریخی مسجد ہے کیونکہ یہ اس جگہ تعمیر ہوئی ہے جہاں غزوۂ بدر کے موقع پر جناب رسالتمآبؐ کے لئے عریش یا جھونپڑی تیار کی گئی تھی۔ یہ ایک چھوٹی سی پہاڑی پر واقع ہے جہاں سے میدان جنگ کو دیکھ سکتے ہوں گے[1] مگر آج کل باغوں اور کھجور کی اونچی پیڑوں کی وجہ یہاں سے بدر کا معرکۂ کارزار نہیں دیکھ سکتے۔ پانی کا چشمہ جو زمین دوز نہر کی صورت میں ہے، ان ہر دو مسجدوں کے صحن میں سے گزرتا اور وضو کے حوضوں کا کام دیتا ہے۔ آبادی سے ملا ہوا دور تک کئی میل کے رقبے پر پھیلا ہوا نخلستان کا سلسلہ چلا گیا ہے جس میں کچھ ترکاری کی بھی کاشت ہوتی ہے۔ ہر جمعہ کو یہاں ایک بازار لگتا ہے جس میں دور دور سے بدو آتے اور خرید و فروخت یا تبادلۂ اشیاء کرتے ہیں۔ بدو عموماً گھی، کھالیں، روغن بیلسان، اونٹ بکریاں اور اونی کمبلیں یا عبائیں فروخت کے لئے لاتے ہیں۔ قبل اسلام بدر میں سالانہ ہفتہ بھر ایک بڑا میلا لگتا تھا[2] اور غالباً یہاں ایک بڑا تجارتی

[1] شامی کے الفاظ ہیں "تل مشرف علی المعرکۃ" [2] تاریخ طبری صفحہ ۱۳۰۶ ، ۱۳۰۷ -

بھی تھا۔ اِس کے آثار تو اب نہیں ہیں لیکن بئر الشیخ سے بدر کو جائیں تو بدر کے قریب، کوئی میل بھر پہلے، سڑک کے قریب ایک عجیب شکل کی چٹان ملتی ہے جو بالکل بیٹھے ہوے اونٹ کی طرح نظر آتی ہے۔ زمانۂ جاہلیت میں عرب ہر ایسی عجیب چیز کی پوجا شروع کر دیتے تھے۔ کوئی تعجب نہیں جو یہ بھی ایک بت رہا ہو۔ (تصویر ۴)

بدر ایک بیضوی شکل کا میدان ہے۔ کوئی ساڑھے پانچ میل لمبا اور چار میل چوڑا۔ اطراف بلند پہاڑ ہیں۔ مکہ، شام اور مدینہ جانے کے راستے جو وادیوں میں سے گزرتے ہیں یہیں ملتے ہیں۔ ترکی دور میں شریف عبدالمطلب نے اس میدان میں ایک مضبوط قلعہ تعمیر کیا تھا مگر اب وہ ٹوٹ پھوٹ گیا ہے۔ یہ میدان سنگلاخ یا ریتلا ہے مگر جنوب مغربی حصے کی زمین نرم ہے۔ جنگ بدر کے دن بارش ہوئی تھی تو یہ مقام، جہاں قریش کا پڑاؤ تھا، دلدل بن گیا تھا[1] مگر اب یہاں ایک سرسبز نخلستان ہے۔

بدر کے اطراف جو پہاڑ ہیں ان کے مختلف حصوں کے نام مختلف ہیں۔ ان میں سے دو دور سے سفید ریت کے تودے نظر آتے ہیں۔ آج بھی ان سفید پہاڑیوں میں سے ایک کا نام العُدوَۃُ الدُّنیا اور دوسری کا العُدوَۃُ القُصویٰ ہے۔ ان دونوں کے مابین جو بہت اونچا پہاڑ ہے اسے اب جبَل اَسفل کہتے ہیں کیونکہ اس کے پیچھے دس بارہ میل پر سمندر ہے (تصویر ۵) اور ابوسفیان کا قافلہ راستہ کترا کر ساحل کے کنارے کنارے گزر گیا تھا تو قرآن میں اس کا ذکر "وَالرَّکْبُ اَسْفَلَ مِنکم" کے الفاظ میں کیا گیا ہے۔ بدر سے سمندر کی مسافت کے متعلق واقدی[2] نے "ھی من الساحل علی بعض نھار" لکھا ہے جو چاہے موٹر کے لئے صحیح ہو لیکن اونٹ پر سفر کے لئے یقیناً ممکن نہیں واقدی نے محض قیاس کیا ہوگا۔

جنگ بدر کی چند تفصیلیں ایک طرف تو قریش کا مسلمانوں پر مظالم توڑ کر انھیں جلا وطنی پر مجبور کرنا، جلا وطنی پر ان کی جائدادوں کو ضبط کر لینا[3] اور ان کے نئے مسکن (حبشہ اور پھر مدینے) میں وہاں کی حکمرانوں اور با اثر لوگوں کو ان تارکین وطن کو پناہ نہ دینے کی ترغیب دینا[4]۔ دوسری طرف ان ناانصافیوں کا بدلہ لینے کے لئے مدینے سے مسلمانوں کا قریش پر معاشی دباؤ ڈالنا اور بزور قریشی قافلوں کی آمد و رفت کو اپنے زیر اثر علاقے میں روک دینا — یہی بدر کی لڑائی کا باعث ہو سکتے ہیں۔ قریشی قافلوں کو لوٹ لینا ڈاکہ اس وقت سمجھا جائے جب یہ بے قصور ہوں اور لوٹنے والے حکومت نہیں بلکہ خانگی افراد ہوں۔ ورنہ دو سلطنتوں میں کشیدگی پر نہ صرف جان بلکہ مال و آبرو کے خلاف بھی ہر فریق دوسرے کو نقصان پہنچانے کا پورا حق رکھتا ہے۔

یہی وجہ ہے میں ان لوگوں سے متفق نہیں ہوں جو قریشی قافلوں کو لوٹنے کے لئے بھیجی ہوئی مہموں کے وجود ہی سے انکار کرتے ہیں۔ شبلی مرحوم[5] نے "کانما یُساقون الی الموت" کی آیت سے استدلال کر کے کم از کم جنگ بدر کی حد تک

---

[1] ابن ہشام ص۴۳۹ [2] کتاب المغازی مخطوطہ برٹش میوزیم ورق (۳۰ ب) [3] صحیح بخاری کتاب ۶۴ باب ۸۳ حدیث ۱۲ نیز ابن ہشام ص۳۲۱ تا ۳۲۲ نیز ص۳۳۹ مبسوط حسنات [4] تاریخ طبری ص۱۶۰۲، سیرۃ ابن ہشام ص۲۱۶ تا ۲۱۷، مسند ابن حنبل ج ۲ ص۱۹۸ [5] سیرت النبی جلد اول احوال جنگ بدر

د/۱ قریۂ حمراء (راستہ بدر)
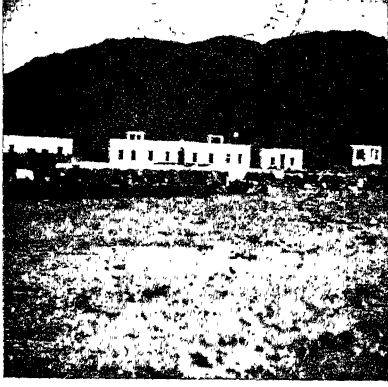
د/۲ قریۂ مسجد (راستہ بدر)
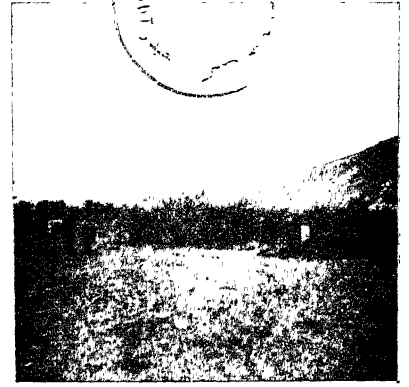
د/۳ قریۂ خیف (راستہ بدر)

د/۴ بدر کے باہر اونٹ کے شکل کی قدرتی چٹان (جو غالباً جاہلیت مین پوجی جاتی تهی)
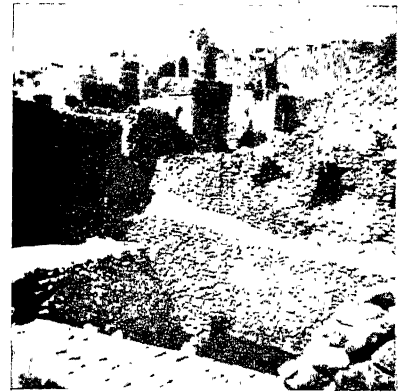
خریطۃ غـزوۃ
بدر
۰ ۱ ۲ ۳ ۴ کیلومیٹر
م-ح-۱ ۸/۱/۵۸ ۱۳ھ
الی الشام
الی المدینۃ
العدوۃ الدنیا
شمال
رکب ابی سفیان
جبل اسفل
اشارات
۱-قلعۃ
۲-بلدۃ بدر
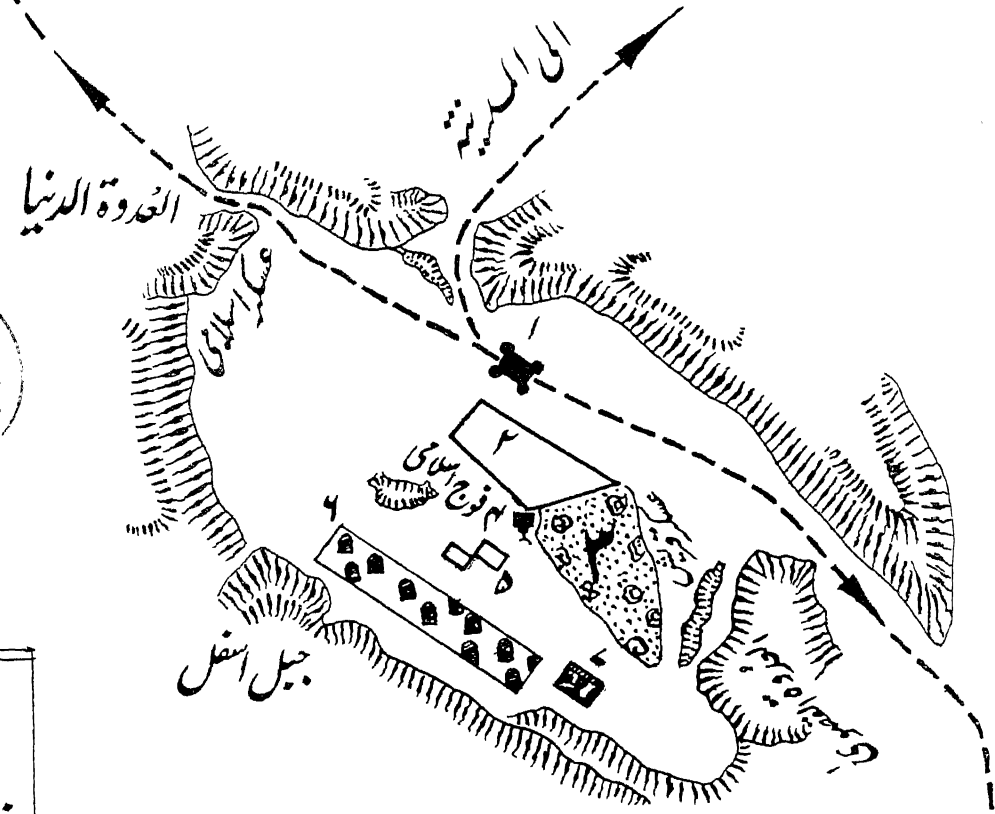
یہی رائے کو مستحکم کرلیا ہے کہ آنحضرت قافلے کو روکنے کے لئے نہیں بلکہ قریشی امدادی دستے سے مقابلے کے لئے نکلے تھے۔ لیکن
اِذۡ یَعِدُکُمُ اللّٰہُ اِحۡدَی الطَّآئِفَتَیۡنِ اَنَّہَا لَکُمۡ وَتَوَدُّوۡنَ اَنَّ غَیۡرَ ذَاتِ الشَّوۡکَۃِ تَکُوۡنُ لَکُمۡ" کی صریح آیت
سے معلوم ہوتا ہے کہ مدینے سے چلتے وقت مسلمانوں کو یقین نہ تھا کہ وہ قافلے سے ملیں گے یا امدادی دستے سے مڈبھیڑ ہوگی۔
دونوں امکانات تھے۔ چونکہ قریشی قافلہ ایک ہزار اونٹوں پر مشتمل اور پانچ لاکھ درہم کا اسباب لے کر آرہا تھا[۱] اس لئے مدینہ والوں
کو یقین تھا کہ اس کی مدد اور حفاظت کے لئے قریش اپنے تمام حلیفوں کی مدد سے ہزاروں آدمیوں کے ساتھ مقابلہ کریں گے۔
مدینے سے زیادہ دور مکے کی سمت جانا بہتوں کے لئے "موت کے منھ میں جانا" معلوم ہوتا تھا۔

اس شام سے آنے والے قافلے کو مسلمان مدینے کے شمال یا مغرب میں روک سکتے تھے لیکن شام سے
اس کے نکلنے کی اطلاع موجودہ زمانہ نہیں کہ تار پر اسی دن مل جائے۔ اونٹوں کے قافلے کی اطلاع اونٹ سوار ہی دے سکتے
تھے اور بمشکل دو ایک دن اول۔ مدینے سے ساحل کو سیدھا جانے میں دو تین دن ضرور لگ جاتے ہیں۔ ایک بڑا تجارتی قافلہ
بے شبہہ آہستہ آہستہ منزل بمنزل ہی جا سکتا ہے۔ اور یلغار کرنے والی فوج خاص کر دشوار گزار گھاٹیوں کی مدد سے تیز تر جا سکتی
ہے۔ بدر ایسا مقام تھا جو ساحل سے بھی قریب تھا۔ بڑا مقام ہونے کی وجہ سے قافلے وہیں سے گزرتے تھے[۲] مدینے اور مکے کے
راستے کا قریب ترین اتصال بھی وہیں ہوتا تھا اور اس کی توقع کی جا سکتی تھی کہ وہاں مسلمان اس قافلے کو جا لیں گے۔ سیدھے
مغرب کی سمت ساحل کو جائیں تو قافلہ گزر چکتا۔ اور ہوا بھی یہی۔ یعنی آنحضرت ابوسفیان سے بمشکل چند گھنٹے قبل بدر پہنچے ہیں۔
اس کی ایک وجہ غیر معروف راستوں سے چکر لگا کر جانا تھا تاکہ حریف کو خبر نہ لگے۔ راستے میں بھی ٹوہ لیتے گئے[۲ب] اور بدر کے قریب
پہنچ کر متعدد سانڈنی سوار بھیجے[۳] تاکہ اس کا پتہ چلائیں کہ قافلہ کہاں ہے۔ جو سانڈنی سوار شمال مغرب میں شام کے راستے پر بھیجے
گئے تھے انھوں نے واپس آکر غالباً آنحضرت کو اطلاع دی ہوگی کہ قافلہ اب آیا ہی چاہتا ہے[۴] اور اس اطلاع پر یہ گمان کر کے
کہ قافلہ بدر میں سے گزرے گا آنحضرت عین راستے پر وادی کے داخلے کے پاس پڑاؤ ڈالتے ہیں۔ یہ سفر پوری تنظیم سے ہوا تھا
مدینے میں ایک نائب کو چھوڑا گیا تھا۔ فوج میں انصار اور مہاجرین کے الگ الگ جھنڈے بھی تھے۔ فوج کے مختلف حصے بھی
تھے۔ ساقہ یعنی پیچھے کے اہم دستے پر قیس المازنی (انصاری) کو مامور کیا گیا تھا[۵]۔

قافلے کو اطلاع مل گئی تھی کہ خود شام کو جاتے وقت مسلمانوں نے اس کا تعاقب کیا تھا[۶] اس سے پہلے چھ سات
اور قریشی قافلوں کو یہی تجربہ ہو چکا تھا۔ اسی لئے قافلہ چوکنا تھا۔ قافلے عموماً رات کو چلتے ہیں اور صبح کے قریب منزل پر پہنچ کر آرام
کرتے ہیں۔ بدر کی خطرناک گھاٹی سے قریش واقف تھے۔ اسی لئے بدر پہنچنے سے کافی مسافت پہلے (اور شاید کے مطابق ٹھیک
کے موڑ پر) قافلہ رک جاتا ہے اور قافلہ سالار (ابوسفیانؓ) ٹوہ لینے نکلتا ہے۔ ابھی آنحضرت میدان بدر کے اندر نہیں آرہے تھے لیکن

---

۱ مغازی الواقدی ورق (۸) ۲ طبری ص۱۲۸۶ ۲ب طبری ص۱۳۰۲ ۔ ۳ ایضاً نیز ص۱۲۹۹ و ص۱۳۰۳ ۴ دو بدری لڑکیوں کی گفتگو تاریخ آمد پر (طبری ص۱۳۰۵)

۵ طبری ص۱۲۹۹ ۶ مغازی الواقدی ورق (۸ ب)

ان چھوٹے مقاموں پر ایک بھی اجنبی گزرے تو ہر شخص اس سے واقف ہو جاتا ہے۔ آنحضرتؐ کے سانڈنی سواروں کو لوگ دیکھ چکے تھے۔ گو اُن کی غرض کا پتہ نہیں چلا تھا۔ ابو سفیان کو بھی ان باتونی بدوؤں نے سانڈنی سواروں کا پتہ دے دیا۔ اس نے ان کے قدموں پر چل کر تازہ اونٹ کی مینگنیاں دیکھیں اور فوراً معلوم کر لیا کہ وہ مدینے کا چارہ کھائی ہوئی سانڈنیاں تھیں۔ قافلہ سالار اس پر بھاگا بھاگ بدر سے واپس قافلے میں پہنچتا ہے اور ایک طرف تو مکے کو مدد کے لئے تیز رفتار پیام رساں بھیجتا ہے اور ساتھ ہی خود بھی راستہ کاٹ کر، بدر کو چھوڑتے ہوئے، ساحل کے قریب سے دو منزلے کو منزلہ کرتا ہوا، آرام لئے بغیر قافلے کو رات بھر چلنے کے باوجود دن بھر چلا کر چل دے جاتا ہے اور چند گھنٹے ٹھیر کر پھر آگے بڑھ جاتا ہے اور اس طرح مسلمانوں کی دست رس سے بچ کر صحیح سلامت مکہ پہنچ جاتا ہے[۱]

بدر کی لڑائی قافلہ سالار کا پیام مکہ پہنچا تو وہاں لازمی طور پر کہرام مچ گیا کیونکہ ہر ایک گھرانے کا کچھ نہ کچھ سامان اس میں تھا۔ جلدی میں قریش نے ناکافی تیاری کی اور جملہ حلیفوں کے اکٹھے ہونے کا انتظار نہ کیا۔ خاص کر جنگجو "اَحابیش" کو ساتھ نہ لینے پر بعد میں وہ بہت پچھتاتے بھی رہے۔ پھر بھی ہزار کے قریب رضاکار جمع ہو گئے جن میں سے بعض کے پاس گھوڑے بھی تھے اس کمک کو مکے سے بدر پہنچنے میں کم و بیش ایک ہفتہ ضرور لگا ہوگا۔ یہ سوال کافی پیچیدہ ہے کہ قافلے کے ہاتھ سے نکل جانے کے بعد آنحضرتؐ کیوں فوراً مدینہ واپس نہیں ہو گئے اور کیوں ہفتہ بھر بدر میں پڑاو ڈالے، اپنے مرکز سے دور خطرے کا سامنا کرتے مقیم رہے۔ جہاں تک غور کیا، مجھے ایک ہی وجہ سمجھ میں آتی ہے۔ ہجرت کے ساتھ ہی آنحضرتؐ نے آس پاس کے قبائل سے حلیفی اور معاونت کے معاہدے کرنے شروع کر دئے تھے چنانچہ ۱ھ میں جہینہ کے بعض سرداروں سے معاہدہ ہوا تھا، ۲ھ میں ینبوع کے آس پاس بسنے والے بنو ضمرہ، بنو مُدلِج، بنو زُرعہ اور بنو الرَّبعہ سے دوستی اور اعانت یا غیر جانبداری کے معاہدے ہو گئے تھے۔ خوش قسمتی سے تاریخ نے ان معاہدوں کے متن کو محفوظ رکھا ہے[۲] اور ان معاہدوں کے ساتھ ہی قریش پر راستہ بند کیا جا سکا کیونکہ یہ سب قبایل مدینے اور بحر قلزم کے مابین بستے تھے اور انھیں کی سرزمین سے قریشی کاروانوں کو گزرنا پڑتا تھا۔ غالباً بدر میں قیام کی غرض مابقی قبائل سے دوستی کی طرح ڈالنی تھی اور اس طرح قریش کو روکنے کی زنجیر میں مزید کڑیاں فراہم کرنا تھا۔

وجہ جو بھی ہوئی ہو، ابتداءً شام سے آنے والے قافلے کو روکنے کے لئے آنحضرتؐ نے ایک موزوں جگہ پڑاو ڈالا پھر وہیں مقیم رہے۔ جب قریش کی فوج کے آنے کی اطلاع ہوئی تو آنحضرتؐ نے طے کیا کہ ان سے مقابلہ کرنا چاہئے اگرچہ دشمن کی تعداد تقریباً تگنی تھی۔ اس وقت ہمراہی افسروں نے جو بدر کی جغرافیہ سے بہتر واقف تھے، مشورہ دیا کہ مکہ یعنی جنوب سے آنے والے دشمن کے مقابلے کے لئے پڑاؤ کو بدلنا مناسب ہوگا۔ پانی پر اپنی بہتر دسترس اور دشمن کو اس سے محروم کرنا خاص طور پر

---

[۱] ابن ہشام ص ۴۳۲

[۲] ملاحظہ ہو الوثائق السیاسیہ طبع مصر سنہ ۱۹۴۱ء نیز ابن سعد وغیرہ

حالیہ شہر بدر

(ایک مسجد کے منارے پر سے - درے کے سامنے کی سفید عمارت منہدم ترکی قلعہ ہے)

پیش نظر رکھا گیا۔[1] اسی طرح لڑائی چونکہ عموماً صبح کو شروع ہوتی تھی اس لئے اس کا لحاظ رکھا گیا کہ دن چڑھے تو سورج آنکھوں پر نہ آئے[2]
بدر کے پانی کے متعلق مورخوں نے جو تفصیلیں لکھی ہیں وہ کچھ زیادہ واضح نہیں ہیں۔ ممکن ہے گزشتہ ساڑھے تیرہ سو سال میں پانی کے بہاؤ اور سوتوں میں تبدیلی ہوئی ہو بہرحال موجودہ حالت یہ دیکھی گئی کہ وہاں ایک چشمہ ہے۔ جسے ہم کاریز یا زمین دوز نہر کہہ سکتے ہیں۔ اس کا بہاؤ شہر سے جبل عریش اور نخلستان کی طرف ہے۔ اور مسجد عریش سے کوئی پندرہ بیس قدم پہلے پانی کا لیول پیدل راستے کے برابر ہے۔ مگر ظاہر ہے مسجد عریش ایک ٹیلے پر ہے اس لئے مسجد کے اندر اس کا منہ کافی گہرائی پر ہی کھولا جا سکتا تھا۔

غالباً آنحضرت نے قریش کے آنے پر العدوۃ الدنیا سے آگے بڑھ کر مسجد عریش کے قرب و جوار میں اس چشمے کے بہاؤ کے موقع پر پڑاؤ ڈالا اور متعدد حوض بنا کر اس بہتے پانی کو جنگ کے دن قریش پر روک دیا کیونکہ ان کا پڑاؤ اور بھی نیچے العدوۃ القصوی پر تھا۔ متعدد بڑے حوضوں کے بغیر اس بہتے پانی کو زیادہ دیر تک روکا بھی نہیں جا سکتا تھا۔

فریقین کی صف بندی

مسلمانوں کے پاس تین سو سے کچھ ہی زاید سپاہ تھی[3]۔ دشمن کی تعداد مورخوں نے ساڑھے نو سو[4] لکھی ہے۔ ایک بہتر "تعبیہ" (صف بندی) کے بغیر عام حالتوں میں مقابلہ زیادہ دیر تک نہیں جاری رہ سکتا تھا۔ امام ترمذی[5] کے مطابق اسلامی فوج کی تقسیم لڑائی سے پہلے کی رات ہی کو عمل میں آ چکی تھی۔ لڑائی کے دن سویرے ہی آنحضرت نے مسلمانوں کو قطاروں میں تقسیم کیا اور صف بندی کا جنگ سے پہلے تنقیدی نظر سے معائنہ کیا۔ آپ کے ہاتھ میں ایک چھڑی تھی۔ معائنہ میں کوئی سپاہی ذرا بھی آگے یا پیچھے نظر آتا تو آپ اسے فوراً درست کرتے[6]۔ اس صف بندی کے بعد آپ نے فوج کے مختلف حصوں پر افسر مقرر کئے۔ واقدی[7] کے مطابق میمنہ پر حضرت ابوبکر صدیق رضؓ تھے مگر یہ مشتبہ معلوم ہوتا ہے کیونکہ حضرت صدیق پورا وقت جناب رسالت مآب کے ساتھ رہے جیسا کہ ابھی آگے تفصیل آئے گی۔ واقدی نے لکھا ہے کہ مسلمانوں کی فوج تین مستقل جماعتوں پر مشتمل تھی مہاجرین اوس اور خزرج اور ہر ایک کا علمبردار بھی الگ تھا۔ (نیز طبری ص۱۲۹۷)

اس صف بندی کے بعد آنحضرت نے سپاہیوں کو چند نہایت اہم ہدایتیں دیں[8] جن کا ماحصل یہ ہے کہ مسلمان اس صف بندی کو نہ توڑیں اور اس وقت تک لڑائی کا آغاز نہ کریں جب تک آنحضرت اجازت نہ دیں۔ دشمن دور ہو تو تیر چلا کر ضائع نہ کریں۔ زد پر آئے تو تیر چلائیں، اور بھی قریب آئے تو پتھروں سے ماریں، اس سے بھی نزدیک ہو جائے تو نیزوں سے روکیں اور سب سے آخر میں تلواریں کھینچیں۔ یقیناً ہر مسلم سپاہی نے اپنے کھڑے ہونے کی جگہ ہاتھ سے پھینکے جانے والے پتھروں کی ڈھیر لگائی ہوگی جو میدان بدر میں اسلامی کیمپ پر کافی مقدار میں ملتے ہیں۔ مسلمان چونکہ کھڑے ہوئے اور مدافعت پر

---

[1] ابن ہشام ص۴۳۹ [2] مغازی الواقدی ورق (۱۵) [3] طبری ص۱۲۹۵، ص۱۳۰۱ [4] ایضاً نیز ابن ہشام ص۴۴۳ [5] جامع الترمذی ابواب الجہاد [6] طبری ص۱۳۱۹
[7] مغازی الواقدی ورق (۱۵ ب) [8] یہ ہدایتیں اکثر کتب حدیث میں ملتی ہیں مگر ان کا بدر میں دیا جانا واقدی کا بیان ہے۔ نیز ابن ہشام ص۴۴۳

اس لئے یہ ان کے لئے ممکن تھا۔ دشمن جارحانہ حملہ کرکے بڑھا آرہا تھا، اس لئے وہ چاہتا بھی تو زیادہ مقدار میں پتھر ساتھ نہیں لے سکتا۔
مسلمان سپاہیوں کے پاس چونکہ کوئی امتیازی لباس نہ تھا اس لئے "یا منصور اَمِتْ" کا جملہ ان کا شعار مقرر کیا گیا[۱] جب دو آدمی مقابل ہوتے اور فریق ثانی یہ شعار نہ دہراتا تو فوراً معلوم ہو جاتا کہ وہ دشمن کا آدمی ہے۔ الملائکۃ مسوّمین کی آیت کی تفسیر میں (جو بدر ہی کے سلسلے میں ہے) طبری وغیرہ نے یہ حکم نبوی بھی نقل کیا ہے کہ مسلمان لباس وہیئت وغیرہ میں امتیاز بھی پیدا کرلیں "تسوموا فان الملائکۃ تسوّمت"۔

دشمن کی تنظیم کا زیادہ پتہ نہیں چلتا۔ واقدی[۲] کے مطابق ان کا میمنہ و میسرہ دو حصے تھے اور فوج میں تین جھنڈے تھے۔ انھوں نے پیش قدمی کرکے ایک خاص مقام پر توقف کیا پھر اپنے زمانے کے جنگی رواج کے مطابق مبارزہ کیا یعنی ان کا ایک بہادر صفوں سے آگے بڑھا اور دعوت دی کہ مسلمانوں کا بھی ایک پہلوان آگے آئے اور دونوں تنہا لڑیں[۳]۔

آنحضرتؐ نے اپنی صف بندی مکمل کی اور انتظام کی طرف سے مطمئن ہو کر اپنے "اُسٹاف" کے ساتھ ایک ٹیلے پر چڑھ گئے جہاں سے میدان جنگ صاف نظر آتا تھا (علی تل مشرف علی المعرکۃ[۴]) اس ٹیلے پر آنحضرتؐ کی اجازت سے ایک جھونپڑی (عریش) تیار کی گئی تھی جس کا منشا کچھ تو دھوپ کے وقت سپہ سالار کے لئے سایہ مقصود ہوگا اور کچھ دشمن کے تیروں سے بچاؤ پیش نظر ہوگا۔ یہاں چند تیز رفتار سانڈنیاں بھی متعین تھیں[۵] یقیناً اپنی فوج کو ہدایات بھیجنے میں آنحضرتؐ نے ان سے کام لیا ہوگا۔ ان سانڈنیوں کا منشا یہ بھی تھا کہ ضرورت پر آنحضرتؐ ان پر مدینہ جا سکیں۔ اور عریش سے مدینے کا راستہ کھلا رکھا گیا تھا[۶]۔

اسی عریش یا جھونپڑی کی جگہ پر آج کل بطور یادگار ایک جامع مسجد تعمیر کی گئی ہے اس میں فی الوقت تین کتبے ہیں۔ ایک منبر کے اوپر، دوسرا محراب کی کمان کے اوپر قبلہ رخ دیوار میں نصب ہے۔ تیسرا محراب کے پاس الگ زمین پر پڑا ہوا تھا۔ مسجد کی دیواریں مٹی کی ہیں جن کے اندر ممکن ہے اینٹ ہوں۔ پایہ پتھر کا ہے۔ منبر کے اوپر جو کتبہ ہے اس میں مصر کے مملوک افسر خُشقَدَم کا نام ملتا ہے۔ املائی غلطیاں (ہذا المکان کان الفراغ وغیرہ) بھی انھیں عجمیوں نے کی ہوں گی۔ محراب کی کمان کے اوپر سنگ مرمر کا ایک چھوٹا سا کوئی آٹھ انچ مربع کتبہ ہے جو کچھ تو آرائشی خط میں طغریٰ کی طرح لکھا ہونے اور کچھ قدامت کے باعث بہت کچھ گھس جانے سے مجھ سے پڑھا نہ گیا میری رائے میں یہ مملوکوں سے بھی پہلے کا ہے۔ تیسرا کتبہ جو نیچے پڑا ہوا ہے وہ بہت بدخط معمولی ریت کے پتھر پر کھدا ہوا اور غالباً حال کا ہے اس کا زمین پر پڑا ہونا بتاتا ہے کہ مسجد کی موجودہ تعمیر بالکل جدید ہے اور دونوں نصب کئے ہوئے کتبے محض یادگار کے طور پر دیوار چنتے وقت لگا دئے گئے۔ یہ تیسرا کتبہ بھی اپنے زمانے میں کہیں نصب ہوگا

---

[۱] مغازی الواقدی ورق (۶)　[۲] مغازی ورق (۱۵ ب)　[۳] ابن ہشام ص۴۴۳　[۴] سیرۃ شامی غزوۂ بدر۔

[۵] ابن ہشام ص۴۳۹ تا ۴۰　[۶] نیز طبری ص۱۳۲۲ کے مطابق عریش پر ایک محافظ دستے کا پہرہ بھی تھا۔
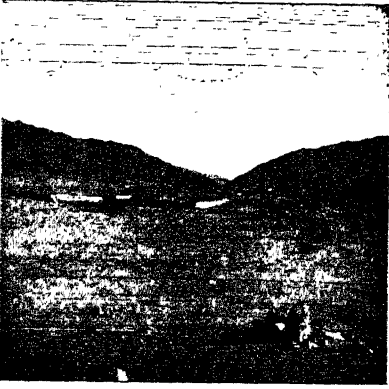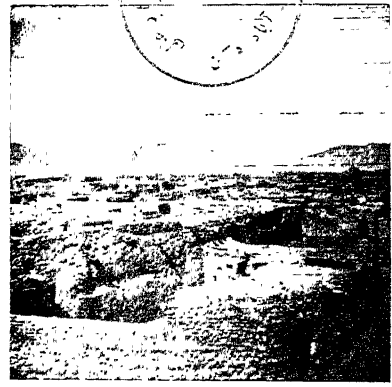
ز/۱ شہر بدر کے چند مکان

ز/۲ شہر بدر کا طائرانہ نظارہ جبل اسفل پر سے

ز/۳ بحر احمر جبل اسفل پر سے۔

ز/۴ چشمۂ بدر

ز/۵ مسجد عریش
جہاں سے آنحضرت فوج کو لڑاتے رہے

ز/۶ شہدائے بدر کی چوکھنڈی اور
العدوۃ الدنیا کی پہاڑی

کیونکہ اس میں بھی "کان الفراغ" کے الفاظ اب تک صاف پڑھے جاتے ہیں مملوکوں کے
کتبے کی عبارت میں نے یوں پڑھی ہے :-

سطر اول - بسم اللہ الرحمن الرحیم
۲ - انشائی حصر ہذا المکان المبارک
۳ - خشقدم امیر عسرہ [؟ عشرۃ، عشیرۃ] بدیار المصریہ مشید العمارۃ السلطانیۃ
۴ - وکان الفراغ من ہذا البنیۃ المبارک ربیع الاول احد و عشرین فی سنۃ
ستۃ و تسعمایۃ -

شہدائے بدر کا مقبرہ بھی ایک ممتاز احاطے میں آج تک موجود ہے۔ ترکی دور میں وہاں سنگ مرمر کے ستون اور کتبے وغیرہ لگائے گئے تھے مگر اب یہ کھنڈر ہو چکے ہیں اس کے قریب ہی بدر کے مزور ایک چٹان بتاتے ہیں اور یقین دلاتے ہیں کہ اس عمودی غار میں آنحضرتؐ اترتے تھے مگر اس کی توجیہ مشکل ہے اور تاریخیں بھی اس سے ساکت ہیں۔

بدر کی مقامی روایتوں اور وہاں کے مزورین کے بیانوں کے مطابق لڑائی اسی جگہ ہوئی جہاں اب قبرستان واقع ہے۔ آنحضرت نے اپنی چھوٹی سی جمعیت کے لئے بھی رضاکار عورتیں مقرر کی تھیں جو زخمیوں کی مرہم پٹی کرتیں[۱] سپاہیوں کو پانی پلاتیں میدان میں گری ہوئی دشمن کی تیروں کو جمع کر کے مسلم تیر اندازوں کو دینے کا خطرناک کام بھی کرتیں غرض جتنا ہوتا ہاتھ بٹاتیں۔

لڑائی کے نتیجے سے سب واقف ہیں مسلمانوں کے کوئی ایک درجن سپاہی شہید ہوئے[۲] دشمن کے ستر آدمی کھیت رہے[۳] اور اتنے ہی گرفتار ہوئے[۴] جو قید کر کے فوجی نگرانی میں غالباً پیدل مدینہ بھیجے گئے۔ ان کے ساتھ عام طور پر اچھا سلوک کیا گیا جس کے پاس کپڑے نہ رہے تھے اسے کپڑے دئے گئے اور انھیں مسلمان سپاہیوں کے برابر کھلایا پلایا گیا[۵]۔ آنحضرت نے جملہ لاشوں کو دفن کرایا اور فوراً دو تیز رفتار بشیر مدینہ بھیجے، ایک محلہ ہائے عالیہ کے لئے اور دوسرا محلہ ہائے سافلہ کے لئے تاکہ وہاں کی بے چین آبادی کو لڑائی کے نتیجے کی خوشخبری اور دیگر واقعات سنائیں[۶]۔ یہ رمضان ۲ھ کا واقعہ ہے۔

قیدیوں سے برتاؤ عرب میں یکساں نہ تھا۔ وہ قتل بھی کر دئے جاتے، غلام بھی بنا لئے جاتے ۔ خاص کر عورتیں اور بچے ۔ اور مفت بھی رہا کر دئے جاتے۔ مالی فدیے کا رواج مسلمانوں میں جنگ بدر کے پہلے ہی سے چلا آرہا تھا۔ اب ایک ہتھیار فروش (نوفل بن الحارث بن عبدالمطلب) سے ایک ہزار نیزے مانگے گئے[۷]۔ عام قیدیوں سے چار چار ہزار درہم کی خطیر رقم طلب کی گئی[۸]

---

[۱] بخاری ۵۶/۶۷ [۲] ابن ہشام ص۵۰۶ [۳] ایضاً ص۵۰۰ و ما بعد [۴] ایضاً ص۵۱۳ و ما بعد [۵] ابن ہشام ص۴۵۹ تا ۴۶۱ ابن سعد ج۲ ص۱۱ نیز بخاری ۵۶/۱۴۲ ص۵۰۷
[۶] سیرۃ شامی غزوۂ بدر نیز ابن ہشام [۷] اصابہ ۸۸۳۶ از ابن سعد نیز کتانی ج۲ ص۳۸ [۸] ابن ہشام ص۴۶۲ وغیرہ

آنحضرتؐ تعلیم کو جو اہمیت دیتے تھے اس کا اندازہ یوں بھی ہو سکتا ہے کہ چار ہزار کی خطیر رقم کے عوض پڑھے لکھے قیدیوں کو دس دس بچوں کو لکھنا سکھانے پر رہا کر دیا گیا۔[1] چند ایک کو مسلمانوں سے آیندہ نہ لڑنے کے اقرار پر مفت بھی رہا کر دیا گیا تھا۔[2]

اسلامی محدث اور مورخ لکھتے ہیں کہ بدر میں قیام کے ساتھ ہی آنحضرت صلعم نے اپنے ممتاز افسروں کے ساتھ پھر کر میدان جنگ کا معائنہ کیا۔ اور جگہ جگہ بتاتے گئے کہ دشمن کا فلاں افسر فلاں جگہ ہو سکتا ہے اور اس کے مر کر گرنے کی فلاں جگہ ہے۔[3] سپہ سالار اعظم کا انتہائی خطرے کے موقع پر یہ اطمینان اور یہ ایقان ماتحت افسروں اور ان کے ذریعے سے پوری فوج میں جو خود اعتمادی اور جوش و ولولہ پیدا کر سکتا ہے وہ ظاہر ہے اور ساتھ ہی یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ دشمن کی صلاحیتوں اور تجویزوں کا پیش اندازہ کتنا مفید اور ضروری ہوتا ہے۔

اسلام نے جہاں ہر چیز میں جمالیات کا لحاظ رکھا ہے وہیں لڑائی کے لئے بھی انسانیت پرور اور قابل عمل قواعد بنائے ہیں۔ چنانچہ ایک مشہور حدیث[4] جو غالباً اسی جنگ بدر کے موقع پر ارشاد ہوئی تھی، یہ ہے کہ اذا قتلتم فاحسنوا القتلة (جب تم کسی کو قتل بھی کرو تو اچھے طرح سے قتل کرو)۔ خواہ مخواہ تکلیف دہ کاموں کی اور مقابلے کے ناقابل زخمیوں کو قتل کرنے، عورتوں، بچوں، اور لڑائی میں عملی حصہ نہ لینے والے نوکروں غلاموں وغیرہ پر ہتھیار چلانے کی سختی سے ممانعت کی گئی۔ اور قرآن مجید میں اسی جنگ بدر کے موقع پر ہتھیار کے استعمال کی ایک بڑی اہم ہدایت آئی کہ "واضربوا منهم كل بنان" (یعنی ان کی جوڑوں پر مارو)[5] اور ظاہر ہے کہ دشمن کو لڑائی کے ناقابل کر دینے اور ساتھ ہی خونریزی کو حتی الامکان گھٹانے کی اس سے بہتر ہدایت کسی دست بدست لڑائی کے لئے نہیں دی جا سکتی۔

---

[1] مسند ابن حنبل ۱/۲۴۷، ابن سعد ۲/۱ ص ۱۴
[2] طبری ص ۱۳۷۷ نیز ابن ہشام ص ۴۷۱
[3] مثلاً طبری ص ۱۲۸۵ ورد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بدرا قال ہذہ مصارعہم نیز ابن ہشام ص ۴۳۵ وغیرہ۔
[4] صحیح مسلم ج ۲، ص ۲۰۳
[5] دیکھئے تفسیر طبری بر موقع

اُحُد

(دیکھئے نقشہ ی، ک، تصاویر ح ۱، ط ۱-۲)

شام جانے کا برّی راستہ قریش کے تجارتی کاروانوں کے لئے جو اہمیت رکھتا تھا اس کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے اس کو کھلا رکھنے کے لئے ڈھائی لاکھ درہم[۱] کا چندہ کرنا اہل مکہ کے لئے ذرا بھی بار نہ گزرا۔ کم وبیش اتنی ہی اور رقم انھوں نے بدر کے قیدیوں کو فدیہ دے کر چھڑانے میں صرف کی۔[۲] سیرۃ شامی وغیرہ[۳] میں تفصیل سے بتایا گیا ہے۔ کہ کس طرح قریش نے علاوہ اپنی ذاتی رضا کارانہ جمعیت کے جس میں جنگجو "احابیش" بھی شریک تھے؛ عمرو بن العاص، عبداللہ بن الزبعری، ھبیرہ بن ابی وہب، مسافع بن عبدمناف اور ابو عزّۃ عمرو بن عبداللہ الجمحی کو تمام قبائل عرب میں بھیجا اور خطرے کی اہمیت سمجھا کر مدینے پر حملے کے لئے مدعو کیا۔ اس میں اتنی کامیابی ہوئی کہ "فالبّوا العرب وجمعوھا"۔ غرض تین ہزار کی جمعیت سال بھر کے عرصہ میں تیار ہوئی جس میں سات سو زرہ پوش اور دو سو گھوڑے بھی تھے[۴]۔ اس تیاری کی اطلاع مسلمانوں کے خفیہ نگار نے بروقت آنحضرت کو دی[۵] اور مدینہ بھی مدافعت کیلئے تیار ہوگیا اور وسط شوال ۳ھ میں احد کی معرکہ آرائی ہوئی۔ قریشی مع اپنے حلیفوں کے مدینے پر دھاوا بولتے ہیں اور احد پہاڑ کے دامن میں لڑائی ہوتی ہے۔

محل وقوع اور وجہ انتخاب

اُحد ایک پہاڑ ہے جو مدینے کے شمال میں تین ساڑھے تین میل کے فاصلے پر شرقاً غرباً پھیلا ہوا ہے۔ مکے کے متعلق سب جانتے ہیں کہ وہ مدینے کے جنوب میں واقع ہے۔ عرصے سے میں یہ سوچتا اور بہتوں سے پوچھتا رہا کہ مکے والے مدینے کے جنوب پر کیوں حملہ آور نہیں ہوئے اور کس مصلحت سے مدینے کے شمال میں جاکر اپنی واپسی اور اپنی کمک وغیرہ کا راستہ بند کرلیا۔ جب میری کسی طرح تشفی نہ ہوئی تو مجبوراً میں اس نتیجے پر پہنچا کہ موجودہ اُحد وہ مقام نہیں ہے جہاں غزوۂ اُحد پیش آیا اور یہ کہ قدیم اُحد اصل میں مدینے کے جنوب میں قُبا کے قرب وجوار میں کسی جگہ واقع ہوگا۔ قدیم مورخین اور جغرافیہ نگاروں کا متفقہ بیان کہ اُحد مدینے کے شمال میں ہے اور حتّٰی کہ حضرت حمزہ رضؓ کا مزار بھی میری تشفی نہ کرسکے۔

لیکن جب میں نے برسرموقع مقامیاتی (ٹوپوگریفیکل) مطالعہ کیا تو وہ چیز سمجھ میں آگئی جو بیسیوں کتابوں کی سالہا سال ورق گردانی سے بھی نہ آئی تھی۔

---

[۱] سیرۃ شامی احوال اُحد — [۲] بر موقع — [۳] ابن ہشام ص ۵۵۵ و مابعد

[۴] ابن ہشام ص ۵۶۱ — [۵] سیرۃ شامی "و کتب العباس الی رسول اللہ بذلک مع رجل من غفار"

مدینہ ایک ایسے مقام پر آباد ہے جو دس ایک میل لمبے اور اتنے ہی چوڑے میدان پر مشتمل ہے اسی میدان کو "جوفِ مدینہ" اور بعد میں "حرمِ مدینہ" کا نام دیا گیا۔ اس میدان کے اطراف ہر سمت میں اونچی اور ایک دوسرے سے متصل پہاڑیوں کا سلسلہ بڑی دور تک چلا گیا ہے اور آمد و رفت تنگ وادیوں اور گھاٹیوں میں سے ہوتی ہے۔ جبل عَیر اور جبل ثور سے محدود ہونے کے علاوہ یہ میدان بالکل ہموار بھی نہیں ہے بلکہ بیچ میں سلع کا پہاڑ اور متعدد دیگر چھوٹی پہاڑیاں واقع ہیں جن کو بڑی جنگی اہمیت حاصل ہے۔

عہد نبوی میں مدینہ کوئی اس طرح کا شہر نہ تھا جیسا کہ وہ آج کل ہے یا جس طرح کے گنجان محلوں کے مجموعوں کے ہم عادی ہیں۔ اس زمانے میں وہاں عرب اور یہودی قبیلے بستے تھے اور ہر قبیلے کا محلہ یا گاؤں دوسرے سے الگ اور فرلانگ دو فرلانگ یا اس سے بھی زیادہ فاصلے پر واقع تھا۔ اس طرح کے گاؤں کا سلسلہ جبل عیر سے جبل ثور تک برابر پھیلا ہوا تھا۔

ان گاؤوں کی حالت یہ تھی کہ ان میں ایک یا زیادہ پانی کے کنویں ہوتے۔ رہائشی مکان پتھر کے بنے ہوئے اور عموماً دو منزلہ ہوتے۔ ہر گاؤں میں برج کی وضع کی مستحکم عمارتیں ہوتیں جن کو آطام اور آجام کہا جاتا۔ جنگ کے زمانے میں عورتیں، بچے، جانور اور دیگر اسباب ان میں منتقل کر دیا جاتا۔ ایک زمانے میں ان آطام کی تعداد ایک سو سے زائد ہو گئی تھی[۵۱]۔ ایک اور زمانے میں خاص ایک قبیلہ بنی زید میں (۱۴) آطام تھے[۵۲] ان میں سے بعض بہت بڑے ہوتے تھے۔ چنانچہ اُحیحہ بن الجُلاح کا اُطم الضحیان کتاب الاغانی[۵۳] کے مطابق سہ منزلہ تھا سب سے نیچے کی منزل لاوے کے سیاہ پتھروں سے تعمیر ہوئی تھی۔ اس سے اوپر کے دو درجے (تبرۃ) "چاندی کی طرح سفید پتھروں" سے بنائے گئے تھے اور یہ اطم اتنا اونچا تھا کہ اونٹ کی ایک دن کی مسافت سے اس کو دیکھ سکتے تھے ـــــ قبا کے قریب اس اطم کے کھنڈر اور اس کی سب سے نیچے کی منزل اب تک باقی ہیں اور مدینے کی دورِ جاہلیت کی حربی تعمیر کے مطالعے کا موقع دیتے ہیں (تصویر ۱/۲)۔ ان آطام کے اندر اکثر پانی کے کنویں بھی ہوتے تھے تاکہ محاصرے کے وقت کام دیں۔

ان منتشر اور دور دور بسے ہوئے محلوں کے علاوہ مختلف افراد یا قبائل کے باغ تھے اور عموماً ان کا احاطہ پتھر کی دیوار سے بنایا جاتا تھا۔ یہ باغ آبادی کے اطراف چوطرف پھیلے ہوئے تھے۔

ان قبائلی آبادیوں میں سے ایک کا نام یثرب تھا اور یہ گاؤں اب تک باقی ہے۔ ممکن ہے کہ زمانہ جاہلیت میں یہ سب سے اہم آبادی ہو اور اسی کی بنا پر پورے جوفِ مدینہ کے دیہات پر یثرب کا اطلاق ہوتا ہو جس کی نظیریں ہر ملک میں ملتی ہیں۔ مدینۃ النبی کا محلہ ـــ جہاں آنحضرتؐ رہتے تھے ـ کم و بیش وسط میں واقع ہے۔ مکے والوں کو عام اہلِ مدینہ سے کوئی پرخاش نہ تھی۔ وہ صرف آنحضرتؐ پر اپنا غصہ اُتارنا چاہتے تھے۔ مسجدِ نبوی تک پہنچنے کے لئے جنوب میں گنجان

۵۱

۵۳۔ ج ۱۲ ص ۱۲۴

میدان غزوہ احد اور جبل احد

(جبل رماۃ پر سے)

باغوں کے باعث لڑائی کا کوئی میدان نہ تھا۔ جنوب مشرق میں قبا اور عوالی کی آبادیاں اور باغ تھے۔ مشرق میں مسلسل یہودی محلّے تھے جو شمالاً جنوباً قبا سے لے کر تقریباً اُحد تک چلے گئے تھے۔ باغوں یا محلوں کا سلسلہ جنوب مغرب اور مغرب میں بھی پھیلا ہوا تھا مگر نسبتہً کم گنجان تھا۔ مدینے کی موجودہ فصیل پر شمال میں باب الشامی کے پاس بنو ساعدہ رہتے تھے جن کا سقیفہ (تصویر ۴) اب تک موجود ہے۔ اس سے آگے خود جبل سلع پر بنو حرام رہتے تھے۔ ان کا قبرستان اور سقیفہ بھی اب تک باقی ہیں۔ شمال مغرب میں وادی العقیق کے کنارے بئر رُومہ تک بہ کثرت باغ تھے۔ بئر رومہ مع اراضی تابعہ ابتداءً یہودیوں کے قبضے میں تھی[1] شمالی حصہ البتہ کھلا ہوا تھا۔ چونا ملی ہوئی سفید چھڑکی زمین کے باعث آج بھی وہاں زراعت نہیں ہوسکتی۔ ادھر سے مدینۃ النبیؐ کا راستہ کھلا ہوا بھی تھا جیسا کہ اوپر بیان ہوا، مدینے کے جنوب میں بلند پہاڑیاں ہیں اور راستہ صرف وادیوں اور گھاٹیوں میں سے گزرتا ہے۔ عہد نبوی میں مدینے کو براہِ راست جنوب سے آنے کے لئے قبا کی طرف ایک سخت دشوار گزار راستہ تھا جو لاوے کے پتھروں سے اٹا ہوا ہونے کے باعث شاذ ہی اختیار کیا جاتا تھا۔ آنحضرتؐ نے ہجرت کے وقت دشمن کے تعاقب کے خیال سے مصلحتہً یہ راستہ اختیار فرمایا تھا۔ کسی فوج کے لئے لاوے سے اٹے ہوئے میدانوں میں سے گزرنا آدمی اور جانور دونوں کے لئے سخت تکلیف دہ ہے اور دوپہر کو ان پتھروں کے گرم ہوجانے کے باعث وہاں پڑاؤ ڈالنا بھی کم پسند کیا جاسکتا ہے۔ مدینے کے مشرق اور مغرب دونوں طرف شمالاً جنوباً لاوے کے یہ میدان پھیلے ہوئے ہیں۔ ان کو "لابہ" اور "حرّہ" کہا جاتا ہے۔ ان حرّوں میں آبادی کے مکان تو تھے۔ غالباً جنگی مصلحت سے لیکن باغ نہیں۔ اگر تکلیف گوارا کر کے ان حرّوں پر سے فوج گزر بھی جائے تو ایسے میدانوں میں لڑائی بھی آسان نہیں۔

مزید برآں مدینے کو آنے کا جنوبی راستہ جو آج کل باب العنبریہ سے داخل ہوتا ہے ابھی تین سو سال پہلے تعمیر ہوا ورنہ قدیم زمانے میں کاروانوں کا راستہ یہ تھا کہ ذو الحلیفہ سے گزرتے ہی جبل عیر کے مغرب سے وادی العقیق کے اندر سیدھے شمال میں زغابہ کے سنگم (مجمع الاسیال) تک جائیں اور وہاں سے مدینے کو جانے کے لئے جنوبی طرف مڑیں۔ وادیوں کے یہ راستے نرم ریت پر مشتمل ہونے کے باعث اونٹوں کو بھی پسند تھے۔

غرض یہ جغرافی دشواریاں تھیں جن کے باعث قریش کی تھکی ہوئی فوج اور بارہ دن کے کوچ سے نیم مردہ جانوروں نے بھی مدینے سے دور زغابہ میں جا کر ٹھیرنا پسند کیا۔ یہاں پانی افراط سے تھا۔ چارہ بھی ملتا تھا۔ اور چونکہ کامیابی کا یقین تھا اس لئے واپسی کے راستے کی بھی فکر نہ تھی۔

جیسا کہ بیان ہوا اُحد پہاڑ مدینے کے شمال میں شرقاً غرباً کم و بیش خط مستقیم پھیلا ہوا ہے تقریباً وسط میں اس میں ایک جگہ خم آتا ہے اور نیم دائرے یا گھوڑے کی نعل کی شکل کا ایک کافی وسیع میدان بن گیا ہے۔ اس کے عقبی یعنی شمالی حصے میں

---

[1] احادیث فضائل حضرت عثمان میں بئر رومہ کی خریدی کا ذکر۔

ایک بہت ہی تنگ درّے سے گزرنے پر اندر مزید کھلے یا محفوظ میدان مل جاتے ہیں۔ اُحد کے جنوبی دامن میں وادی قناۃ گزرتی ہے۔ وادی قناۃ کے جنوب میں جبل عینین واقع ہے جسے اب جنگ اُحد میں تیر اندازوں کے تعین کے باعث جبل الرُّماۃ کہا جاتا ہے۔ وادی قناۃ کے شمال میں جبل اُحد کے دامن میں جو کھلا میدان ہے اس میں پانی کے دو چشمے اب بھی موجود ہیں اور کوئی تعجب نہیں جو انھیں چشموں کے باعث جبل الرُّماۃ کو جبل عینین (دو چشموں والا پہاڑ) کہا جاتا رہا ہو۔

جب قریشی فوج مدینے کے قریب ذوالحلیفہ پہنچی تو مسلمانوں کے جاسوس ان میں شامل ہو گئے اور جب فوج جبل اُحد کے مغرب میں زغابہ میں مقیم ہو گئی تو مدینہ آکر رپٹ دی[1]۔ آنحضرت[ؐ] نے بھی ـــــ جو ابتداءً شہر کے اندر ہی رہ کر مدافعت کرنی چاہتے تھے لیکن بعد میں فوج کے نوجوان افسروں کے اصرار پر باہر نکل کر مقابلے کو منظور فرماتے ہیں[2] ـــــ اپنی فوج کو اُحد کی طرف چلنے کا حکم دیا۔ آبادی کے باہر جمع ہونے پر شیخین کی گڑھیوں کے پاس استعراض (ریویو) ہوا اور رضاکاروں کا تنقیدی نظر سے معائنہ فرمایا۔ کم عمر بچے واپس کر دیے گئے[3] البتہ عورتوں کی کافی تعداد ساتھ رکھی گئی جو لڑائی کے وقت زخمیوں اور دیگر سپاہیوں کی خدمت کرتی رہیں۔ ان میں ام المومنین بی بی عائشہؓ بھی تھیں جن کا مشکیں بھر بھر کر پانی لانا اور زخمیوں کو پلانا صحیح بخاری میں تفصیل سے بیان ہوا ہے اس فوج میں کل سات سو آدمی تھے جن میں سے صرف ایک سو کے پاس زرہیں تھیں باقی مختلف قسم کے ہتھیاروں میں سے ایک یا چند لئے ہوئے تھے۔ پہلے دن اسی جگہ قیام رہا جہاں رضاکاروں کو جمع ہونے کا حکم دیا گیا تھا اور جہاں فوج کا معائنہ ہوا تھا۔ اس جگہ شیخین نامی دو مشہور آطام (چھوٹے قلعے) بھی تھے[4]۔ رات کو پچاس سپاہی حفاظت کے لئے اسلامی پڑاؤ کے اطراف گشت کرتے رہے[5] تاکہ شب خون کا اندیشہ نہ رہے۔ دوسرے دن آگے بڑھ کر جبل اُحد کے مذکورہ خماؤ کے اندر پڑاؤ ڈالا گیا[6] جس سے بہتر محفوظ مقام نہیں مل سکتا ہے۔ آنحضرت[ؐ] نے فوراً مورچوں پر قبضہ کیا اور جبل عینین (جبل الرُّماۃ) پر پچاس تیر انداز متعین کئے کہ اگر دشمن وادی قناۃ کی راہ مسلمانوں پر حملہ کرنے کوئی ٹکڑی بھیجے تو اسے روکیں[7]۔ باقی چھے ساڑھے چھے سو سپاہیوں سے آنحضرت[ؐ] نے قریش کی تین ہزار کی جمعیت کے مقابلے کا انتظام اپنے ہاتھ میں رکھا۔ متعدد مورخوں نے لکھا ہے کہ لڑائی کے دن آپ نے دوہری زرہ زیب تن فرمائی تھی[8] اور بعض بیانوں سے معلوم ہوتا ہے کہ لڑائی کے دن آپ نے کعب بن مالک سے زرہ بدلی بھی فرمائی[9] ـــــ غالباً اس لئے کہ دشمن پہچان نہ سکے۔

جبل عینین اور جبل اُحد کے درمیان آج کل جو فاصلہ ہے وہ اتنا وسیع ہے کہ پچاس تیر اندازوں کا سوار

---

[1] مغازی الواقدی ورق (۴۹ ب) [2] ابن ہشام ص ۵۵۸ [3] سیرۃ شامی بر موقع [4] ایضاً (نزل بالشیخین وھما اطمان

[5] ایضاً (استعمل علی الحرس تلک اللیلۃ محمد بن مسلمۃ فی خمسین رجلا یطوفون بالعسکر) [6] ایضاً [7] ابن ہشام ص ۵۶۰ [8] ابن ہشام ص ۵۶۰

[9] کتانی ۱/۲۴۲ استیعاب ۵۰۲

جبل رماة

جہاں احد میں تیر انداز مامور تھے
مصرع حمزہؓ بائیں ہاتھ پر اور مدفن
ابتدائی حمزہؓ دائیں ہاتھ پر
نظر آرہے ہیں

ط
۲

غار نبوی جس میں معرکۂ احد کے بعد
آرام لیا گیا اور دشمن سے امن ملا

ایک رسالے کو روکنا ناممکن معلوم ہوتا ہے۔ قریش کے ساتھ دوسو گھوڑوں کا ہونا بیان کیا جاتا ہے۔ جو خالدبن الولید اور عکرمہ بن ابی جہل کی کمان میں تھے[1] دوسرے الفاظ میں وادی قناۃ سے گھسنے کی کوشش کرنے والا خالدبن الولید کا رسالہ کم سے کم سَو سواروں پر مشتمل تھا۔ اور موجودہ چوڑائی اتنی ہے کہ یہ رسالہ مسلم تیراندازوں کی زد سے پرے حفاظت سے گزر سکتا ہے۔ اس دشواری کا حل سوائے قیاسات کے ممکن نہیں۔ گمان یہ ہوتا ہے کہ اُحد اور وادی قناۃ کے مابین اس وقت جو ہلکے سے ڈھلوان کا میدان ہے، وہ ۳ھ میں اتنا ہموار نہ تھا جتنا اب ہے۔ مورخین کے بیان کے مطابق وادی قناۃ میں بارہا شدید طغیانیاں آتی رہی ہیں ـــ چنانچہ حضرت حمزہؓ کو اسی بنا پر ابتدائی مدفن سے نکال کر موجودہ قبر میں دفن کرنا پڑا تھا۔ ان طغیانیوں نے اس ڈھلوان کو ـــ جو اُحد کی طرف سے اترتا ہوا قناۃ کی طرف آتا ہے ـــ ہموار تر کر دیا ہے۔ دوسرے جبل الرماۃ پر حالیہ زمانوں میں جو مکان تعمیر ہوئے ہیں، نیز حضرت حمزہؓ کے مقبرے اور عظیم الشان مسجد کو بنانے اور ان کئی درجن مکانوں کو تعمیر کرنے میں جو وادی قناۃ کے کنارے مقبرہ حضرت حمزہؓ کے مشرق میں ہیں اُحد کے دامن سے پتھر حاصل کئے گئے اور اس سنگ تراشی یا سنگ براری نے بھی اُحد و عینین کے درمیانی ڈھلوان کو مسطح کر دیا ورنہ قدیم زمانے میں احد کے دامن میں عینین کے تیراندازوں کی زد سے بچ کر سوار نہیں گزر سکتے ہوں گے۔ ایک یہ بھی امکان ہے کہ وادی قناۃ کے باعث نیز دو چشموں کی موجودگی کی بنا پر اُحد اور قناۃ کے مابین باغ، مکانات وغیرہ ہوں جو اب باقی نہیں رہے اور یہ رسالے کو روکتے ہوں گے اور وہ صرف وادی قناۃ میں سے گزر سکتا ہوگا۔ اگر رسالہ صرف وادی قناۃ میں سے گزرنا چاہے تو تیرانداز اسے اچھی طرح زد میں لے سکتے ہیں اس دشواری کا ایک خاصا بڑا حل اس تفصیل میں مل جاتا ہے کہ تیراندازوں کی ہمکاری کے لئے چند سوار بھی متعین تھے جیسا کہ ابھی نیچے ذکر آئے گا باغوں کا بھی ہمیں ذکر ملتا ہے ابو دجانہ کا دامن اُحد میں رسول کریمؐ سے ایک خصوصی تلوار اپنی بہادری کے اظہار کے لئے حاصل کرنا مشہور واقعہ ہے۔ اس موقع پر ان کا کہا ہوا ایک شعر جو طبری (ص ۱۴۲۶) اور ابن ہشام (ص ۵۶۲) میں محفوظ ہے، کوئی تعجب نہیں جو اصلی ہو: ؎

انا الذی عاھدنی خلیلی　　　ونحن بالسفح لدی النخیل

اور یہ بظاہر اسی جگہ ایک نخلستان کے ہونے کا ذکر کرتا ہے جو اُحد اور جبل رُماۃ کے مابین ہے۔

جنگ اُحد کے دن قریشی فوج زغابہ سے سیدھے اُحد کے جنوبی دامن میں پہنچ گئی ہوگی اور موجودہ مغربی مقبرۂ شہدا پر مسلمانوں سے اس کی مٹ بھیڑ ہوئی ہوگی۔ خالدبن الولید کا رسالہ کدھر سے آیا؟ میرا قیاس ہے کہ وہ زغابہ کے شمال مشرق میں اُحد کے پیچھے سے گزرتا ہوا مشرقی طرف سے میدان اُحد کی طرف آیا، جہاں باوجود کئی بار بڑھنے کی کوشش کے تیروں کی باڑھ اسے پسپا ہونے پر مجبور کرتی رہی۔ طبری (ص ۱۳۹۴ و مابعد) سے یہ اہم واقعہ بھی معلوم ہوتا ہے

---

[1] ابن ہشام ص ۵۶۱

کہ دشمن کے رسالوں کے مقابلہ کیلئے آنحضرت نے اپنے مختصر رسالے کے بھی دو حصے کئے تھے اور حضرت زبیرؓ کا رسالہ تیر اندازوں کے ساتھ ہمکاری کرتے ہوئے خالد کے رسالے کو پسپا کرنے میں کامیاب حصہ لیتا رہا۔

تاریخ میں جانتے ہیں کہ اہل مدینہ کی جانبازی کے باعث قریشی لشکر کے پاؤں جلدی ہی اُکھڑ گئے[۱] اور مسلمان سپاہی لوٹ گھسوٹ کرنے لگے۔ اس وقت تیر انداز بھی پہاڑ سے اترا ے اور مال غنیمت جمع کرنے کے لئے چوطرف پھیل گئے حالانکہ آنحضرتؐ نے انھیں ہر حال میں اپنی ہی جگہ جمع رہنے کی تاکید فرمائی تھی حتیٰ کہ مسلمان فوج کو شکست بھی کیوں نہ ہو جائے۔ سات آٹھ تیر انداز جو وہاں رہ گئے، خالد بن الولید کے رسالے کے نئے دھاوے کو روکنے کے ناقابل تھے۔ جب ان سواروں نے مسلمانوں پر اچانک پیچھے سے حملہ کیا[۲] اور وہ پلٹے تو پسپا ہونے والا قریشی لشکر بھی تھما اور دوبارہ حملہ کیا۔ اب مسلمان دو طرف سے گھر گئے اور آنحضرتؐ کی شہادت کی افواہ پھیلی[۳] تو ان کے اوسان اور بھی خطا ہوئے اور آخر انھیں شکست ہوگئی اور اکثر مدینے کی طرف بھاگ نکلے۔

قریش سمجھے کہ ان کا کام ختم ہوگیا اور وہ اپنے اونٹوں پر سوار ہو کر روانہ ہو گئے[۴]۔

آنحضرت زخمی ہو گئے تھے۔ آپ کے دندان مُبارک کو بھی دشمن کی سنگ اندازی سے صدمہ پہنچا تھا[۵] اور دشمن کے کھود کر چھپائے ہوئے ایک گڑھے میں بھی اتفاقاً آپ گر پڑے تھے[۶]۔ مگر دشمن مسلمانوں سے میدان کو خالی پا کر اپنے پڑاؤ کی طرف روانہ ہونے لگا تو بچے کچھے مسلمان سپاہی پھر جمع ہونے لگے اور آنحضرت بھی اپنے گڑھے سے نکلے اور احد پہاڑ کے مشرقی حصے پر اپنے ساتھیوں کی مدد سے چڑھے[۷] اور وہاں کے محفوظ غار میں جا کر آرام لیا۔ جس میں ایک آدمی آرام سے لیٹ سکتا اور متعدد لوگ اس کے بازو بیٹھ سکتے ہیں۔ آنحضرتؐ کی سلامتی کی خبر پھیلی تو مسلمان سپاہی بھی اس غار کی طرف چڑھنے لگے۔ اس اجتماع کو دیکھ کر چند دشمن کے سپاہی متوجہ ہوئے مگر مسلمان بلندی پر تھے ان کی سنگ اندازی[۸] کا مقابلہ ایک چھوٹی ٹکڑی نہیں کر سکتی تھی اور اپنے ساتھیوں کو جاتا دیکھ کر اُنھوں نے اس آخری مورچے کو زیادہ اہمیت بھی نہ دی۔ اور خود بھی روانہ ہو گئے۔ آنحضرتؐ کو خوف ہوا کہ کہیں یہ شہر مدینہ میں گھس کر وہاں لوٹ مار اور آتش زنی نہ کریں۔ مگر جب یہ خبر ملی کہ گھوڑوں کو کوتل بنا کر دشمن اونٹوں پر سوار جا رہا ہے تو یہ نتیجہ نکالا گیا کہ وہ لمبے کوچ کا ارادہ رکھتا ہے، مدینہ پر دھاوے کا نہیں[۹]۔ آنحضرتؐ پھر بھی مطمئن نہیں ہوئے اور اس خیال سے دشمن اپنی غلطی پر نادم ہو کر پھر راستے سے واپس نہ پلٹے آپ قریش کے پیچھے پیچھے روانہ ہوئے اور آٹھ دس میل تک جا کر کافی عرصہ راستے پر قیام کیا اور جب اطمینان ہوگیا تو مدینہ واپس آئے[۱۰]۔

---

[۱] ابن ہشام ص ۵۶۹ — [۲] ایضاً ۵۷۰ — [۳] ابن ہشام ص ۵۷۰ — [۴] ابن ہشام ص ۵۵۵ و ما بعد

[۵] ابن ہشام ص ۵۷۱ — [۶] ایضاً ص ۵۷۲ — [۷] ایضاً ص ۵۷۲ و ۵۷۶ — [۸] ایضاً ۵۷۶

[۹] ابن ہشام ص ۵۸۳ — [۱۰] ایضاً ص ۵۸۸

شمال
احد
عسکر اسلامی
مغار النبی
محل راحۃ النبی
محل راحۃ النبی
فوج اسلامی
مدفن ثنایا النبی
فوج قریش
مزار الشہداء
عین
مزار الشہداء
عین
مدفن حمزہ و مسجد
وادی قناۃ
مدفن حمزہ سابقاً
جبل رماۃ (جبل عینین)
مصرع حمزہ
خریطۃ غزوۃ
احد
۲۵ ۵۰ ۷۵ ۱۰۰ میتر

خندق

(دیکھئے نقشہ کـ[۱] تصاویر ۱-۲/ل)

اُحد کی لڑائی میں قریش جیت تو گئے لیکن مدینے میں اپنا فوجی دستہ چھوڑ جانے اور اپنے شامی کاروانوں کے راستہ کی مستقل حفاظت کا اطمینان کرنے پر انھوں نے کوئی توجہ نہ کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ قریش اور ان کے حلیف ہمراہیوں کے مدینے سے دور نکلتے ہی مسلمان اپنے گھروں میں آ گئے اور جلدی ہی انھوں نے اپنا کھویا ہوا وقار نہ صرف حاصل کر لیا بلکہ اپنے اثرات مشرق میں نجد تک[۱] اور شمال میں کاروانوں کے جنکشن دُومۃ الجندل کے قریب تک پھیلا دیئے[۲] اور قریش کا نہ صرف شام و مصر بلکہ عراق[۳] کا راستہ بھی مؤثر[۴] طور سے بند کر دیا۔ اور خود شہر مدینہ میں بھی وہاں کے یہودیوں کی روز افزوں جلاوطنی اور نومسلم عرب قبائل کے توطن سے ان کی حالت مستحکم تر ہوگئی۔ (دیکھئے میرا خصوصی مقالہ بعنوان "ہجرت" رسالہ سیاست حیدرآباد جولائی ۴۸ء[۵])

مگر یہودیوں کی جلاوطنی تازہ مشکلات کا باعث بنی یہ لوگ مدینے کے شمالی علاقوں میں جا کر بسنے لگے جیسے خیبر، وادی القُریٰ، اور دیگر یہودی نوآبادیاں جو شامی راستے پر فلسطین تک پھیلی ہوئی تھیں غالباً دُومۃ الجندل میں بھی ان کے خاصے اثرات تھے کیونکہ مدینہ آنے والے غلّے وغیرہ کے کاروانوں کو اب دومۃ الجندل میں بھی چھیڑا جانے لگا۔[۶] ان یہودیوں نے اپنے معاشی اثرات سے ایک طرف تو غطفان وغیرہ[۷] قبائل کو مدینے پر دھاوا بولنے کے لئے فراہم کر دیا اور دوسری طرف قریش کو بھی ان تیاریوں سے آگاہ کر کے مدینے پر حملہ کرنے کے لئے آمادہ کر دیا[۸] اور یہ سب تیاریاں پوری مستعدی سے کوئی دو سال تک ہوتی رہیں۔ اور شوال ۵ھ میں مدینے کی خندق کا محاصرہ کر لیا گیا۔

دومۃ الجندل میں مدینہ آنے والے کاروانوں کو ستایا بلکہ روکا جانے لگا تو آنحضرتؐ خود اُدھر روانہ ہوئے تاکہ اس کانٹے کو راستے سے صاف کیا جائے[۸]۔ بظاہر دوران مہم میں آپؐ کو اس مخالفانہ سازش اور جتھابندی کا پتہ چل گیا اور یہ بھی معلوم ہوگیا کہ اب بہت جلد وار کیا جانے والا ہے۔ اسی لئے خلاف معمول آپؐ آدھے راستے[۹] سے

---

[۱] بئر معونہ و ذات الرقاع وغیرہ نجد ہی میں ہیں [۲] ابن ہشام ص ۱۹۱ تا ۹۲ [۳] التنبیہ والاشراف للمسعودی ص ۲۴۸ [۴] ابن ہشام ص ۵۴۷، طبری ص ۱۳۷۴
[۵] ابن ہشام ص ۶۸۱ [۶] البدایہ لابن کثیر ج ۴ ص ۹ [۷] ابن ہشام ص ۶۶۸ [۸] ایضاً

مدینہ واپس آ گئے اور شہر کی مدافعت کا انتظام کرنے لگے۔

اسلامی مورخ عام طور سے لکھتے ہیں کہ مدافعت کے مشورے میں حضرت سلمان فارسی نے رائے دی کہ شہر کے اطراف ایک خندق کھودی جائے جیسا کہ ایران میں رواج ہے[۱]۔ مکتوبات نبوی میں سے ایک میں جو مغازی الواقدی اور مقریزی کی "التخاصم بین بنی ہاشم و بنی امیہ" میں ملتا ہے، ابو سفیان نے طعنہ زنی کی کہ مقابلے کی جگہ قلعوں میں گھس بیٹھے ہو اور حیرت ظاہر کی ہے کہ یہ نیا داؤ کس سے سیکھا۔ اس کے جواب میں آنحضرتؐ نے لکھا، کہ خدا نے آپ کو یہ چیز الہام کی[۲]۔

بہر حال جو بھی ہو، یہ امر واقعہ ہے کہ ۵ھ کی یورش کا مقابلہ آنحضرت نے ترقی یافتہ اصول جنگ سے کیا۔ کم و بیش یہی رائے آپ کی جنگ اُحد میں تھی کہ شہر میں محصور رہ کر مدافعت کریں مگر نوجوان سپاہیوں اور افسروں کے اصرار پر آپ نے شہر سے باہر نکل کر مقابلہ کیا تھا اور ستر مسلمانوں کی کثیر تعداد کا نقصان برداشت کرنا پڑا تھا[۳]۔

واقدی کا بیان ہے کہ دومۃ الجندل کی مہم سے واپس آنے اور خندق کی تجویز پختہ ہونے کے بعد آنحضرتؐ چند انصار و مہاجرین کے ساتھ گھوڑے پر سوار ہو کر نکلے اور شہر کے اطراف ان مقامات کا معائنہ فرمایا جو جنگ اور محاصرے میں اہمیت رکھ سکتے تھے اور اس مقام کی تلاش کی جہاں پڑاؤ ڈال کر مسلمان سپاہی اتر سکیں۔ اور طے یہ ہوا کہ حسب معمول عورتیں، بچے، جانور، غلہ، قیمتی اثاث البیت ان گڑھیوں میں منتقل کر دئے جائیں جو مدینے کے اطراف میں سیکڑوں کی تعداد میں تھیں اور جن کو آطام اور آجام کہا جاتا تھا۔ اور مسلمان سپاہی جبل سلع کے دامن میں خیمے لگا دیں اور اپنے سامنے ایک لمبی اور گہری خندق کھود دیں۔

شہر کے اطراف خاص کر جنوب میں باغوں کا جال بچھا ہوا تھا اور ان کے درمیان جو تنگ راستے تھے ان میں سے گزرنے کی کوشش دشمن کو صف کی جگہ قطار بنانے پر مجبور کرتی تھی اور ان راستوں میں چھوٹی چھوٹی چوکیاں بھی بڑی سے بڑی فوج کو روک دینے کے لئے کافی تھیں۔ مشرق میں بنو قریظہ وغیرہ یہودیوں کے سیکڑوں مکان اور باغ تھے اور فی الوقت ان سے بہت اچھے تعلقات تھے اور ادھر سے بھی اطمینان سا تھا۔ شمال کا رخ ہی سب سے خطرناک تھا اور ایک حد تک مغربی رخ بھی۔ اس لئے آنحضرتؐ کی ابتدائی تجویز کے مطابق شمال میں حرۂ شرقی اور حرۂ غربی کو ملاتی ہوئی ایک خندق کھدائی گئی جو نیم دائرہ بناتی ہوئی جبل سلع کے مغربی کنارے سے آملی[۵]۔ پھر مختلف قبائل نے اپنے محلوں کی حفاظت کے لئے اپنے طور پر[۶] اسے جنوب میں عیدگاہ (مسجد غمامہ یا مصلّی) کے مغرب سے گزارتے ہوئے کافی دور تک قبا کے رخ میں بڑھا دیا۔ شہر مدینہ کی تاریخ میں سطری نے لکھا ہے کہ اب

---

[۱] طبری ۱۴۶۵ص ۱۴۶۵ [۲] حوالے و متن میری "الوثائق السیاسیہ" میں [۳] ابن ہشام ص ۵۵۸ وغیرہ [۴] مغازی الواقدی ورق (۱۰۲ ب)

[۵] سمہودی در بیان خندق [۶] مغازی الواقدی ورق ۱۰۳ ب۔

ادی بطحان راستہ بدل کر اس جگہ سے گزرنے لگی ہے جہاں خندق کھودی گئی تھی[۱]۔ واقدی[۲] کا بیان ہے کہ قبا میں بھی
بض قبائل نے اپنے آطام کے اطراف خندق کھود دی۔ یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ خندق کو عبور کرنے کے لئے
بض جگہ "دروازے" (نہ کھدی ہوئی کم چوڑی زمین کی صورت میں؟) بھی رکھے گئے تھے لیکن وہ کس جگہ تھے واقدی
و بھی معلوم نہ ہوسکا[۳]۔ قیاس چاہتا ہے کہ اس سے مراد وہ پہاڑیاں ہوں گی جن کو خندق کے زنجیرے کی کڑیاں
نا یا گیا تھا۔ اور یہ پہاڑیاں عبور و مرور کے لئے ممکن ہونے کے ساتھ ساتھ دیکھ بھال کی چوکیاں بھی تھیں۔ چنانچہ
سجد ذباب اس کا اب بھی بقایا ہے جس پر ابتدائً آنحضرتؐ کے لئے ایک ترکی ڈیرہ[۴] لگایا گیا اور پھر جہاں اس کی
ادگار میں دروازے والی مسجد (ذوباب) بنائی گئی جو اب "ذُباب" کہلانے لگی ہے۔

غرض جیساکہ بیان ہوا، شہر مدینہ بکثرت محلّوں پر مشتمل تھا اور ان محلّوں کے مابین کافی مسافت تھی۔ اور
ہ درمیانی زمین باغات اور نخلستانوں کی صورت میں تھی جن کے اطراف اکثر صورتوں میں پتھر کی مستحکم اور خاصی بلند
یواریں تھیں جن کی وجہ سے خود باغوں کو "حائط" کہا جانے لگا۔ ایسے باغ اب تک مدینۂ منورہ میں باقی ہیں۔ اور ان
یں پختہ اور وسیع کنویں اب بھی اس قابل ہیں[۵] کہ ان میں درجنوں لوگ اتر کر چھپ جائیں اور ان پختہ والانوں اور حجروں
سے جو کنووں کے اندرونی حصے میں بنائے گئے ہیں، گڑھیوں بلکہ چھوٹے قلعوں کا کام لیں (یہ کنویں حالت امن
یں قیدیوں کے لئے محبس کا بھی کام دیتے تھے جیسا کہ کتانی[۶] نے بحوالۂ عینی لکھا ہے کہ کانت السجون آبارا) اور مختلف
محلّوں کے یہ باغ اور گھر باہم کچھ اس طرح متصل ہو گئے ہیں کہ متعدد جگہ دو اونٹ گزرنے کے قابل عریض گلیوں
کے سوا کوئی اور گزرگاہ بھی نہیں ہے یہ حالت خاص کر قبا کے یعنی جنوبی رخ میں اب تک نظر آتی ہے۔ عہد نبوی میں
جب کہ یہ باغ بہت زرخیز حالت میں تھے ان کی حالت جو کچھ ہو گی اس کا اندازہ اس اقتباس سے ہوتا ہے جو سمہودی
نے ابن اسحاق سے نقل کیا ہے:-

عن ابن اسحاق کان احد جانبی المدینة عورة وسائر جوانبها مشککة بالبنیان والنخیل لا یتمکن العدو منها. (وفاء الوفا تحت کلمہ "خندق")	ابن اسحاق سے روایت ہے کہ شہر مدینہ کا ایک رخ کھلا ہوا اور اس کے باقی رخ عمارتوں اور کھجور کے گھنے باغوں سے گھرے ہوئے تھے جن میں سے دشمن گزر نہیں سکتا تھا

اسی ایک کھلے رخ یعنی شمال کی جانب خندق کھودی جانی طے ہوئی چنانچہ اولاً اس علاقے کی پیمائش
کی گئی پھر کام رضاکاروں پر بانٹا گیا۔ اور تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ رضاکارانہ خدمت کی دعوت پر جب تین ہزار
مسلمانوں نے لبیک کہی تو ہر دس دس آدمیوں کی ٹکڑی پر چالیس "ذراع" (جو شاید بیس گز کے مترادف ہے) لمبی خندق

---

۱ کتاب التعریف بما انست الہجرہ من معالم دار الہجرۃ بر موقع ۲ مغازی ورق (۱۰۳ ب) ۳ ایضاً (ذکران الخندق لہ ابواب فلسنا ندری این موضعها) ۴ سمہودی تحت کلمہ (ذباب) طبری ص ۱۴۶۸
۵ مثلاً بئر رومہ اور باغ قریم بری قریب قبا۔ ۶ التراتیب الاداریہ ج ۱ ص ۲۹۸

کھودنے کا کام سپرد ہوا[1] دوسرے الفاظ میں یہ خندق تقریباً ساڑھے تین میل طویل تھی۔ گہری اور چوڑی کتنی تھی اس کا کوئی پتہ مجھے اب تک کسی کتاب میں نہیں ملا۔ لیکن اس کے کئی مرتبہ تذکرے ملتے ہیں کہ دشمن کے سوار خندق کو لانگ کر آنے کی کوشش میں عموماً ناکام رہے۔ اور ایک مرتبہ ایسی ہی ایک کوشش میں ایک سوار خندق کے اندر گر کر مر گیا[2] اس طرح کوئی تعجب نہیں جو دس گز چوڑی اور اتنی ہی گہری خندق کھودی گئی ہو۔

خندق کی کھدائی کے زمانے میں آنحضرت اپنا مکان چھوڑ کر خندق سے متصل ایک پہاڑی پر خیمہ لگا کر مقیم ہو گئے جس کی یادگار آج تک مسجد ذُباب (اصل میں "ذو باب" یعنی دروازے والی مسجد) موجود ہے۔ سپہ سالار اعظم کی یہ مستعدی ظاہر ہے کہ رائگاں نہیں جا سکتی تھی۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ رسول کریمؐ نے دس آدمیوں کی ایک ٹکڑی میں خود بھی شرکت فرمائی۔ اسی ٹکڑی میں سلمان فارسیؓ بھی تھے ـــــ اور کھدائی میں برابر کا حصہ لیتے رہے[3]۔

سلمان فارسی ایک قوی ہیکل آدمی تھے اور کئی آدمیوں کے مجموعی کام کے برابر خود کرتے تھے چنانچہ بقول واقدی جعلوا لہ خمس اذرع طولا وخمس فی الارض) اس لئے ہر ٹکڑی کے لوگ چاہتے تھے کہ سلمانؓ انھیں کے ساتھ ہوں۔ اس پر بروایت ابن ہشام وغیرہ رسول کریمؐ نے فرمایا "سلمان منّا اھل البیت" (یعنی نہیں، سلمان تو ہمارے اہل بیت کے ساتھ ہوں گے) اس جملے سے شاید یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ رسول کریمؐ کی ٹکڑی میں زیادہ تر اہل بیت نبوی کے افراد مثلاً حضرت علی وغیرہ ہوں گے۔[4] بعض بیانوں سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابوبکر اور حضرت عمر بھی آنحضرت کے ساتھ ہی رہتے تھے۔ چنانچہ واقدی[5] اور شامی[6] نے ایک روایت نقل کی ہے کہ کثرت کار اور شب بیداری سے تھک کر ایک دن آنحضرت خندق کی کھدائی کے وقت آرام لینے لیٹ گئے تو:۔

ورائت ابا بکر و عمر واقفین علی راسہ (صلعم) ینحیان الناس ان یمروا بہ فینبّھوہ"	راوی کہتے ہیں:۔ میں نے ابوبکر اور عمر کو دیکھا کہ وہ آنحضرت کے سرہانے کھڑے تھے اور لوگوں کو ہٹا رہے تھے ایسا نہ ہو کہ وہ آپ کے پاس گزر کر آپ کو بیدار کر دیں۔

اسی روایت میں ایک دلچسپ جملہ یہ بھی ہے:۔

وکان ابو بکر و عمر لا یتفرقان فی عمل ولا مسیر ینقلان التراب فی ثیابھما یومئذ من العجلۃ اذ لم یجدا و امکاتل لعجلۃ المسلمین۔	اور ابوبکر و عمر کبھی کام کرنے میں یا کہیں آنے جانے میں ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوتے تھے جلدی میں یہ مٹی کو اپنے کپڑوں میں ڈھوتے تھے کیونکہ مسلمانوں کو جلدی میں ٹوکریاں نہیں مل سکی تھیں

---

[1] کتانی ۱/ ۲۹۵ طبری ص ۱۴۶۶ وغیرہ [2] طبری ص ۱۴۷۶ / مسند ابن حنبل ۱/۴۶۴ [3] طبری ص ۱۴۶۵، ص ۱۴۶۶۔ [4] مغازی ورق (۱۰۳ ب)

[5] سیرۃ شامی بر موقع [6] مگر طبری ص ۱۴۶۷ سے معلوم ہوتا ہے کہ انصار وغیرہ لوگوں ہی پر یہ جماعت مشتمل تھی۔

مساجد خمسہ (خندق)

منظر میدان خندق از مسجد فتح

ابن سعد[1] سے معلوم ہوتا ہے کہ قلعۂ راتج (حرۂ شرقی) سے جبل ذباب تک مہاجرین مامور تھے اور وہاں سے جبل بنی عبید اور مسجد فتح تک انصار۔ بعض تاریخوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ مسلمانوں نے بنو قریظہ کے یہودیوں سے کھدائی کا سامان مستعار حاصل کیا تھا۔[2] اس وقت تک بنو قریظہ کو اتنی ہمت نہ ہوئی تھی کہ اپنے دلی جذبات غداری کو ظاہر کریں کیونکہ دشمن ابھی آیا نہ تھا۔ اور سنہ ۱ھ کے معاہدے کے تحت[3] وہ مدافعت مدینہ میں مسلمانوں کا ہاتھ بٹانے کے پابند تھے۔

یہ کھدائی بعض بیانوں کے مطابق کوئی تین ہفتے[4] جاری رہی جب "سرکاری" خندق شمال میں مکمل ہونے لگی تو مختلف محلّوں کے باشندے بھی دیکھا دیکھی اپنے طور پر اس سامان مدافعت سے استفادہ کرنے اور خندق کی اپنے محلے کے سامنے توسیع کرنے لگے اور اس طرح شہر کے مغرب میں بھی کوئی دو ڈھائی میل کی خندق کھد گئی۔ اس کے علاوہ بعض آطام کے گرد خندق کھود لی گئی جیسا کہ اوپر ذکر ہوا۔

خندق کی کھدائی کے دوران میں رضاکار جو اشعار گاتے تھے ان میں سے بھی چند تاریخ نے محفوظ کر رکھے ہیں[5]

واقدی[6] نے ایک واقعہ نقل کیا ہے جو انسانی عناصر کے ہر زمانے میں پائے جانے پر دلالت کرنے کے باعث نقل کیا جا سکتا ہے۔ وہ یہ کہ حضرت زید بن ثابتؓ جو اس وقت دس بارہ سال کے بچے ہوں گے، خندق کھودنے میں ہاتھ بٹانے لگے اور دھوپ اور محنت سے تھک کر ایک دن جو ذرا کہیں لیٹے تو آنکھ لگ گئی۔ حضرت عمارہ بن حزم بڑے ہنسکھ اور چلبلی طبیعت کے تھے۔ ان کی جو نگاہ پڑی تو بچے سے بھی دل لگی نہ چھوڑی اور حضرت زید بن ثابت کا کھدائی کا سامان اور کپڑے چپکے سے اٹھا کر کہیں چھپا دئے۔ ظاہر ہے کہ کوئی بڑا تو بیدار ہونے پر سمجھ جائے کہ کسی دوست کی شرارت ہے لیکن کسی کمسن جوشیلے کا اس "اپنی کوتاہی اور قصور" پر گھبرا جانا ناگزیر ہے۔ اسی لئے آنحضرتؐ نے ایک طرف حضرت زید کو ابو رقاد کہہ کر ملامت کی (یعنی بڑا سونے والا) اور دوسری طرف حضرت عمارہ کو تنبیہ کی کہ کن صورتوں میں مذاق نامناسب ہے۔ خندق کی کھدائی ہر جگہ یکساں رفتار سے نہ رہی ہو گی شمال میں چوڑ کی زمین آسانی سے کھد گئی ہو گی۔ حرّہ میں دشواری ہوئی ہو گی۔ چنانچہ سنگ مرمر کی ایک چٹان سے رضاکار عاجز ہو کر یہ اجازت لینے آئے کہ پیمائشی جگہ سے خندق کو ذرا ہٹا دیں۔ آنحضرتؐ کا اس چٹان کو خود آ کر توڑنا مشہور واقعہ ہے[7]۔ ایک اور واقعہ ابن ہشام ص ۶۷۱ میں مذکور ہے۔

کھدائی مکمل ہونے لگی تھی کہ دشمن بھی آ پہنچا۔ آنحضرتؐ نے فوراً عورتوں بچوں وغیرہ کو حسب معمول گڑھیوں میں بھیج دیا[8] اور خود پوری فوج کے ساتھ جبل سلع پر پڑاؤ لگا کر مقیم ہو گئے۔ اور آپ کا خیمہ بھی اب جبل ذباب سے

---

[1] برموقع [2] مغازی الواقدی ورق (۱۰۲ ب) [3] دستور مدینہ دفعہ ۴۴ [4] ...
[5] ابن ہشام ص ۱۷۱ [6] مغازی ورق (۱۰۳) [7] طبری ص ۱۴۶۷ تا ۱۴۶۹ نیز ابن ہشام ص ۶۷۳ [8] طبری ص ۱۴۷۶۔ لکھا ہے کہ بی بی عائشہ اطم بنی حارثہ میں رہیں (طبری ص ۱۴۷۶)

جبل سلع کے ایک اہم مگر محفوظ مقام پر منتقل کر دیا گیا۔ آپ کی خیمہ گاہ پر اب مسجد فتح بطور یادگار پائی جاتی ہے[1] اور اسی کے قریب آپ کے چار سپہ سالاروں کے خیمے تھے وہاں بھی مسجدیں تعمیر کی گئی ہیں جو حضرت سلمانؓ حضرت ابوبکرؓ، حضرت عثمانؓ اور حضرت ابوذر رضی اللہ عنہم کی طرف منسوب ہیں۔ اور یہ سب مساجد خمسہ کے نام سے مشہور ہیں۔ اور اب تک پائی جاتی ہیں۔ (تصویر ل/۱)

دشمن جیسا کہ معلوم ہے متعدد حلیف قبائل پر مشتمل تھا اور ان کے متحد کرنے اور چڑھائی پر آمادہ کرنے میں مدینے سے نکالے ہوئے یہودی بنوالنضیر نے بڑا حصہ لیا تھا۔ قریش نے اُحد کی فتح سے ہمت پاکر اور دیگر قبائل نے مال غنیمت کے لالچ میں مدینے کا محاصرہ کرنے کی ٹھانی بنوالنضیر نے جو اپنے پورے مال و دولت کے ساتھ خیبر اور دیگر مزید شمالی علاقوں میں جا بسے تھے، اپنے ہمسایہ عرب قبائل کو جن میں غطفان بہت اہمیت رکھتے ہیں اپنے سرمایہ دارانہ اثرات سے متاثر کر کے مسلمانوں کے خلاف اُبھارا تھا۔ غرض یہودی کارندوں نے وہ تمام انتظامات طے کر دئے جو مدینے کے شمال اور جنوب دونوں طرف سے آنے والے حلیفوں کے لئے وقت اور مقام وغیرہ کے سلسلے میں ضروری تھے چنانچہ بقول واقدی (مغازی ورق ۱۰۱ تا ۲) خیبر کا ایک سال کا پورا کھجور غطفان کو دیا گیا تھا۔ غرض قریش اور کنانہ اور احابیش کے قبائل وادی عقیق کے قریب بئر رومہ پر مقیم ہوئے[2] اور غطفان اور بنو اسد اس سے کسی قدر مشرق میں وادی النعمان کے پاس ذَنَب نقمی نامی مقام سے جبل اُحد تک پھیل گئے[3]۔ ان مقاموں پر پانی اور گھاس کی کافی سہولتیں ہیں۔ گو بیان کیا جاتا ہے کہ فصلیں کٹ کر کافی عرصہ ہو چکا تھا (مغازی الواقدی ورق ۱۰۲)

مسلمان جبل سلع پر اور اس کے دامن میں مقیم تھے اور خندق کی باری باری سے ان کی ٹکڑیاں نگہبانی کرتیں اور پہرہ دیتیں[4] اور جب کبھی دشمن خندق کے کسی مقام پر نرغہ کرتا تو مسلمانوں کی فوج تیروں سے اس کا استقبال کرتی۔ دشمن کے سوار بھی خندق کی دوسری طرف منڈلایا کرتے اور غفلت کی تلاش میں رہتے۔ ایک آدھ مرتبہ دشمن کے بعض سردار اپنے عمدہ گھوڑوں کو خندق کدانے میں کامیاب ہو گئے[5] لیکن یہ ظاہر ہے کہ اکا دکا آدمی محصور مقام میں گھس آئے اور اُسے مدد دینے والے نہ آسکیں تو اس جسارت پر خود اسی کو بھگتان بھگتنا پڑتا ہے اور خندق کے معرکے میں بھی یہی ہوا بعض لوگ خندق کدانے کی کوشش میں کھائی میں گر پڑے اور جان سے ہاتھ دھونا پڑا۔

محاصرے میں روز افزوں شدت ہوتی گئی تو مدینے کے مشرق میں رہنے والے بنو قریظہ (یہودیوں کا)

---

[1] سمہودی وغیرہ۔ [2] طبری، ابن ہشام وغیرہ [3] ایضاً [4] مغازی الواقدی ورق (۱۰۵)

والمسلمون علی خندقهم يتناوبونه معهم بضعة وثلاثون فرسا والفرسان يطوفون على الخندق ما بين طرفيه

[5] طبری ص ۱۴۷۵ تا ۷۶

م/۱

ثنیتہ الوداع جہاں ہجرت کے وقت
رسول کریم کا استقبال ہوا
(طلع البدر علینا من ثنیات الوداع)

م/۲
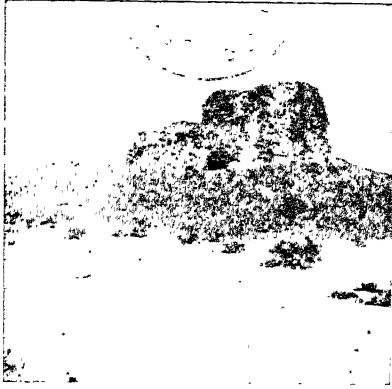
اطم الضحیان
(مدینہ میں قبل اسلام کی گڑھی)

سقیفۂ بنی ساعدہ
جہاں خلافت صدیقی کا فیصلہ ہوا

م/۳

مسجد غمامہ
(عید گاہ جہاں سے عہد نبوی میں
گھڑ دوڑ شروع ہوتی تھی)

م/۴

مسجد السبق (جہاں رسول کریم گھڑ دوڑ
کے نتائج جانچنے کھڑے ہوتے تھے)

م/۵

م/۶

کعب بن الاشرف (بنو النضیر) کا کھنڈر قصر

م/۷

قصر کعب بن اشرف کا متصلہ سنگین حوض

ک بھی بدلنے لگا اور افواہوں کی توثیق کے لئے آنحضرتؐ نے جاسوس بھیجے اور انھیں راز میں سمجھا دیا کہ
عاملہ دگرگوں دیکھو تو سب سے کہہ کر پریشانی میں اضافہ نہ کرنا بلکہ معینہ (اور بظاہر اطمینان دہانی کے) الفاظ آنحضرتؐ
سے کہنا جس کا مطلب آپ تو سمجھ جائیں گے مگر دوسرے سننے والے عوام بے خبر رہیں گے۔[1] بنو قریظہ کی غداری
کی توثیق تو ہو گئی لیکن یہ نہ معلوم ہوا کہ وہ کب وار کرنے والے ہیں۔ اور چونکہ ان کو مسلمانوں کے پیچھے سے
گھس آنے یا شہر مدینہ کو لوٹ لینے میں کوئی رکاوٹ نہ تھی۔ اس لئے حضرت ابو بکرؓ کا بیان[2] ہے:۔

لقد کنت اُوافی علی سلع فانظر الی بیوت المدینۃ فاذا رأیتھم ھادئین حمدت اللہ — میں بار بار جبل سلع کی چوٹی پر چڑھ کر نظر دوڑاتا اور جب مدینے کے گھروں کو پرسکوں پاتا تو خدا کا شکر کرتا۔

اب صورت حال جتنی خطرناک ہو گئی تھی ظاہر ہے۔ قرآن میں تک اس کا نقشہ پر درد الفاظ میں کھینچا لیا ہے:۔

إذ جاءوکم من فوقکم ومن أسفل منکم وإذ زاغت الأبصار وبلغت القلوب الحناجر وتظنون باللہ الظنونا ○ ھنالک ابتلی المؤمنون وزلزلوا زلزالا شدیدا ○

جب وہ تمہاری طرف آئے تمہارے اوپر سے اور تمہارے نیچے سے اور نظریں خیرہ ہو گئیں اور کلیجے منہ کو آنے لگے اور تم خدا کے متعلق عجیب بدگمانیاں کرنے لگے۔ اس موقع پر ایمان والوں کی آزمائش ہوئی اور ان میں ایک شدید زلزلہ مچ گیا۔

اس وقت فوری کارروائی کی ضرورت تھی۔ آنحضرتؐ نے خفیہ قاصد غطفانیوں اور فزاریوں کے سردار حارث بن عوف اور عُیینہ بن حصن کے پاس بھیجے اور ان سے معاہدہ کر لینا چاہا کہ وہ مدینے کے کھجوروں کی فصل کا معقول حصہ لے کر محاصرے سے دستبردار ہو جائیں۔ مگر شرطیں کڑی تھیں اور مسلمان ان پر آمادہ نہ ہوئے اور لکھی ہوئی دستاویز معاہدہ مٹا دی گئی[3]۔

اب واحد چارۂ کار حلیفوں میں پھوٹ ڈلوانا اور غلط فہمی پیدا کرانا تھا۔ کئی ہفتوں کے قیام کے باعث محاصرہ کنندوں کا آذوقہ ختم ہو چلا تھا اور ان کے پاس آنے والی رسد بھی مسلمانوں نے لوٹ لی تھی[4]۔ اس لئے وہ بنو قریظہ کو جلد حملہ کرنے پر مجبور کرنے لگے۔ مسلمان فوج تین ہزار سے زیادہ نہ تھی۔ قریش وغیرہ محاصرہ کرنے والے چھے سات ہزار تھے۔ بنو قریظہ میں ڈیڑھ ہزار سے زیادہ سپاہی تھے۔ خندق اتنی طویل تھی کہ مسلمان ادھر سے اپنی جمعیت کو گھٹانے اور بنو قریظہ سے مقابل ہونے کا خیال بھی نہیں کر سکتے تھے۔

---

[1] طبری ۱۴۷۳ نیز ابن ہشام ص ۶۸۳ وغیرہ [2] مغازی الواقدی ورق (۱۰۵) [3] ابن ہشام ص ۶۷۶، طبری ص ۱۴۷۴ [4] شامی کے مطابق حیی بن اخطب نے بیس اونٹ جو اور کھجور اور بھوسے سے لاد کر بھیجے تھے جو مسلمانوں کی ایک طلایہ گرد ٹولی کے ہاتھ پڑ گئے۔

آنحضرت نے چند نو مسلم کارندے بنو قریظہ کے پاس بھیجے جن کا اسلام لانا ابھی مشہور نہ ہوا تھا۔ انھوں نے بنو قریظہ میں سے اپنے دوستوں سے کہا کہ قریش کا جیتنا سو فی صد تو یقینی نہیں۔ تم نے اگر محمدؐ سے خواہ مخواہ جھگڑا مول لیا اور قریش محاصرہ اٹھا کر چلتے بنے تو پھر تم تنہا محمدؐ سے کیا مقابلہ کرو گے بہتر ہو کہ تم قریش سے چند یرغمال مانگو کہ وہ لڑائی کو انتہا تک جاری رکھیں گے۔ یہ چیز جب ان کی سمجھ میں آگئی تو یہی کارندے قریش وغیرہ حلیفوں میں پہنچے اور مشہور کیا کہ بنو قریظہ اور آنحضرت میں ساز باز ہوگئی ہے اور وہ قریش کے سرداروں کو کسی بہانے اپنے پاس بلا کر آنحضرت کے سپرد کر دینا چاہتے ہیں۔ اتنے میں بنو قریظہ کے سفیر پہنچے اور اپنے حملے سے پہلے چند یرغمال طلب کئے تو فوراً قریش کو یقین آگیا کہ ان کی آنحضرت سے ساز باز کی خبر صحیح ہے۔

ایک اور شخص کو آنحضرت صلعم نے یہ باور کرنے کا موقع دیا کہ بنو قریظہ کا یرغمال مانگنا آنحضرتؐ ہی کے حکم سے ہے اور جب اس نے وہ اطلاع قریش کو دی تو پھر انھیں ذرا بھی شبہہ نہ رہا۔ اور یہودیوں سے کشیدگی اور کبیدگی حد کو پہنچ گئی۔

اتنے میں موسم بھی خراب ہوگیا۔ بارش، طوفان، سردی وغیرہ سے محاصر کنندہ پریشان ہونے لگے اور آخر بیزار ہو کر ابو سفیان نے پیش قدمی کی اور وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ مکہ روانہ ہوگیا۔ اس پر دوسرے قبائل بھی بے بس ہو گئے اور یکے بعد دیگرے سب چلتے بنے[1] اور مطلع صاف ہوگیا۔

فتح مکہ

(نقشہ ن ۱-۲)

جیسا کہ ایک حدیث میں بیان ہوا ہے، محاصرۂ خندق کے اختتام پر رسول کریم نے محسوس فرما لیا کہ اب قریش کی چڑھائیاں ختم ہو چکیں اور ان کی قوت بھی۔ چنانچہ اس کے بعد سے مسلمانوں کے اقدام کا موقع نکل آیا اور قریش صرف مدافعت کرنے لگے۔ اس تبدیلِ صورتِ حال کے متعدد وجوہ تھے اور صرف بدر اور خندق میں قریش کی ناکامی فیصل کن امر نہ تھی۔

اصل میں آنحضرت نے دشمن کو نابود کرنے کی جگہ مجبور کرنا پسند فرمایا۔ اس کے لئے دو تدبیریں تھیں

---

[1] اصابہ میں واقعہ مسعود النّام ع۳۰۷۴؛ ابن ہشام ص ۶۸۳ تا ۶۸۴؛ طبری ص ۱۴۸۳ تا ۸۵؛ ابن سعد ج ۲ ص ۵۰

الى مر الظهران (وادى فاطمة) والمدينة
الى جدة
جبل قعيقعان
شمال
أجياد
مسفلة
جبل أبو قبيس
الى اليمن
خريطة فتح مكة
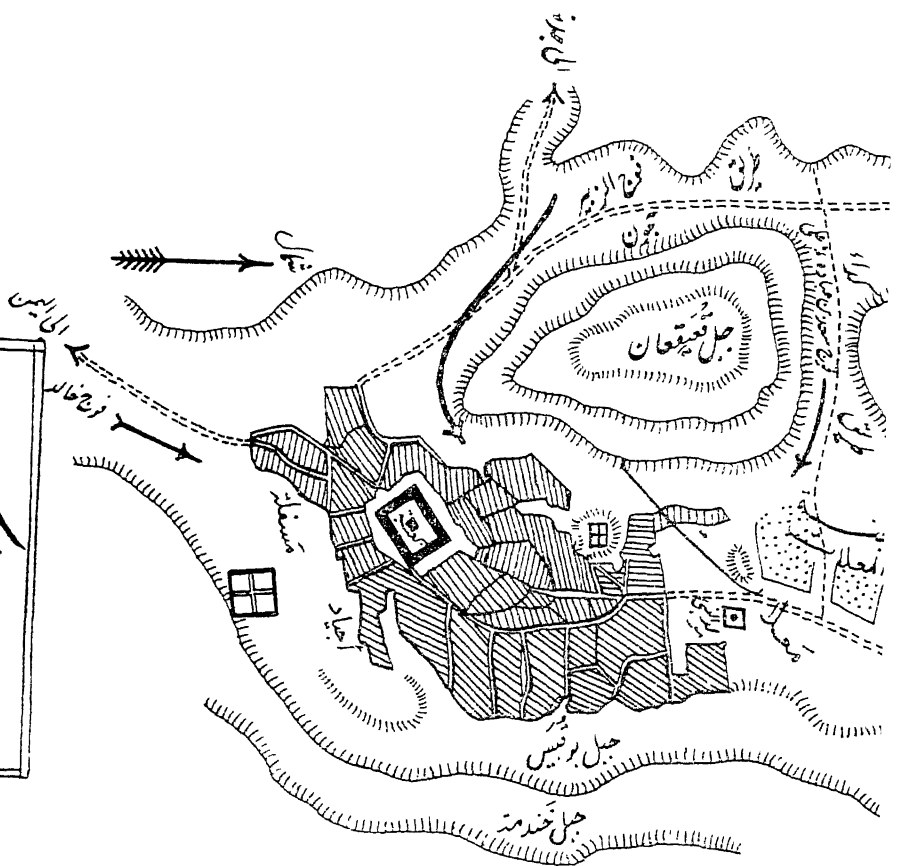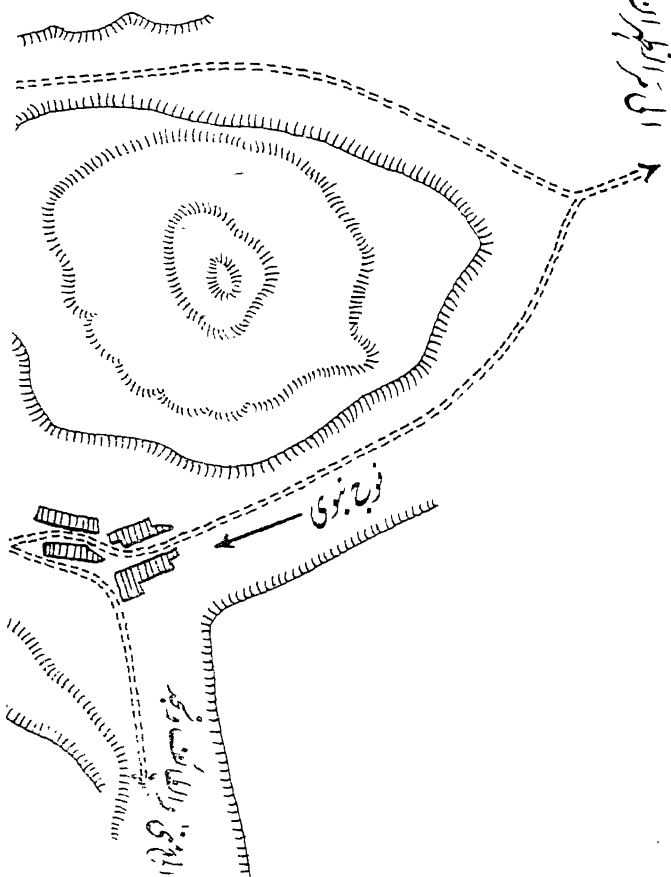
یک تو قریش کو معاشی دباؤ سے بے بس کر دینا اور دوسرے اپنی فوجی قوت اتنی بڑھا لینا کہ دشمن مقابلے کی جرأت ہی نہ کر سکے اور بغیر خوں بہائے مقصد حاصل ہو جائے۔

"وادی غیرذی زرع" کے رہنے والوں کا واحد ذریعۂ معاش نہیں تو سب سے بڑا ذریعہ "رحلة الشتاء والصیف" تھا۔ ہجرت کے دو چار مہینے کے اندر ہی آنحضرت ؐ نے "رحلة الصیف" یعنی شمالی راستہ جو ینبوع کے قریب سے مصر و شام کو جاتا تھا، وہاں کے قبائل سے حلیفی کر کے قریش کے لئے تنگ بلکہ بند کر دیا چنانچہ مدینہ اور ینبوع کے مابین بسنے والے قبائل کے معاہدے تاریخ نے محفوظ رکھے ہیں[۱] اس کے بعد اسلام کے پھیلنے اور آنحضرت کے فتوحات نے اسلامی اثرات نجد تک بھی پھیلا دئے اور عراق کا راستہ بھی قریش کے لئے بند ہو گیا[۲] طائف اور یمن کا راستہ پوری طرح بند نہ ہوا لیکن بین الاقوامی تجارت جو یمن اور مکے کے راستے ہندوستان سے یورپ کی ہوتی ہے اس کا گزرنا بند ہونے سے قریش کی خفارے وغیرہ کے سلسلے میں جو آمدنی ہوتی تھی وہ بھی بند ہو گئی۔ ایک موقع پر ایک لاکھ درہم کی چاندی قریش کے کاروان میں سے مسلمانوں نے لوٹ لی تھی[۳] غالباً یہ اسی بین الاقوام حمل و نقل سے متعلق ہو گی جنگ خندق کے بعد اسلامی اثرات نجد سے گزر کر یمامہ تک پہنچ گئے جہاں سے قریش کے لئے غلے کی درآمد ہوتی تھی اور ثمامہ بن اُثال کے اسلام سے یہ درآمد بھی روک دی گئی تو مورخین کے بیان کے مطابق مکے میں قحط پڑ گیا[۴] گو اس قحط کی ایک وجہ غالباً یہ بھی تھی کہ اسی زمانے میں امساکِ باراں کی وجہ سے حجاز میں خشک سالی تھی آنحضرت نے ایک دفعہ فقراء مکہ میں تقسیم کرنے کے لئے جو پانچ سو دینار بھیجے تھے اور جس پر ابوسفیان نے کہا تھا کہ یہ مکے والوں میں پھوٹ ڈلوانے کے لئے ہے[۵] وہ غالباً اسی زمانے سے متعلق ہے۔ ان سب سے بھی زیادہ موثر یہ بات ہوئی کہ رفتہ رفتہ قریش کے حلیف ان کا ساتھ چھوڑنے لگے اور یا تو وہ مسلمان ہو گئے یا بے بس ہو گئے اور مکے کے چاروں طرف اسلامی قبائل پیدا ہو گئے۔ خیبر ۷ھ میں تباہ ہو گیا اور طائف جس سے قریش کو بڑی امیدیں تھیں فتح مکہ کے زمانے میں صرف تیاریوں میں مصروف رہا اور رمضان ۸ھ میں جب اچانک اسلامی فوجوں نے مکے کے پہاڑوں کے نیچے پہنچ کر پڑاؤ ڈالا تو قریش یکہ و تنہا تھے اور خود ان کا سب سے بڑا سردار ابوسفیان بعض اتفاقات سے مسلمانوں کے پڑاؤ میں جا کر پھنس چکا تھا[۶]

یہاں صرف اشارۃً یہ بیان کر دینا کافی ہے کہ معرکۂ خندق کے دوسرے سال ذی قعدہ ۶ھ میں آنحضرت ؐ مکہ گئے اور قریش کی منہ مانگی شرطیں قبول کر کے دس سال کے لئے ان سے صلح کر لی اور صرف ان سے یہ چاہا کہ وہ اسلامی جنگوں میں غیر جانب دار رہیں[۷] اور مثلاً خیبر کے یہودیوں کی مدد نہ کریں۔ چند ہی دنوں میں مسلمانوں کے ایک حلیف قبیلے

---

[۱] دیکھئے الوثائق السیاسیہ [۲] ابن ہشام ص ۵۴۷۔ [۳] طبری ۳ھ غزوۃ القردۃ ۱۳۷۵ [۴] ابن ہشام ص ۹۹۷ تا ۹۹۸ نیز استیعاب ۲۷۸

[۵] مبسوط سرخسی ۱۰/ ۹۱-۹۲ [۶] ابن ہشام ص ۸۱۱ تا ۸۱۵ [۷] صلحنامۂ حدیبیہ کا متن سیرۃ ابن ہشام، الوثائق السیاسیہ وغیرہ میں ہے۔

(خزاعہ) سے قریش نے جھگڑا مول لیا اور خونریزی کی[1] تو آنحضرتؐ نے دس ہزار قدوسیوں[2] کا ایک لشکر جرار تیار فرمایا اور حسب طریق[3] کرکے اور اپنا مقصد فوج پر ظاہر نہ کرکے بلکہ دکھاوے کے لئے چکر کھا کر اور نامعلوم راستوں سے گزر کر مکہ پہنچے[4] تو قریش کو رات کے وقت پڑاؤ کے چولھوں کی روشنی سے پتہ چلا ورنہ وہ اب تک بالکل بے خبر تھے۔ ابوسفیان نے اسلامی فوج میں گھر جانے کے بعد اپنی بے بسی دیکھ کر اسلام کا اظہار کیا اور جان بچالی لیکن آنحضرتؐ نے ان کو نگرانی میں رکھا[5] اور اس وقت تک رہا نہ کیا جب تک کہ اسلامی فوج حملے کے لئے روانہ ہو کر صورت حال یہ نہ ہوگئی کہ قریش کے لئے اپنی قوتوں کو جمع کرنا ناممکن ہوگیا۔ مرعوب دل ابوسفیان نے آکر گھبراہٹ کو مکمل کردیا اور یقین دلایا کہ مقابلہ بے سود ہے اور یہ کہ ہتیار ڈال دینے، خانہ نشین ہوجانے، ابوسفیان کے گھر میں پناہ لینے یا قومی معبد (کعبہ) کے احاطے میں ـــ جہاں خونریزی کی کسی کو جرأت نہ ہو سکتی تھی ـــ چلے جانے پر آنحضرتؐ نے ان کو امن دینے کا وعدہ کیا ہے[6]۔ ایک طرف ناقابل مقابلہ زبردست قوت اور دوسری طرف اس نرمی اور رحمدلی کی خبروں نے لڑائی کی نوبت نہ آنے دی اور قریش نے اپنے شہر پر خاموشی سے آنحضرتؐ کا قبضہ ہو جانے دیا۔ البتہ مکے پر چڑھائی اور فوجی نقل و حرکت کی تفصیل یہاں ضروری ہوگی۔

مکۂ معظمہ ایک وادی میں واقع ہے جس کے ہر طرف اونچے اور دشوار گزار پہاڑ ہیں۔ صرف ایک بڑا راستہ ہے جو شمالاً جنوباً شہر میں سے گزرتا ہے اور دو ذیلی راستے ہیں جو اس بڑے راستے میں آکر مل جاتے ہیں یعنی طریق حجون اور طریق کداء۔ فوج کا بڑا حصہ جناب رسالتمآب کے ساتھ عام شمالی راستے یعنی معلات کی طرف سے بڑھنے لگا[7]۔ کچھ فوج حضرت الزبیر بن العوام کے تحت طریق کداء سے بڑھائی گئی[8] تاکہ وادی فاطمہ کی راہ ساحل کی طرف جانے والی گزرگاہ کھلی نہ رہے۔ ایک اور مضبوط دستہ سیف اللہ خالد بن الولید کو دے کر جنوبی راستے یعنی مسفلہ کی راہ لیط کی طرف سے شہر میں بڑھنے کا حکم دیا[9]۔ ایک اور فوج حجون کے راستے سے بڑھائی گئی[10] ادھر سے ایک راستہ جدہ جاتا ہے اور ایک اصل شاہ راہ جنوب میں یمن کی طرف جاتی ہے۔ اور ہر معرکہ کی طرح مسلمانوں کے لئے شعار (واچ ورڈ) بھی مقرر کر دیے گئے تھے۔ (ابن ہشام ص ۸۱۸)

جس صبح کوچ تھا اس سے پہلے کی رات کو آنحضرت نے حکم دیا تھا کہ ہر مسلمان سپاہی پڑاؤ پر ایک آگ روشن کرے۔ جب دور سے قریش نے ان دس ہزار چولھوں کو دیکھا تو ان کے چھکے چھوٹ گئے کہ حج کے زمانے میں منا میں جو کیفیت ہوتی ہے[11] وہی نظر آتی اور انہوں نے خیال کیا کہ جتنے چولھے ہیں اس سے کئی گنا زیادہ ہی لوگ ہوں گے۔

---

[1] ابن ہشام ص ۸۰۵
[2] ابن ہشام ص ۸۱۰، ۸۲۸
[3]
[4] طبری سلسلہ ۱ صفحہ ۱۶۳۰ وغیرہ
[5] ابن ہشام ص ۸۱۴
[6] ابن ہشام ص ۸۱۵ مبسوط السرخسی
[7] ابن ہشام ص ۸۱۰
[8] ایضاً ص ۸۱۶
[9] ابن ہشام ص ۸۱۶
[10] طبری ص ۱۶۳۵ ، خراج لابی یوسف ص ۱۳۱ التنبیہ للمسعودی ص ۲۶۷
[11] بعض روایتوں (مثلاً ابن ہشام ص ۸۱۲) میں قبیلۂ خزاعہ کے پڑاؤ کی آگ کو بھی اس کے سامنے حقیر ٹھیرایا گیا ہے۔

ن کے اچھے اچھے افسر یا تو مر چکے تھے (مثلاً ابوجہل وغیرہ) یا مسلمانوں میں مل گئے تھے (جیسے حضرت خالد بن الولید
ور حضرت عمرو بن العاص) یا اس وقت انھیں مشورہ دینے موجود نہ تھے (جیسے حضرت ابوسفیان) پچھلی جنگوں کی مسلسل
لا حاصل زحمتیں، معاشی وباؤ کی تکلیفیں، حریف کی اچانک کثیر تعداد میں آمد پر نفسیاتی تردد جبکہ حلیفوں کو مدد کے لئے بلانے
ا موقع نہ تھا، ابوسفیان کا آخری لمحے میں آکر مقابلے کو بے سود بتانا اور آنحضرت کے رحمدلانہ اعلان معافی کا تذکرہ کرنا؛
تمام امور اور دیگر واقعات نے قریش کو آمادہ کیا کہ ہتیار نہ چلائیں اور اپنے آپ کو اپنے سابق ہمشہری کے رحم
رم کے سپرد کر دیں۔

دس سال کی شبانہ روز جسمانی اور روحانی کاوشوں کے بعد مکے کا جلاوطن اب وہیں فاتحانہ داخل ہو رہا
ا۔ مگر کس انداز میں؟ کسی جبار فاتح کی طرح اکڑتے سینہ تانے اور مسبب حقیقی کو بھلا کر نشۂ خود پرستی میں سرشار؟ نہیں
ابن ہشام (ص ۸۱۵) کے مطابق شرماتے، بارگاہ خداوندی میں سر نیاز جھکاتے اور بار بار اونٹنی کے کجاوے ہی پر
بدۂ شکر ادا کرتے ہوئے اور پچھلی مالی و جانی و روحانی اذیتوں پر انتقام کے خیال کی جگہ لا تثریب علیکم الیوم
ھبوا فانتم الطلقاء[۵] (آج تم سے کوئی موخذہ نہیں جاؤ تم سب آزاد ہو) کے عفو و عام درگزر کا اعلان کرتے ہوئے
بالفاظ مولانا مناظر احسن گیلانی[۲] کے ادخلوا هذه القرية فكلوا منها حيث شئتم وادخلوا الباب سجدا
قولوا حطة، (اس شہر میں داخل ہو اور جیسا چاہو کھاؤ لیکن دروازے میں سجدہ کرتے ہوئے اور معافی ما
تے ہوئے داخل ہو) کی خالص اسلامی شان کا مکمل مظاہرہ تھا۔

فوج کی صف بندی اور معائنہ، بدر و احد جیسی ابتدائی لڑائیوں میں تک آنحضرت ملحوظ رکھتے تھے۔
مکہ تک فوج میں اتنا کچھ ضبط اور تنظیم پیدا ہو چکی تھی کہ اب یہ کام ایک خصوصی افسر صف آرائی (وازع[۳]) کے سپرد
دیا جا سکتا تھا اور اس کے ذریعے سے احکام کی پوری تعمیل ہوتی تھی۔ فوج میں خبر رسانی کے مکمل انتظامات تھے
سپاہیوں اور افسروں کی رتی رتی بات کی اطلاع ملتی رہتی تھی۔ معمولی چیزوں کو نظر انداز کر دیا جاتا تھا اور اہم
رمیں فوری تدارک عمل میں لایا جاتا تھا۔ چنانچہ مکے پر چڑھائی کی آخری نوبت میں جب[۴] ایک افسر نے یہ خیال آرائی کی
اب مکے کا سر نیچا کیا جائے گا اور اسے لوٹ لیا جائے گا تو فوراً اسے علحدہ کر کے کمان دوسرے افسر کے سپرد
ی گئی اور عام منادی کرادی گئی کہ مکۂ معظمہ اور قبلۂ مسلماناں کا سر نیچا نہیں بلکہ اس کی عزت میں آج سے مزید اضافہ ہوگا
شہر میں ہر طرح امن و امان ملحوظ رکھا جائے گا۔ فوج کی تنظیم اپنے فطرتی رجحانات کے مطابق تھی اور ہر قبیلہ اپنے
فسروں کی سرکردگی میں کارگزار تھا۔ مہاجرین[۶]، انصار، اسلم، غفار وغیرہ کے رضا کار سب کے الگ الگ دستے تھے
ایک ہی کل کے پرزوں کی طرح پوری ہم آہنگی کے ساتھ کام کرتے تھے۔

طبری ۳ ص ۱۶۴۲ — ۲ رہبر دکن یوم فتح مکہ نمبر رمضان ۱۳۵۸ھ نیز دیکھو تاریخ طبری ص ۱۶۴۲ تا ۲۳ — ۳ ابن ہشام ص ۸۱۵ — ۴ ابن ہشام ص ۸۱۶

بن ہشام ص ۸۱۴

حُنَین اور طائف

(تصاویر ج ۱-۵)

یہ عجیب بات ہے کہ حُنین کا مشہور اور اہم میدانِ جنگ جس کا قرآن میں نام کے ساتھ ذکر ہے، صدیوں سے گوشۂ گمنامی میں چلا گیا ہے اور پُرانے جغرافیہ نگاروں کو یہ تک معلوم نہ ہو سکا کہ حنین کس جگہ واقع تھا۔ وہ مختلف روایتیں بیان کرتے ہیں جن میں باہم تطابق کی کوئی صورت نہیں اور مجبوراً ان کے باہم تعارض کے باعث سب ہی کو ساقط اور نظر انداز کر دینا پڑتا ہے۔ حالیہ سالوں میں متعدد اہل علم سیاحوں نے اس جگہ کا پتہ لگانے کی کوشش کی اور ۱۳۷۵ھ کے اواخر میں حج کے زمانے میں آٹھ سال کے وقفے کے بعد میں نے اس کی دوسری مرتبہ جستجو کی اور اب کی دفعہ ساٹھ ستّر میل کی مسافت گدھے پر طے کرنے کے باوجود بھی گوہر مراد افسوس سے اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ ہاتھ نہ آیا۔

اصل میں ہم لوگ اب تک حنین کو مکے اور طائف کے بیچ میں ڈھونڈھتے رہے ہیں اور اب میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ یہ قصور ہمارا ہی ہے کہ مقصد کو نہیں پہنچتے۔ سب لوگ جانتے اور مانتے ہیں اور احادیث میں بھی صراحت سے ذکر ہے کہ سوائے تبوک کے موقع کے آنحضرت ہمیشہ فوجی مہموں میں توریہ[1] (دکھاوا) فرمایا کرتے تھے اور غیر سمت میں چل کر نامانوس اور سنسان راستوں سے گزر کر دشمن کو انجان جا لیتے تھے۔ اس لئے یہ قطعاً غیر یقینی ہے کہ آنحضرت مکّے سے طائف کو سیدھے راستے سے گئے ہوں۔

یوں بھی سیرت نبویہ کی کتابیں بتاتی ہیں کہ حنین کی لڑائی جبل اوطاس[2] کے درون اور پُرپیچ وادیوں کے قریب ہوئی۔ دوسری اہم تفصیل ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ حنین سے فارغ ہو کر جب آنحضرت طائف کا محاصرہ کرنے روانہ ہوئے تو نخلۂ یمانیہ اور قرن سے ہوتے ہوئے پہلے مقام لیّہ پر[3] پہنچے اور وہاں سے آگے بڑھ کر خاص طائف کے فصیل کی نیچے آ ٹھہرے۔

۱؎ ابن ہشام ص ۸۹۴ ۲؎ ابن ہشام ص ۸۴۰ و ما بعد ۳؎ ابن ہشام ص ۸۷۲

ینبع النخل
ینبع البحر
المدینة
ذوالحلیفة (بئر علی)
شمال
رابغ
عسفان
ذات عرق
وادی نخلة
جعرانة
قرن المنازل
جدة
حدیبیة (شمیسی)
تنعیم
مکہ
منی
عرفہ
مفیض عین زبیدة
اضاءة لبن
یلملم
حدود میقات الاحرام
حدود الحرم المکی واعلام الحرم
طریق المسافرین
حدود حرم مکہ

یہ دونوں تفصیلیں بڑی اہم ہیں۔ اولاً اوطاس کے متعلق یہ یاد رہے کہ اس نام کا پہاڑ یا وادی نہ تو مکے اور طائف کے بیچ میں کہیں واقع ہے اور نہ طائف کے آس پاس کسی جگہ۔ البتہ خدا بخشے سلطان عبدالحمید خاں ثانی کو انھوں نے حجاز ریلوے ڈالی تو انجینیروں سے ایک نقشہ بھی تیار کرایا۔ اس نقشے میں مقام اوطاس طائف کے شمال مشرق میں کوئی تیس چالیس میل پر اب تک بھی مشہور ہونا بتایا گیا ہے۔

وادی لیہ قدیم سے بڑی مشہور جگہ ہے اور میں نے اسے شہر طائف کے تقریباً مشرق جنوب مشرق میں کوئی چھے میل پر ایک زرخیز اور آباد گاؤں پایا۔

ایک اور اہم چیز جو قابل ذکر ہے وہ یہ ہے کہ ہوازن کا قبیلہ اب بھی موجود ہے اور یہ طائف سے وہاں کے لوگوں کے بیان کے مطابق کوئی تین دن کے فاصلے پر رہتا ہے۔ اور اگر میری یاد غلطی نہیں کرتی تو یہ اسی سمت میں رہتے ہیں جدھر مقام اوطاس نقشۂ حجاز ریلوے میں بتایا گیا ہے۔

اب رسولِ کریم کی فوجی نقل و حرکت بہت صاف سمجھ میں آجاتی ہے۔ اور وہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ ہوازن کو قلعبند شہر طائف میں پہنچنے سے روکا جائے۔ آپ مکے سے تقریباً شمال میں روانہ ہوتے ہیں اور نصف دائرہ سا راستہ بنا کر حنین پہنچتے ہیں اور تھوڑی سے دشواری کے بعد دشمن کو تتر بتر کر کے اور ان کے بیوی بچوں اور مال مویشی کو گرفتار کر کے حفاظت سے مکے کی سمت میں روانہ کر دیتے ہیں۔ پھر اسی طرح چکر دار راستے سے آگے بڑھتے ہوئے اوطاس سے ہو کر لیہ پہنچتے ہیں اور وہاں کی گڑھی منہدم کر دیتے ہیں (ابن ہشام ص ۸۷۲) اس کی فتح اہل طائف کے لئے بڑا معاشی دکھ پہنچاتی ہے۔ اور پھر آگے بڑھ کر طائف کو ایک ایسے رُخ سے آکر گھیر لیتے ہیں جدھر وسیع میدان ہیں ــــ اور پڑاؤ وغیرہ کی سہولت ہے ــــ مگر جدھر سے آپ کے آنے کا اہل طائف کو گمان نہیں ہو سکتا تھا۔

حنین غالباً جبل اوطاس کی ایک وادی کا نام تھا۔ میں غلط فہمیوں میں مبتلا رہ کر سفر حجاز کے مواقع پر ادھر نہ جا سکا اس لئے وہاں کی تفصیل دینی ممکن نہیں ہے۔ اصابہ (۲۰۶۶/۱) میں ایک شخص کے اس موقع پر افسر مال غنیمت مقرر ہونے کا ذکر ہے جو یقیناً ہر لڑائی میں ہوتا ہوگا۔ چنانچہ جنگ بدر کے سلسلے میں بھی ابن ہشام (ص ۴۵۷) نے اس کا ذکر کیا ہے۔

طائف تقریباً تین ہزار فٹ کی بلندی پر ایک سطح مرتفع ہے۔ مکے سے وہاں پہنچنے کے تین راستے ہیں: قریب ترین راستہ جو عرفات سے گزر کر جبل کرا کے دامن میں پہنچتا ہے اور پھر ایک دشوار پہاڑی چڑھائی کے بعد طائف پہنچا دیتا ہے، وہ صرف گدھوں کے ذریعے سے طے کیا جا سکتا ہے۔ یہ تقریباً پچاس ساٹھ میل ہوگا اور عصر کو سوار ہوں تو آدھی رات تک چل کر صبح تک وقفہ لیتے ہیں پھر ظہر تک طائف پہنچ جاتے ہیں۔ دوسرا راستہ جو جعرّانہ سے گزرتا ہے اونٹوں کے راستے سے طے ہوتا ہے۔ مجھے اس کی واقفیت نہیں۔ تیسرا راستہ اب وادی نعمان اور سیل سے گزر کر موٹر میں طے ہوتا اور ڈاک کی موٹر اس ستر پچہتر میل کی مسافت کو تین چار گھنٹوں میں طے کر لیتی ہے اور ہموار چوڑی

وادیوں میں شاید ہی کہیں دشوار گزار راستہ آتا ہو۔

خود طائف میں قدیم زمانے میں قبیلہ وار محلے تھے اور ایک دوسرے سے فرلانگ دو فرلانگ میل دو میل کے فاصلے پر۔ اور ہر محلے کے ساتھ زراعت اور باغبانی کے الگ انتظامات تھے۔ ایسے بہت سے محلے اب کھنڈر نظر آتے ہیں مگر بعض قدیم محلے اب بھی باقی ہیں۔ اور وادیٔ وَجّ سے سیراب ہوتے ہیں جو تقریباً نصف دائرہ بناتی ہوئی گذرتی اور بارش کے سوا اور دنوں میں خشک ہو جاتی ہے کیونکہ کسی بند کا آس پاس انتظام نہیں ہے۔ پانی کے چشمے البتہ متعدد ہیں اور انھیں سے کاریز (زمین دوز نہریں) نکال کر باغوں کو سیراب کیا جاتا ہے۔ قدیم زمانے میں بعض ایرانی انجینیروں کی مدد[1] سے آبادی کا ایک محفوظ اور مسطح حصہ دیکھ کر ایک فصیل کے ذریعہ سے قلعہ بند کر لیا گیا تھا اور اسی حصے کو "طائف" (گھیرا) کہتے تھے ورنہ پوری آبادی وَجّ کہلاتی تھی۔ مقامی روایات کے مطابق لات اور عُزّیٰ کے بُت خانے بھی اسی "گھیرے" کے اندر تھے۔ ایک کی جگہ آج کل سرکاری ہوٹل یا مہمان خانہ بنا ہوا ہے اور دوسرے کی جگہ ایک بڑا سا خانگی گھر۔ موجود فصیل ترکی دور کی یادگار ہے لیکن اس کا کم از کم کچھ حصہ ضرور قدیم "گھیرے" ہی کی جگہ ہے کیونکہ شہداءِ محاصرۂ طائف کی قبریں مسجد ابن عباس سے متصل فصیل کے عین نیچے ہی اب تک موجود ہیں۔ اور وہیں حضرت زید بن ثابت (کاتب وحی و میر منشئ دربار رسالت) بھی آرام فرمارہے ہیں۔ اور بقول ابن ہشام (ص ۸۷۲) اسی مسجد کے پاس اسلامی پڑاؤ تھا۔

کسی قلعے کا محاصرہ کرنا طائف میں اسلامی فوجوں کے لئے ایک نیا تجربہ تھا[5] اور ظاہر ہے کہ صحرانشین خانہ بدوش بدوی جمعیتوں کے مقابلے کے لئے جو اصول جنگ کام آتے ہیں وہ بہت کچھ بے کار تھے۔ اسی لئے آنحضرت نے منجنیق، دَبّابے اور عَرّادے اور اسی طرح کے قلعہ شکن آلات استعمال فرمائے[3] اور پھر معاشی دباؤ ڈالنے کے لئے بیرون قلعہ ان کے باغوں کو تباہ کر دینے کی دھمکی دی[4]۔ مگر چونکہ رحمتہ للعالمین اور نبی کا منشاء وہ نہیں ہو سکتا تھا جو عام فاتحوں کا کہ حریف کو ہر طرح نقصان پہنچائیں اس لئے اہل طائف کی التجا پر باغوں کی مزید قطع و برید روک دی گئی۔

دوسری تدبیر یہ اختیار فرمائی کہ ایک اعلان شائع فرمایا کہ دشمن کے ملک کا جو غلام بھاگ کر آ کر اسلام قبول کر لے وہ آزاد سمجھا جائے گا۔ یہ قاعدہ بھی ـــــ جو فقہ اسلامی میں داخل ہو چکا ہے ـــــ رنگ لائے بغیر نہ رہا[4]۔

ایک اور انتظام یہ فرمایا گیا کہ محاصرے کے لئے منجنیق اور دبّابوں وغیرہ کے بنانے اور چلانے کی تربیت حاصل کرنے کے لئے چند قابل کاریگروں کو جُرَش نامی مقام پر روانہ فرمایا[5]۔ یہ طائف کے جنوب میں کچھ فاصلے پر تھا ـــــ نہ کہ عرب کے شمال میں جیسا کہ شبلی مرحوم نے سیرت النبیؐ میں لکھا ہے[6]۔ عرب کے شمال میں جو اس کے ہم نام

---

[1] کتاب الاغانی ج ۱۲ ص ۴۸ تا ۴۹ [2] ابن ہشام ص ۸۷۲ ؛ طبری ص ۱۶۷۲ [3] ابن ہشام ص ۸۷۳ [4] ابن ہشام ص ۸۷۴

[5] ابن ہشام ص ۸۶۹ - ابن سعد ج ۲/۱ ص ۱۵۲ [6] سیرت النبیؐ (طبع دوم) جلد ۱ ص ۲۰ [7] خیبر کے معرکے کے بعد۔

شہر تھا اس سے سیرت النبیؐ کے کسی خاص اہم واقعے کو کوئی تعلق نہیں معلوم ہوتا — اس مقام (جرش) پر جو طائف ہی کی طرح ایک فصیل دار اور محفوظ شہر تھا[۱] یہودیوں کی خاصی آبادی تھی جیسا کہ خود طائف میں بھی تھی[۲]۔ اور غالباً ان آلات کی صنعت انھیں یہودیوں میں تھی جیسا کہ خیبر کے یہود میں بھی نظر آتی ہے۔ (مغازی الواقدی، ورق ۱۵۱ ا)

ایک اور انتظام واقدی (ورق ۲۰۸ ب) کے مطابق فصیل کے اطراف کانٹے بکھیر دیتا تھا: ونثر رسول اللہ الحسک سعس حسک من عیدان حول حصنهم)

اہل طائف کو غالباً اس طرح محصور ہونے کا اس سے پہلے بارہا تجربہ ہوا ہوگا۔ وہ اس کی مدافعت کی تدبیروں سے اچھی طرح واقف معلوم ہوتے تھے۔ منجنیق سے انھیں کوئی خاص نقصان نہ پہنچا اور دبابے میں بیٹھ کر فصیل شکنی کو انھوں نے دہکتی ہوئی فولادی میخوں سے دبابوں پر منڈھے ہوئے چمڑے کو جلا کر اور عام لوگوں کو تیراندازی کا نشانہ بنا کر قریب آنے سے کامیاب طور پر روکا۔[۳] شہر میں کھانے پانی کی کمی نہیں معلوم ہوتی تھی۔

غرض ان مختلف وجوہ سے آنحضرتؐ نے محاصرہ اُٹھا لیا اور واپس ہو گئے۔ جعرّانہ پہنچ کر ہوازن سے اوطاس میں لوٹے ہوئے مال غنیمت کی تقسیم کی۔[۴] اور کچھ دن بعد اہل ہوازن کے وفد کے آنے پر ان کے تمام بیوی بچوں کو واپس فرما دیا[۵] اور اس طرح طائف کو اس کے سب سے بڑے مددگار سے بچھڑا دیا اور یوں بھی طائف کے چاروں طرف اسلامی اثرات جو کافی تھے روز بروز بڑھتے ہی چلے گئے اور محاصرے میں کامیاب مدافعت کے باوجود سال پچھے ماہ کے اندر ہی انھوں نے اپنا وفد مدینہ بھیجا اور لات وعزّیٰ کو توڑ کر خدائے واحد کے پرستار بن گئے۔[۶]

یہودیوں کی لڑائیاں

پہلی لڑائی بنو قینقاع سے ہوئی۔ یہ لوگ مدینے میں اسلامی آبادی کے اندر ہی رہتے تھے اور سُنار کا کام کرتے تھے۔ اور آنحضرت کے حکم پر جان بچی لاکھوں پائے کہتے ہوئے شہر چھوڑ کر چلے گئے۔[۷] اور اس اخراج کی نگرانی کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بقول طبری (ص ۱۳۶۱) ایک خاص افسر مقرر فرمایا تھا نیز ان کے محلے کے

---

[۱] ابن ہشام ص ۹۵۴ — [۲] ابن ہشام ص ۸۷۳ — [۳] ابن ہشام ص ۸۷۶ و مابعد — [۴] ابن ہشام ص ۸۷۷ و مابعد

[۵] ابن ہشام ص ۹۱۴ و مابعد — [۶] ابن ہشام ص ۵۴۶ — [۷] فتوح البلدان للبلاذری ص ۲۶

محاصرے کے دوران میں اسلامی محلوں میں نائب بھی چھوڑا تھا۔ اس کے بعد بنو النضیر سے جنگ اُحد کے بعد جھگڑا ہوگیا۔ اور آنحضرت نے ان کے محلے کا محاصرہ کرلیا۔

جیسا کہ اوپر دیکھا گیا ہوگا، مدینے کے محلوں کی صورت یہ تھی کہ چند مکان ہوتے تھے جن میں حسب ضرورت و مقدرت گڑھیاں اور قصر ہوتے تھے اور یہ سب لاوے کے پتھر سے تعمیر ہوتے تھے ان سے قریب ہی باغ اور نخلستان تھے جو ان کی بسر برد کا کافی بڑا ذریعہ تھے۔

بنو النضیر کا محلہ حرۂ شرقیہ میں مسجد نبوی کے جنوب مشرق میں تھا۔ (نقشہ ک۱ تصاویر ۲؍۴) اور ان کے اور بنو قریظہ کے محلے میں عوالی کے باغ حد فاصل تھے۔ ان لوگوں کی تعداد بظاہر دو ڈھائی ہزار سے زیادہ نہ تھی۔ مورخ لکھتے ہیں[1] کہ ان کا محاصرہ کرتے ہوئے آنحضرتؐ نے اپنا پڑاؤ ایسی جگہ ڈالا کہ انھیں بنو قریظہ سے مدد کی توقع نہ رہی۔ چنانچہ وہاں مسجد شمس جسے مسجد الفضیخ بھی کہتے ہیں اب تک اس کی یادگار ہے۔ دوسری ایک تفصیل جس کا قرآن میں بھی اشارۃً ذکر ہے وہ یہ ہے کہ تیر اندازی وغیرہ جنگی ضرورتوں سے ان کے باغوں سے بعض کھجور کے درخت بھی کاٹنے پڑے تھے جس سے مدینے کی گڑھیوں کی حفاظت کے سامان کا کچھ اندازہ ہوتا ہے اس لڑائی کے اس سے زیادہ اور تفصیلیں معلوم نہیں سوائے اس کے کہ محاصرے سے تنگ آکر انھوں نے ہتیار ڈال دئے اور سامان ساتھ لے کر مدینہ چھوڑ کہیں اور جا بسنے پر آمادہ ہوگئے۔ چند شام گئے اور اکثر خیبر چلے گئے۔[2]
بنو قینقاع کی بستی تو آج کل محض میدان ہے البتہ بنو النضیر کی بستی میں کعب بن الاشرف کا قلعہ اب تک کھنڈر ہی سہی نظر آتا ہے۔ اور زمانۂ جاہلیت کی عربی تعمیر کا ایک اچھا نمونہ ہے۔ (تصاویر ۱؍۲) بنو النضیر کی بستی کے جنوب میں حرۂ شرقی میں وادی مُذینب کے قریب ایک چھوٹا سا ٹیلہ ہے۔ اس پر قصر کعب بن الاشرف کی دیواریں تقریباً گز سوا گز اونچی اب تک کھڑی ہوئی ہیں۔ قصر کے اندر ہی ایک کنواں ہے جو ظاہر ہے کہ محاصرے میں کام آتا ہوگا ٹیلے کے دامن میں اور قصر سے متصل ایک بڑے پختہ گچ اور پتھر سے بنے ہوئے حوض کے اب تک آثار باقی ہیں جس میں پانی کو ایک حصے سے دوسرے میں گزارنے کے لئے پکی مٹی کے نل بھی اب تک نظر آتے ہیں۔

بنو قریظہ کے محاصرے کے حربیاتی حالات ہمیں اس سے بھی کم معلوم ہیں سوائے اس کے کہ ان کے مال غنیمت سے شام اور نجد میں اسلحہ اور گھوڑے خریدے گئے (سیرۃ الشامی) خیبر کا تذکرہ بہت دلچسپ ہوسکتا لیکن باوجود کوشش کے مجھے خیبر جانے کا موقع نہ مل سکا اس لئے اس کا تذکرہ کسی آئندہ فرصت کے لئے اٹھار کھنا پڑتا ہے یہی حال مؤتہ اور تبوک کا ہے اور تمنا ہے کہ جلد ان پر بھی کچھ کام کیا جاسکے۔

---

[1] سیرۃ شامی بر موقع

[2] ابن ہشام ص ۶۵۳۔ طبری ۱۴۵۲ کے مطابق وہ گاتے بجاتے دھوم دھام سے نکلے۔

یہودیوں کی جنگ کے سلسلے میں امام محمد الشیبانی[1] اور غالباً انھیں کی بنیاد پر السرخسی[2] نے (المبسوط میں) لکھا ہے کہ بنو قریظہ کی جنگ میں آنحضرت کو بنو قینقاع نے مدد دی۔ یہ بیان عجیب سا ہے کیونکہ بنو قینقاع بدر کی لڑائی کے بعد ہی مدینے سے نکال دئے گئے تھے[3] اگر یہ بیان جو الشیبانی وغیرہ نے لکھا ہے، صحیح ہے تو اس کے معنے غالباً یہی ہوں گے کہ بنو قینقاع کو جو سزا دی گئی وہ اس بڑے قبیلے کے صرف چند خاندانوں کی حد تک محدود ہوگی کیونکہ جس قصور پر وہ فیصلہ کیا گیا تھا اس کے ذمہ دار بھی چند ہی گھرانے تھے[4]

سیرۃ الشامی میں جنگ خیبر کے سلسلے میں لکھا ہے کہ وہاں ایک قلعے کے زمین دوز راستے کا پتہ آنحضرت کو ایک یہودی ہی نے دیا۔[5] واقدی نے لکھا ہے کہ خیبر کے محصور قلعوں سے یہودی مسلمانوں پر منجنیق سے پتھر پھینکا کرتے تھے[6] غالباً اسی مہم کی مال غنیمت سے دوسرے سال طائف کے محاصرے میں آنحضرت نے منجنیق اور دبابے وغیرہ استعمال کئے اور نئے بنانے کی طرف متوجہ ہوئے۔ جیسا کہ اوپر بیان ہوا۔

یہودیوں کے سلسلے میں ایک تیسرا واقعہ جنگی ضروریات کے لئے سرمائے کا ہے۔ اس سلسلے میں ایک دلچسپ واقعہ سیرۃ الشامی میں غزوۂ سویق کے ذکر میں ضمناً بیان ہوا ہے:۔

سلام بن مشکم وکان سید بنی النضیر فی زمانه وصاحب کنزهم... یعنی بالکنز هنا المال الذی کانوا یجمعونه لنوائبهم وما یعرض لهم۔	سلام بن مشکم اپنے زمانے میں بنو النضیر کا سردار اور ان کا محافظ خزانہ تھا... خزانے سے مراد یہاں وہ مال ہے جسے وہ مصائب اور اتفاقی ضرورتوں کے لئے جمع کرتے تھے۔

اس قبیلہ واری سرمائے کا ذکر خیبر کے سلسلے میں بھی مکرر آتا ہے اور طبری نے ابن اسحاق کے حوالے سے لکھا ہے کہ کنانہ بن الربیع بن ابی الحقیق کے پاس مدینے کے جلا وطن نضیریوں کا خزانہ تھا۔ بعض اور روایتوں میں ہے جب اس سے آنحضرت نے مال کا پتہ پوچھا تو اس نے کہا کہ لڑائیوں میں خرچ ہوگیا۔ مگر بعد میں وہ مال ایک کھنڈر میں گڑا ہوا مل گیا۔ اس کی چغلی بھی ایک یہودی ہی نے کھائی تھی (ابن ہشام ص ۷۶۳)

یہ ایک مختصر تذکرہ ہے جو عہد نبوی کے چند اہم میدان ہائے جنگ کے متعلق کچھ دیکھی اور کچھ پڑھی ہوئی چیزوں کی مدد سے مرتب کیا گیا۔ اس کی کوتاہیوں کے اقرار کے ساتھ یہ اعتراف بھی میرا فریضہ ہے کہ ۱۹۳۲ء / ۱۳۵۱ھ میں سفر حجاز کے وقت ان میدانوں کو دیکھنے اور موقع ملے تو ان کے نقشے اتارنے کا مشورہ مجھے اپنے محترم اسکاوٹ ماسٹر مولوی علی موسیٰ رضا مہاجر صاحب سے ملا تھا جن سے میں نے اپنی کشافانہ زندگی میں اور چیزوں کے ساتھ مساحت

---

[1] کتاب الاصل باب السیر مخطوطات استانبول [2] المبسوط ج ۱۰ ص ۲۳ [3] ابن ہشام ص ۵۴۶ [4] ابن ہشام ص ۵۴۵
[5] حصن الزبیر کے حالات سیرۃ شامی میں [6] مغازی واقدی ورق ۱۵۱ [7] غزوۂ سویق کے حالات شامی میں [8] طبری ص ۱۵۸۲ [9] ابن ہشام ص ۷۶۳

اور نقشہ کشی کے مبادی بھی سیکھتے تھے۔ اُس سفر میں میں صرف اُحد کا نقشہ تیار کر سکا تھا اور ۱۹۳۹ء/۱۳۵۷ھ کے سفر میں احد کا کا
نقشہ اتارنے کے ساتھ بدر و طائف وغیرہ بھی جانے اور نقشے بنانے کا موقع ملا۔ جامعہ پاریس نے ان پر سوربون میں ا
لکچر کی دعوت دی تھی جو وہاں کے ادارۂ علوم اسلامیہ کے رسالے میں فوراً چھپ بھی گیا ہے مقالۂ مذکور میں جلد
ہی اتنا کچھ مزید اضافہ کرنا پڑا کہ وہ اصل سے دگنا تگنا پھیل گیا اور اس اردو مقالے کی صورت میں مرتب ہوا
اگرچہ فرانسیسی لکچر کا ترجمہ نہیں ہے لیکن اس لکچر کی کوئی اہم چیز یہاں چھوڑی نہیں گئی ہے سوائے غدیر خم ک
دریافت کے ذکر کے جو چھے سو سال سے لاپتہ تھا مگر جس کا تذکرہ یہاں غیر متعلق ہوگا، یا جبل سلع کے کتبا
کے جن پر جامعہ آکسفورڈ نے ایک لکچر کرایا اور جو اب رسالہ اسلامک کلچر (اکتوبر ۳۹ء) میں چھپ گیا ہے۔

محمد حمید اللہ

کتابیات

(۱) سیرۃ ابن ہشام
(۲) سیرۃ الشامی (مخطوطہ قرویین، فاس، مراکش)
(۳) تاریخ الطبری۔
(۴) تفسیر الطبری
(۵) البدایہ والنہایہ لابن کثیر
(۶) طبقات ابن سعد
(۷) وفاء الوفاء للسمہودی۔
(۸) مغازی الواقدی (مخطوطہ برٹش میوزیم)
(۹) مرآۃ الحرمین لاحمد رفعت پاشا (۲ جلد)
(۱۰) نظام الحکومۃ النبویہ المسمی التراتیب الاداریہ للکتانی (۲ جلد)
(۱۱) الاستیعاب لابن عبدالبر
(۱۲) الاصابہ لابن حجر
(۱۳) التنبیہ والاشراف للمسعودی
(۱۴) الوثائق السیاسیہ لعہد النبی والخلافۃ الراشدہ لمحمد حمید اللہ (قاہرہ ۱۹۴۰ء)
(۱۵) قرآنی تصور مملکت (قرانک ورلڈ اپریل ۱۹۳۶ء) (انگریزی)
(۱۶) شہری مملکت مکہ (اسلامک کلچر جولائی ۱۹۳۸ء) (انگریزی)
(۱۷) دنیا کا سب سے پہلا تحریری دستور (مجلہ طیلسانین جولائی ۱۹۳۹ء)

(۱۸) سرور کائنات کی حکومت (مجلّۂ جامعہ مارچ، اپریل ۱۹۳۱ء)
(۱۹) عربوں اور بیزنطینیوں کے تعلقات (مجموعہ تحقیقات علمیہ جامعہ عثمانیہ سالنامۂ سوم)
(۲۰) عرب اور حبشہ (در کتاب حبش اور اطالیہ، نشریۂ ترقی اردو)
(۲۱) مسلمانوں کے سفارتی تعلقات ایران سے عہد نبوی میں (پروسیڈنگس آف ادارۂ معارف اسلامیہ لاہور ۲) {انگریزی}
(۲۲) عدل گستری ابتدائے اسلام میں (مجلۂ عثمانیہ مارچ ۱۹۳۸ء)
(۲۲) تجارت کا تعلق آنحضرت اور خلفائے راشدین سے (تجلی، حیدرآباد، اردی بہشت ۱۳۳۶ف)
(۲۳) عہد نبوی کا نظام تعلیم (اسلامک کلچر جنوری ۱۹۳۹ء) (انگریزی)
(۲۴) عہد نبوی کی سیاست خارجہ کے بعض اصول (تالیف قلبی) (مجلۂ نظامیہ ربیع الاول ۱۳۵۷ھ)
(۲۵) عہد نبوی کی سیاست کاری کے اصول (سیاست جنوری ۱۹۴۰ء)
(۲۶) ہجرت [یا نوآبادکاری] (سیاست جولائی ۱۹۴۰ء)
(۲۷) آنحضرتؐ کا خط قیصر روم کے نام (معارف جون ۱۹۳۵ء)
(۲۸) مکتوبات نبوی کے دو اصل (مجلۂ عثمانیہ جون ۱۹۳۶ء)
(۲۹) فتح مکہ نمبر (رہبر دکن ۲۲ رمضان ۱۳۵۸ھ)
(۳۰) مدینۂ منورہ کے چند عربی کتبے (اسلامک کلچر اکتوبر ۱۹۳۹ء) (انگریزی)
(۳۱) رسول کریم کی سیرت کا کیوں مطالعہ کیا جائے (تالیف محمد حمید اللہ)
(۳۲) اسلامی سیاست خارجہ عہد نبوی اور خلافت راشدہ میں از محمد حمید اللہ (مطبوعۂ پاریس ۱۹۳۵ء) {فرنچ}
(۳۴) عہد نبوی کے میدان جنگ R. E. I. پاریس جنوری ۱۹۳۹ء) (فرنچ)
(۳۵) غیر جانبداری اسلامی قانون بین الممالک میں ZDMG برلن جنوری ۱۹۳۵ء) (جرمن)
(۳۶) آثار المدینة المنورة لعبد القدس الهاشمی المدنی

اقبال اور حدیث جبر و قدر

از

میر ولی الدین

ایم اے، پی ایچ ڈی (لندن) بیرسٹرایٹ لا استاذ فلسفہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن

مرید ۔ اے شریک مستیٔ خاصان بدر میں نہیں سمجھا حدیثِ جبر و قدر

پیر ۔ "بال بازاں را سوے سلطاں برد بال زاغاں را بہ گورستاں برد"

(بالِ جبریل)

'میں نہیں سمجھا حدیث جبر و قدر! آغازِ فکرِ انسانی سے یہی آواز بار بار مضطربانہ انداز سے بلند ہوتی رہی ہے لیکن انسان نے اس مسئلہ کو محض نظری کہہ کر اس پر غور و فکر کرنا کبھی ترک نہیں کیا۔ کیوں؟ آخر اس مسئلہ میں جاذبیت کیا ہے؟ اس کے ذکر کے ساتھ ہی عامی سے عامی شخص تک کے کان کیوں کھڑے ہو جاتے ہیں؟ واقعہ یہ ہے کہ یہ مسئلہ محض نظری نہیں، ہمارا سارا نظام دینیات اسایات، تعلیمات معاشیات، اور جرمیات اسی مسئلہ کے فہم و اِفہام پر مبنی نظر آتا ہے۔

اگر ہم مجبور ہیں تو دینیات ہمیں سمجھائے کہ دوزخ ہمارا ٹھکانہ کیوں ہو، جرمیات ہمیں بتائے کہ چور کو سزا دینے کے کیا معنی اور تعلیمات تزکیہ اخلاق و تصفیہ قلب پر اتنی مُصر کیوں ہے؟ اگر ہم آزاد ہیں تو پھر بقولِ اسپنوزا کیوں ہمیں اپنی زبان تک پر بھی اختیار نظر نہیں آتا؟ جذبات کا شر و شور مرد افگن کیوں ہوتا ہے اور عقل شہوات کی غلام کیوں رہی ہے؟ آتش انتقام سے مشتعل ہو کر بچہ بھی تو یہی سمجھتا ہے کہ وہ اپنے دشمن پر آزادانہ حملہ کر رہا ہے، مدہوش شرابی کو یقین ہوتا ہے کہ جو کچھ اس کی زبان سے نکل رہا ہے اس میں اس کے اختیار اور مرضی کو پورا دخل ہے گو بعد میں پچھتاتا ہے کہ یہ بکواس اس کی زبان سے نہ نکلی ہوتی! "انسان اپنے کو آزاد و مختار اس لئے سمجھتا ہے کہ اس کو اپنے افعال کا تو شعور ہوتا ہے لیکن وہ ان اسباب و علل سے جاہل ہے جو ان افعال کا تعین کرتی ہیں"۔

(اسپنوزا)

ہماری رائے میں اس قدیم مسئلہ کے حل میں عقلِ نظری ناکامیاب ہی ہو! یہ مسئلہ اب بھی لاینحل ہے یہ مسئلہ نہیں گتھی ہے! عقل کے اس عجز ہی کو دیکھ کر پیغمبرِ اسلام (فداہ ابی و امی) نے فرمایا کہ "اذا ذکر القدر فامسکوا"[1] (جب تقدیر کا ذکر کیا جائے تو تم خاموش ہو جاؤ) یہ حکم ہوا عوام کو، عالِم اور خبیر سے فرمایا گیا" لا تکلموا فی القدر فانہ سر اللّٰہ فلا تفشوا اللّٰہ سرہ[2] (تقدیر میں گفتگو نہ کیا کرو کیونکہ وہ خدا کا ایک راز ہے پھر اللہ کے راز کا افشا نہ کرو) اس دوسرے قول سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام نے ان لوگوں پر اس اہم مسئلہ کو فاش کر دیا ہے جو اس کے سمجھنے کی اہلیت رکھتے ہیں، جن کی شان میں فرمایا گیا ہے" لمن کان لہ قلب[3] او القی السمع وھو شھید"۔ اسلام کے سب سے بڑے صوفی فلسفی شیخ اکبر محی الدین ابن عربی کی بھی یہی رائے ہے چنانچہ وہ فرماتے ہیں:۔

"فسر القدر من اجل العلوم وما یفھمہ اللّٰہ تعالیٰ الا لمن اختصہ اللّٰہ بالمعرفۃ التامۃ"[4] سرِ قدر بزرگ ترین علوم سے ہے اور اس سے حق تم سوائے اس کے کسی کو آگاہ نہیں کرتے جس کو انھوں نے معرفت تامہ کے ساتھ مختص کر لیا ہے"!

ہم اقبال سے "سرِ قدر" دریافت کر رہے ہیں۔ اگر اقبال محض شاعر ہوتے تو ہم بھلا اس فلسفیانہ گتھی کو ان سے سلجھانے کیوں جاتے؟ گو اس میں شک نہیں کہ بفحوائے "ان من الشعر لحکمۃ"[5] علوم و حقائق شعراء کے ہاں بھی مل سکتے ہیں لیکن مسئلہ کی عظمت ہمیں ایک شاعر کے ہاں جانے سے روکتی۔ اگر اقبال محض فلسفی ہوتے تو بھی ہم اس مسئلہ پر ان سے بحث کرنے تیار نہیں ہوتے کیونکہ ہم نے دیکھ لیا ہے کہ یہاں فلسفہ کی کھیتی پکتی نظر نہیں آتی۔ اقبال علاوہ سحر بیان شاعر اور جید فلسفی ہونے کے ہمیں عارف بھی نظر آتے ہیں جن پر "صحبت پیرِ روم" نے بہت سے معارف کا دروازہ کھول دیا تھا مثلاً:۔

صحبتِ پیرِ روم سے مجھ پہ ہوا یہ راز فاش — لاکھ حکیم سربجیب ایک حکیم سربکف
خیرہ نہ کر سکا مجھے جلوۂ دانشِ فرنگ — سرمہ ہے میری آنکھ کا خاکِ مدینہ و نجف (بالِ جبریل)

فلسفہ کی لم و لانسلّم سے اکتا کر انھوں نے اپنے مولیٰ سے معروضہ کیا تھا:۔

خرد کی گتھیاں سلجھا چکا ہوں — میرے مولیٰ مجھے صاحب جنوں کر (〃)

وہ جان گئے تھے کہ:۔

عقل گو آستاں سے دور نہیں — اس کی تقدیر میں حضور نہیں
دلِ بینا بھی کر خدا سے طلب — آنکھ کا نور دل کا نور نہیں
علم میں بھی سرور ہے لیکن — یہ وہ جنت ہے جس میں حور نہیں (〃)

جب انھیں حضور کی لذت حاصل ہونے لگی تو وہ اب عقلِ نظری کے استدلال سے متنفر نظر آتے ہیں اور "دانش برہانی" میں "حیرت کی فراوانی" کے سوا انھیں کچھ نہیں نظر آتا۔

---

[1] طبرانی عن ابن مسعود کذا فی الجامع الصغیر للسیوطی ۱۲ [2] ابونعیم فی الحلیۃ کذا فی کنز العمال ۱۲ [3] جس کے پاس دل ہے، اور کان لگایا اس حال میں کہ وہ خود حاضر ہے ۱۲ [4] فصوص الحکم، شاہ مبارک علی ایڈیشن ص۱۳۷ فص عزیزیہ [5] بعض اشعار حکمت ہیں (حدیث بخاری)

مجھے وہ درس فرنگ آج یاد آتے ہیں — کہاں حضور کی لذت کہاں حجاب دلیل (بال جبریل)

عارف کا مرتبہ و مقام اقبال اچھی طرح جانتے ہیں ؎

علم کی حد سے پرے بندۂ مومن کے لئے

لذتِ شوق بھی ہے نعمتِ دیدار بھی ہے! (رر)

اقبال کی اس حیثیت سے واقف ہو کر ہم دریافت کر رہے ہیں کہ حدیث جبر و قدر کے متعلق ان کے "پیر" نے انھیں کیا سکھایا ہے؟ جواب میں اقبال کا پوزیشن اس شعر سے صاف ظاہر ہو رہا ہے ؎

"چنیں فرمودۂ سلطانِ بدر است

کہ ایمان درمیانِ جبر و قدر است" (زبور عجم)

ظاہر ہے کہ اقبال مسئلہ کا صحیح حل وہی سمجھ رہے جو ان کے آقائے نامدار صلعم نے بیان کیا ہے کہ انسان مجبور بھی ہے اور مختار بھی اور علم صحیح کی یافت اگر ہو سکتی ہے تو اسی طرح کہ راستہ جبر و قدر کے درمیان اختیار کیا جائے۔

پہلے جبر کے پہلو پر نظر کیجئے۔ جن کسی کا خدا پر یقین ہے وہ خدا کو خالق افعال مانے بغیر رہ نہیں سکتا۔ جس طرح خدا ہمارے جسموں اور روحوں کا خالق ہے وہ ہمارے افعال کا بھی خالق ہے۔ یہ عقیدہ قرآن میں بصراحت النص پایا جاتا ہے توجیہ تاویل کا امکان تک نہیں۔ ان شواہد پر غور کیجئے۔

اِنَّا کُلَّ شَیْءٍ خَلَقْنٰہُ بِقَدَرٍ ——— وَکُلُّ شَیْءٍ فَعَلُوْہُ فِی الزُّبُرِ (۵۴ : ۴۹ آیت ۵۲)

"ہم نے ہر چیز بنائی ہے پہلے ٹھیرا کر — اور جو چیز انھوں کی لکھی ہے ورقوں میں"

"شی" میں افعال بھی داخل ہیں اور چونکہ حق تعالیٰ "خالق کل شی" ہیں لہذا یہ ضروری طور پر لازم آتا ہے کہ وہ افعال کے بھی خالق ہیں۔ اگر افعال مخلوق نہ ہوتے (باوجود اس امر کہ ان پر "شی" کا اطلاق ہوتا ہے) تو پھر حق تعالیٰ بعض اشیاء کے خالق ہوتے اور بعض کے نہ ہوتے اور ان کا یہ قول کہ وہ "ہر شئے کے خالق" ہیں کذب محض ہوتا تعالی اللہ من ذالک علوا کبیرا

اس حجت قیاسی کی بھی ہمیں کوئی ضرورت نظر نہیں آتی قرآن میں یہ صاف طور پر کہا گیا ہے کہ

وَاللّٰہُ خَلَقَکُمْ وَمَا تَعْمَلُوْنَ

اور اللہ نے پیدا کیا تمھیں اور جو تم کرتے ہو (سورہ والصّٰفّٰت آیت ۹۶)

اس سے صاف ظاہر ہے کہ حق تعالیٰ ہمارے افعال کے خالق ہیں۔ یہ تھا ایجابی طرز بیان، ذرا سلبی طریق گفتگو پر بھی غور کر لیجئے۔

یہاں حق تعالیٰ اس امر سے انکار کر رہے ہیں کہ ان کے سوا کوئی خالق اور بھی ہے :-

"ام جعلوا للہ شرکآء خلقوا کخلقہ فتشابہ الخلق علیھم قل اللہ خالق کل شیء وھو الواحد القہار"

کیا ٹھیرائے ہیں انھوں نے اللہ کے لئے شریک کہ انھوں نے کچھ پیدا کیا جیسے پیدا کیا اللہ نے پھر مشتبہ ہو گئی پیدائش ان کی نظر میں کہہ اللہ ہے پیدا کرنے والا ہر چیز کا اور وہی ہے اکیلا زبردست۔ (سورہ الرعد آیت ۱۶)

اب فرض کیجئے کہ خدا نے انسان کو پیدا کیا ہے اور انسان اپنے افعال پیدا کرتا ہے۔ یہ تو یقینی بات ہے کہ افعال افراد انسانیہ سے بہت زیادہ ہوتے ہیں کیونکہ ہر شخص ان گنت افعال کو پیدا کرتا ہے۔ اس سے یہ نتیجہ لازمی طور پر نکلتا ہے کہ انسان کی پیدا کردہ چیزیں، جو خود خدا کی مخلوق ہے، اس خدا کی پیدا کردہ چیزوں سے زیادہ ہوں گی جو انسان کا خالق ہے۔ اس کے معنی یہ ہوے کہ انسان قدرتِ تخلیق میں خدا سے بھی زیادہ کامل ہے اور اس کی مخلوق خدا کی مخلوق سے شمار میں کہیں زیادہ ہے! یہ عقیدہ تو صریحاً احمقانہ ہے۔ مخلوق خالق سے زیادہ قوی کیسے ہوسکتا ہے۔ لہذا نتیجہ کے طور پر یہی ماننا پڑے گا کہ حق تعالیٰ نہ صرف انسان کے خالق ہیں بلکہ اس کے افعال کے بھی۔" واللہ خلقکم وما تعملون"۔ صرف حق تعالیٰ ہی خالق ہیں، فاعل ہیں، متصرف ہیں لا فاعل فی الوجود الا اللہ۔ ساری کائنات ان کی مخلوق، انسان اور اس کے افعال سب کائنات میں شامل ہیں، لہذا یہ سب ان کے مخلوق ہیں۔

جاوید نامہ میں اقبال اسی توحید فی الآثار و توحید فی الافعال کو بیان کر رہے ہیں:

می شناسی طبع ادراک از کجاست؟	جورے اندر بنگہ خاک از کجاست؟
طاقتِ فکرِ حکیماں از کجاست؟	قوتِ ذکرِ کلیماں از کجاست؟
ایں دل وایں واردات از کیست؟	ایں فنون و معجزات از کیست؟
گرمیٔ گفتار داری؟ از تو نیست!	شعلۂ کردار داری؟ از تو نیست!
ایں ہمہ فیض از بہارِ فطرت است	فطرت از پروردگارِ فطرت است!

اوپر جو کچھ بیان کیا گیا اس کی تائید کلام نبوی سے بھی ہوتی ہے۔ حضرت عمرؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا "یا رسول اللہ ارایت ما نعمل فیہ علی امر قد فرغ منہ او امر نبتدأ؟ فقال علی امر قد فرغ منہ، فقال عمر أفلا نتکل و ندع العمل، فقال اعملوا فکل میسر لما خلق لہ" یعنی جس کام میں ہم لگے ہوے ہیں اس کے متعلق آپ کیا فرماتے ہیں؟ کیا یہ کام پہلے ہی سے ختم ہو چکا ہے یا ہمیں نے اس کو شروع کیا ہے؟ فرمایا پہلے ہی سے ختم ہو چکا ہے۔ عمرؓ نے کہا تو کیا پھر ہمیں توکل نہیں کرنا چاہئے اور ترک عمل نہ کرنا چاہئے" یعنی جب پہلے ہی سے ساری چیزیں مقرر و معین ہو چکی ہیں تو پھر ہماری کوشش و عمل سے کیا فائدہ؟ رسول اللہ نے فرمایا کام کئے جاؤ، ہر شخص کے لئے وہ کام آسان کر دیا گیا ہے جس کے لئے وہ پیدا کیا گیا ہے"۔ عمرؓ نے کہا" الآن طاب العمل" اور اپنے کام پر لگ گئے۔ تقدیر کے بہانہ سے عمل ترک نہیں کیا جا سکتا۔ ادائی فرائض میں اب ایک لذت پیدا ہو جاتی ہے۔ کوشش کو تشویش و فکر سے نجات مل جاتی ہے۔ ہم جان لیتے ہیں کہ "ہر شخص کے لئے وہ کام آسان کر دیا گیا جس کے لئے وہ پیدا ہوا ہے"

ایک اور دفعہ رسول اللہ سے پوچھا گیا کہ ارایت رقی نسترقیھا و دواء نتداوی بہ ھل یرد من قدر اللہ

لہ صحاح ۱۲

تعالیٰ فقال انہ من قدر اللہ یعنی "جو فعل کہ ہم کرتے ہیں اور جو دوائیں کہ استعمال میں لاتے ہیں کیا یہ حق تعالیٰ کی تقدیر کو پھیر سکتی ہیں؟ فرمایا کہ یہ بھی حق تعالیٰ ہی کی تقدیر سے ہوتا ہے۔ آپ کا یہ ارشاد تو اور بھی زیادہ صاف اور واضح ہے کہ "لا یومن احدکم حتیٰ یومن بالقدر خیرہ وشرہ من اللہ تعالیٰ" یعنی کوئی شخص مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ اس امر پر ایمان نہ لائے کہ خیر و شر کی تخلیق من اللہ ہے۔[1]

تعلیم اسلام میں جبر کا یہ پہلو صاف ہے اور اس سے صرف یہی چیز سمجھ میں آتی ہے کہ ہر شئے کی تخلیق من اللہ ہے۔ اور اقبال یہ کہہ کر این ہمہ فیض از بہار فطرت است۔ فطرت از پروردگار فطرت است" "ہمہ از وست" کے نظریہ کے قائل اور حامی نظر آرہے ہیں۔ لیکن جبر کی یہ ساری تعلیم قدر یا اختیار یا آزادیٔ ارادہ کے منافی نہیں! بظاہر ہماری یہ بات عجیب و غریب نظر آتی ہے، دو متضاد چیزوں میں تطبیق واقعی عجیب بات ہے۔ لیکن قرآن کا یہی اعجاز ہے اور اقبال اس تضاد کو بڑی شدت کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔

جو کچھ میں نے کہا ہے اس کی تائید میں میرے یہاں دلائل موجود ہیں۔ پہلے مجھے آزادیٔ ارادہ اور ذمہ داری کے نظریہ کی تشکیل کرنے دیجئے جو قرآن کریم میں پیش کیا گیا ہے "خلق من اللہ" کے دعویٰ کے ساتھ ساتھ قرآن میں انسان کو اپنے افعال کا ذمہ دار قرار دیا گیا ہے۔ اس ظاہرا تضاد کی وجہ سے آپ کو جو ضیق محسوس ہو رہا ہے اس پر ذرا سا صبر کر لیجئے ممکن ہے کہ اس مقالہ کے ختم پر آپ کو تسکین ہو جائے۔

انسان اپنے افعال کا ذمہ دار ہے۔ وہ اپنے افعال کا کاسب ہے، اسی لئے وہ جزا و سزا کا مستحق ہے، اسی لئے اوامر و نواہی کا نزول ہوا ہے اور اسی وجہ سے حق تعالیٰ نے اس کے ساتھ وعدے کئے ہیں اور وعید بھی کی ہے۔ چنانچہ قرآن میں واضح طور پر بتلا دیا گیا ہے کہ

"لا یکلف اللہ نفساً الا وسعھا لھا ما کسبت وعلیھا ما اکتسبت"

"اللہ تکلیف نہیں دیتا کسی کو مگر جس قدر اس کی گنجایش ہے، جس نے جو کمایا اس کو وہی ملتا ہے اور اسی پر پڑتا ہے جو اس نے کیا" (البقرہ آیت ۲۸۶)

یہاں افعال کی ذمہ داری کا بار انسان پر رکھا گیا ہے۔ وہ اپنے خیر کا کاسب ہے اور شر کو بھگتتا ہے۔ ظاہر ہے کہ فعل اخلاقی کا صحیح معنی میں اس وقت تک ارتکاب نہیں ہو سکتا جب تک کہ فاعل اپنے فعل کا ذمہ دار نہ ہو۔ اگر ایک شخص سو رہا ہے یا اسکو داروے بیہوشی دی گئی ہے، یا وہ پاگل ہے، یا طفل شیر خوار ہے تو وہ اخلاقیاتی معنی کے لحاظ سے فاعل قرار ہی نہیں پا سکتا کیونکہ اس کا فعل اختیار اور عقلی ارادہ پر مبنی نہیں۔ اور جب قرآن میں یہ کہا جاتا ہے کہ

"ان احسنتم احسنتم لانفسکم وان اساتم فلھا" (اگر تم نے بھلائی کی تو اپنے لئے کی اور برائی کی تو اس کا وبال بھی تم ہی پر ہے)۔ تو

---

[1] رواہ احمد والترمذی وابن ماجہ کذا فی المشکوٰۃ ۱۲ [2] صحاح ۱۲

انسان کو اس کے اختیار اور عقلی ارادہ کی بنا پر ذمہ دار قرار دیا جا رہا ہے۔ اسی مفہوم کو امام حسنؓ ظاہر فرما رہے ہیں "ان اللہ تعالیٰ لا یطاع باکراہ و لا یعصی بغلبۃ و لم یھمل العباد من المملکۃ" "اللہ تعالیٰ کی اطاعت بجبر و اکراہ نہیں ہو رہی ہے اور نہ اس کی نافرمانی کسی قوت قاہرہ کی وجہ سے عمل میں آ رہی ہے اور اس نے اپنے بندوں کو اپنے ملک میں بیکار نہیں چھوڑ دیا ہے" "لا اکراہ فی الدین" قرآن کا دستور ہے۔ فعل کے ارتکاب میں جبر ہو تو وہ اخلاقی فعل کیسے کہلایا جا سکتا ہے؟ سہل بن عبد اللہؒ کا ارشاد ہے کہ "ان اللہ لا یقوی الابرار بالجبر و انما قوّٰھم بالیقین" یعنی حق تعالیٰ نے نیکوں کو اطاعت کی قوت جبراً عطا نہیں کی ہے بلکہ انھیں یقین کے ذریعہ قوت دی ہے"۔ اس خصوص میں اکابر صوفیہ میں سے کسی کا یہ قول بمنزلہ قانون قرار دیا جا سکتا ہے:۔

"من لم یومن بالقدر فقد کفر و من احال المعاصی علی اللہ فقد فجر"

"جو قدر پر ایمان نہ لائے وہ کافر ہے اور جو معاصی کو خدا کے حوالہ کرتا ہے وہ فاجر ہے"

حق تعالیٰ کی نافرمانی کے لئے آزادیٔ ارادہ کی ضرورت ہے، ان کی نافرمانی ممکن ہے، اور جب بھی معصیت کا ارتکاب ہوتا ہے نافرمانی وقوع پذیر ہو رہی ہے لہذا انسان کو انتخاب اور آزادی حاصل ہے جس کو وہ گناہوں کے ارتکاب کے وقت استعمال کرتا ہے۔

انسان کے اس اختیار کو، حریت کو، جبر سے آزادی کو اقبال بڑے جوش سے پیش کرتے ہیں ؎

بیا اے خود مزن زنجیر تقدیر ۔۔۔ تہ این گنبد گردوں رہے ہست
اگر باور نداری خیز در یاب ۔۔۔ کہ چوں پا واکنی جولانگہے ہست ۔۔۔ (پیام مشرق)

جاوید نامہ میں ایک نئے انداز سے کہتے ہیں ؎

از ضیاں نقد خودی درباختند ۔۔۔ نکتہ تقدیر را نشناختند
رمز باریکش بحرفے مضمر است ۔۔۔ تو اگر دیگر شوی او دیگر است
خاک شو، نذر ہوا سازد ترا ۔۔۔ سنگ شو، بر شیشہ اندازد ترا
شبنمی؟ افتندگی تقدیر تست ۔۔۔ قلزمی؟ پایندگی تقدیر تست

اب ہمارے سامنے اثبات (Thesis) اور نفی (Anti-thesis) دونوں صاف طور پر پیش کردیے گئے ہیں

انسان اپنے افعال میں مجبور ہے حق تعالیٰ انسان کے خالق ہیں اور اس کے افعال کے بھی خالق ہیں۔ "خلقکم و ما تعملون"۔ "بیان"۔
انسان اپنے اختیار و انتخاب میں آزاد ہے، اسی لئے اپنے افعال کا ذمہ دار ہے، اور اس لئے سزا و جزا کا مستحق ہے۔ "من عمل صالحا لنفسہٖ" نیز "افرأیتم ما تحرثون"۔۔ نقیض بیان،

اس تضاد کو رفع کرنے کے لئے ہم آپ کو کچھ دیر کے واسطے تجرید فکری کی دعوت دیتے ہیں۔ تفکر بقول ھیگل کے کم زور دماغ

کے لئے اسی قدر مشکل ہے جس قدر کہ کم زور پشت کے واسطے بارگراں کا اٹھانا۔ دونوں مجبور ہیں اور اس کے معذور۔ نہ ایک سے فکر ہو سکتی اور نہ دوسرے سے بوجھ اُٹھ سکتا ہے۔ یہاں ہمارا خطاب اہل فکر سے ہے۔ ان چند قضایا پر غور کیجئے: ہمارا تو یقین ہے کہ حق تعالیٰ موجود ہیں اور وہ عالم مطلق بھی ہیں۔ اب عالم کے لئے "علم" اور "معلوم" کی ضرورت ہے۔ حق تعالیٰ کے ان تین اعتبارات میں ابتدا ہی سے صاف طور پر تمیز کی جا سکتی ہے۔ وہ اپنے ہی افکار و تصورات کے عالم ہیں، یہی ان کے علم کے معلوم ہیں، معروض ہیں۔ علم بغیر معلومات کے ویسے ہی محال ہے جیسے قدرت بغیر مقدورات کے، سمع بے مسموعات اور بصر بے مبصرات کے۔ حق تعالیٰ چونکہ ازل سے عالم ہیں اور علم بغیر معلومات کے ناممکن لہٰذا ان کے معلومات بھی ازلی ہیں۔ یعنی معلومات "غیر مجعول" یا غیر مخلوق ہیں۔ علم حق تعالیٰ کی ایک صفت ہے، اس کا ان کی ذات سے انفکاک ناممکن ہے، ورنہ حق تعالیٰ کو جہل لازم آئے گا تعالی اللہ عن ذلك چونکہ حق تعالیٰ غیر مخلوق اور ازلی ہیں ان کا علم بھی غیر مخلوق ہے اسی طرح چونکہ ان کا علم کامل ہے لہٰذا ان کے معلومات بھی کامل ہونگے۔

اب حق تعالیٰ کے معلومات کو فلاسفہ "ماہیات اشیاء" کہتے ہیں اور صوفیہ "اعیان ثابتہ" (یا "صور علمیہ" یا "معلومات حق" یا حقائق الممکنات یا ازل ممکن) یہ جیسا کہ کہا گیا، اولاً غیر مجعول ہیں اور ثانیاً کامل اور عدیم التغیر۔ ظاہر ہے کہ ہر "عین" کی اپنی خصوصیت ہوگی جس کو اس کی فطرت کہا جا سکتا ہے۔ اس کو دوسرے الفاظ میں "عین" کی "قابلیت" یا "اقتضا" یا قرآنی اصطلاح میں "شاکلہ" کہا جاتا ہے (قل کلٌ یعمل علی شاکلتہ)

یہ اچھی طرح یاد رکھنا چاہیئے کہ اعیان چونکہ غیر مجعول و غیر متغیر ہیں لہٰذا ان کے اقتضاءات یا قابلیات و شاکلات بھی غیر مخلوق و عدیم التغیر ہیں ؎

"قابلیت بہ جعل جاعل نیست ۔۔۔ فعل فاعل خلاف قابل نیست"

سِرِ قدر کو سمجھنے کے لئے بس ان ہی چند قضایا کا سمجھ کر تسلیم کر لینا کافی ہے۔ ہماری رائے میں، ان میں سے ایک بھی ایسا نہیں جس سے آپ کو اختلاف ہو سکتا ہو۔ ان سب کا خلاصہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ کی ذات ازل سے ثابت ہے، وہ ازل سے عالم بھی ہیں یعنی صفت علم سے موصوف ہیں۔ چونکہ علم کے لئے معلوم کا ہونا ضروری ہے لہٰذا معلومات حق بھی ازلی ہیں اور غیر مجعول۔ معلومات ہی "ماہیات اشیاء" یا ذوات ممکنات کہلاتے ہیں۔ جب معلومات ازلی ہیں تو ان کی ساری قابلیات بھی ازلی ہوں گی۔

اب تخلیق کا تعلق ارادہ سے ہے۔ تخلیق ارادہ کا عمل ہے۔ حق تعالیٰ کا ارادہ ان کے علم کا تابع ہوتا ہے۔ ان کا ہر فعل تحت حکمت ہوتا ہے اور اس کے لئے فعل کو علم کا تابع ہونا ضروری ہے۔ تخلیق نام ہے حق تعالیٰ کے معلومات یا اعیان کے خارج میں انکشاف کا۔ جو چیز خارج میں منکشف ہو رہی ہے وہ بحیثیت "تصور" یا "معلوم" علمِ الٰہی میں ازل سے موجود ہے۔ ان ہی معلومات یا تصورات یا اعیان کا جب خارج میں تحقق ہوتا ہے تو ان کا نام "اشیاء" ہوتا ہے۔ اشیاء داخلاً معلوم ہیں۔ خارجاً مخلوق ہیں۔

اپنی انفرادیت اور تعین و تشخص کے لحاظ سے غیرذات حق ہیں، ذات حق تمام تعینات و تشخصات سے منزہ ہے، لیس کمثلہ شیٔ وھوالسمیع البصیر!

اب ان حقائق کی روشنی میں حدیث جبر و قدر پر نظر ڈالو۔ تخلیق حق تعالیٰ کی طرف سے ہو رہی، لیکن اشیاء کے اقتضاءات یا قابلیات کے مطابق ہو رہی ہے۔ اشیاء کی یہ قابلیات بے جعل جاعل ہیں یعنی غیر مخلوق و ازلی ہیں، ان کو کسی نے مجعول نہیں کیا۔ یہ اپنے اقتضاے ذاتی کے لحاظ سے مستقل و مختار ہیں نہ کہ مجبور۔ یہی باریک بات جبری کی سمجھ میں نہیں آتی وہ اپنے عین یا ذات کو بھی مجعول و مخلوق خیال کرتا ہے، اپنی خصوصیات و قابلیات کو بھی آفریدہ سمجھتا ہے، حالانکہ یہ معلوم الٰہی ہونے کی وجہ سے ازلی ہیں، اگر یہ ازلی نہ ہوں، اور یہ جعل جاعل مجعول ہوں تو ضروری ہوگا کہ قبل جعل سلب ہوں گے، جو چیز سلب ہو وہ ہمیشہ سلب ہوگی موجود نہیں ہو سکتی، ورنہ قلب حقیقت لازم آئے گا، اور یہ محال و باطل ہے۔ اگر جبری اس نکتہ کو سمجھ لے تو وہ پھر یہ نہ کہے گا کہ میری فطرت اس طرح کیوں بنائی گئی، فطرت جس کو ہم اصطلاحی الفاظ میں عین ثابتہ یا معلوم کہہ رہے ہیں بنائی نہیں گئی، وہ مجعول ہی نہیں، یہ اور اس کے تمام اقتضاءات و قابلیات بے جعل جاعل ہیں اور اس طرح وہ اپنے اقتضائے ذاتی کے لحاظ سے مستقل و مختار ہے۔ لیکن ان قابلیات و خصوصیات کو حق تعالیٰ خارج میں ظاہر کر رہے ہیں وجود بخشی ان کی جانب سے ہو رہی ہے۔ تخلیق ہمیشہ اللہ ہی کا فعل ہے "خلقکم وما تعملون"۔

اوپر جو کچھ کہا گیا اس کو ایک جملہ میں ادا کیا جا سکتا ہے۔ یہی سرّ قدر ہے۔

"لا یمکن بعین ان یظھر فی الوجود ذاتاً صفۃ و فعلاً الا بقدر خصوصیتہ و اھلیتہ واستعداده الذاتی" (شیخ اکبر)

یہاں جبر و قدر دونوں میں تلفیق ہو رہی ہے۔ اعیان ثابتہ جو معلومات حق ہیں (اور حق تعالیٰ انکے عالم میں) اپنی خصوصیات و قابلیات و استعدادات کے موافق ظاہر ہو رہے ہیں۔ یہ ہے اختیار اور آزادی کا پہلو، لیکن ان کا ظہور حق تعالیٰ سے ہو رہا ہے، یہ ہے جبر کا پہلو!

دیکھو "حرکت ایک ہے اور نسبت دو"۔

ایک نسبت حق کی جانب ہے۔ یہ نسبت تخلیق ہے۔ جملہ افعال کی تخلیق حق تعالیٰ کر رہے ہیں۔ فاعل حقیقی وہی ہیں ذات خلق میں نہ حرکت ہے نہ قوہ، "لا حول ولا قوۃ الا باللہ۔ بمعنی حرکت [۱۲]" تخلیق افعال میں انسان مجبور ہے "ہمہ از دست"

دوسری نسبت خلق کی جانب ہے یہ نسبت "کسب" ہے، یعنی افعال کی تخلیق عین ثابتہ یا ماہیت شیٔ کے بالکل مطابق ہو رہی ہے، بالفاظ دیگر جو کچھ عین میں ہے بہ فعلیت خالق وہی ظاہر ہو رہا ہے، یا یوں کہو ہر شیٔ کی فطرت کے مطابق ظہور ہو رہا ہے جب تمام وقوعات میری اقتضاء کے موافق ہو رہے ہوں اور کوئی شئے میری فطرت کے خلاف مجھ پر عاید نہیں کی جا رہی ہے تو پھر میں صحیح معنی میں آزاد ہوں اسی لئے شیخ اکبر فرماتے ہیں کہ ما یحکم علینا الا بنا بل نحن نحکم علینا بنا" "جو کچھ ہم پر حکم لگایا جا رہا ہے وہ ہماری فطرت کے

مطابق ہے، بلکہ خود ہم اپنی ہی اقتضا کے مطابق حکم لگا رہے ہیں۔ یہ ٹھیک قرآن کریم کے ارشاد کے مطابق ہے۔ "اٰتاکم من کل ما سالتموہ[1] یعنی وہ سب کچھ تم کو اس نے دیا جس کو تمہارے عین نے لسانِ استعداد سے مانگا" دوسری جگہ اور زیادہ صاف طور پر بیان کیا گیا ہے:۔ "انا لموفوھم نصیبھم غیر منقوص[2] فللہ الحجۃ البالغۃ[3] "ہم ان کا حصہ پوری طرح بغیر کسی نقصان کے دیتے ہیں" صاحبِ گلشنِ راز حق تعالیٰ کی زبانی کہلواتے ہیں ؎

ہر چہ از زین و شین شما است — بر سر مقتضائے عین شما است
ہر چہ عین شما تقاضا کرد — جود فیض من آں ہویدا کرد

ہر شخص کا عین گویا ایک کتاب ہے جس میں اس کی تمام خصوصیات و قابلیات ذاتیہ درج ہیں۔ حق تعالیٰ کی تخلیق اس کے عین مطابق ہو رہی ہے۔ جامیؒ سامی نے اس کو بڑی خوبی سے ادا فرمایا ہے

"اے عین تو نسخۂ کتاب اول — مشروع در اں صحیفۂ اسرار ازل
احکام قضا چو بود در وے بدرج — حق کرد باحکام کتاب تو عمل"

اسی مفہوم کو اور زیادہ اصطلاحی زبان میں ادا کرو تو بات اور زیادہ واضح ہو جاتی ہے اور تمام مسئلہ کی تلخیص حاصل ہو جاتی ہے: اعیان یا ماہیات در اصل معلومات حق ہیں اور حق تعالیٰ کا حکم اپنے معلومات کا تابع ہوگا" وللہ در من قال ؎

حق عالم و اعیان خلائق معلوم — معلوم بود حاکم و عالم محکوم
بر موجب حکم تو کند با تو عمل — گر تو بمثل معذبی ور مرحوم (جامی)

اس طرح حکم قدر عین ثابتہ کی طرف ہی رجوع ہوتا ہے یعنی تخلیق حق تابع اقتضاآت عین ثابتہ ہے اسی لئے کہا گیا ہے "القدر انت"، "والحکم لک" بلاشک اب اس راز کے معلوم ہو جانے کے بعد ہمیں ایک سکون حاصل ہو جاتا ہے اور غیر کے تعلق سے ہم کٹ جاتے ہیں۔ خیر و شر کا مبدء اپنی ہی ذات کو قرار دیتے ہیں۔ "از ماست کہ بر ماست" کے معنی ہم پر کھل جاتے ہیں۔ نہ ظلم کی نسبت خدائے تعالیٰ کی طرف کرتے ہیں (کیونکہ "ظلم باشد ز فعل او مسلوب" ان اللہ لیس بظلام للعبید[4]) نہ ابنائے زمانہ ہی کو ملعون و مطعون قرار دیتے ہیں اور نہ ماحول ہی کو بدنام کرتے ہیں، بلکہ ذمہ داری اپنے کندھوں پر لیتے ہیں اور اپنے ہی نفس کو مخاطب کر کے کہتے ہیں" یداک اوکتا وفوک نفخ" "تیرے ہی دونوں ہاتھوں نے کمایا ہے اور ترے ہی منہ نے پھونکا ہے"۔ سچ ہے۔

"وما اصابکم من مصیبۃ فبما کسبت ایدیکم"[5]

جبر و قدر کی اس تلفیق کے بعد جب ہم علامہ اقبال کی طرف رجوع کرتے ہیں تو یہاں بھی یہی حل ہمیں ملتا ہے لیکن طرز بیان مختلف ہے اور اصطلاحات جدا ہیں۔ مگر تضاد اس شدت کے ساتھ پیش کیا گیا ہے اور توضیح میں اس قدر اجمال سے کام لیا گیا ہے کہ تضاد بیانی تو نمایاں نظر آتی ہے لیکن تلفیق کا نشان غائب ہو جاتا ہے۔ ان کی فلسفیانہ کتاب (Reconstruction)

---

[1] پ ۱۳ ع ۱۷، [2] پ ۱۲ ع ۹، [3] پ ۸ ع ۵، [4] پ ۴ ع ۱۰، [5] پ ۲۵ ع ۵

میں ہیں وہ ایک عبارتیں ایسی واضح مل جاتی ہیں کہ اگر اقبال ان کی توضیح میں ذرا اور تفصیل سے کام لیتے تو بات کے سمجھنے میں زیادہ آسانی ہو جاتی۔ تاہم اقبال علم صحیح کے مطابق حل ضرور پیش کرتے ہیں گو اجمالی طور پر۔ اسی اجمال کو یہاں کسی قدر کھولا جا رہا ہے اپنی مذکورۂ بالا کتاب میں "تقدیر" کی توضیح میں اقبال کہتے ہیں:۔

"As the Quran says :—" "'God created all things and assigned to each its destiny'. The destiny of a thing, then, is not an unrelenting fate working from without like a task master ; it is the *inward reach of a thing, its realizable possibilities which lie within the depths of its nature* and *socially actualize themselves without any feeling of external compulsion.*" (Ibid pp. 67-78)

یعنی "جیسا کہ قرآن کا ارشاد ہے "خلق کل شیء فقدرہ تقدیرا" تقدیر کوئی قوت قاہرہ نہیں جو خارج سے شی پر بجبر عمل کر رہی ہو۔ بلکہ وہ خود شی کی باطنی رسائی ہے اس کے وہ قابل تحقق امکانات ہیں جو اس کی فطرت میں مضمر ہیں جو بغیر کسی خارجی جبر کے اپنے وقت پر ظاہر ہوتے ہیں۔"

اسی ایک عبارت پر غور کیا جائے تو ظاہر ہوگا کہ اقبال شی کی قابلیات اور اقتضاآت کو یا ان کے الفاظ میں "قابل تحقق امکانات" ہی کو اس کا "اختیار" قرار دے رہے ہیں، اس کے معنی یہ ہیں کہ اقتضا آت غیر مجعول و غیر مخلوق ہیں اور چونکہ ان ہی اقتضا آت کا خارج میں (بہ فعلیت خالق) ظہور ہو رہا ہے لہذا ذات شی پر کوئی جبر واقع نہیں ہو رہا ہے اور اس معنی میں "وہ آپ ہے تقدیر الٰہی"۔ شیخ اکبر نے اس مفہوم کو اس طرح ادا کیا تھا کہ "ان الحق لا یعطیہ الا ما اعطاہ عینہ" حق تعالیٰ شی کو وہی عطا فرماتے ہیں جو اس کے عین (یعنی معلوم) کا تقاضا ہے۔ اقبال اسی چیز کو دوسرے رنگ میں پیش کر رہے ہیں۔

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے (بال جبرئیل)

انسان اس معنی میں مجبور نہیں کہ اس کی "قابلیات" بھی تخلیق الٰہی قرار دئے جائیں۔ انسان کی فطرت یا ماہیت بالفاظ دیگر اس کا عین "(معلوم الٰہی ہونے کی وجہ سے، جیسا کہ ہم نے اوپر دیکھا ہے) غیر مخلوق ہے اور اسی لئے اس کو اختیار اور آزادی حاصل ہے اپنے الفاظ میں شاید اقبال اسی مفہوم کو ادا کر رہے ہیں۔

تقدیر شکن قوت باقی ہے ابھی اس میں ناداں جسے کہتے ہیں تقدیر کا زندانی

(بال جبرئیل)

سلہ اقبال بال جبرئیل

حق تعالیٰ کی قدرتِ مطلقہ و حکمتِ بالغہ کا لحاظ کرتے جن کا اقبال دل و جان سے قائل ہے اس شعر کی توجیہ اس کے سوا کیا ہو سکتی ہے جو ہم نے پیش کی ہے؟

آزادی اور اختیار کے اس مفہوم کے ساتھ جبر کا وہ مفہوم بھی یاد رکھو جو اقبال نے "ہمہ از دوست" کے معنی میں لیا ہے اور تخلیق کی نسبت حق تعالیٰ کی جانب کی ہے تو تمھیں اس تضاد کی تلفیق سمجھ میں آنے لگتی ہے جس کو ہم نے دو جملوں میں ادا کیا ہے "الخلق من الحق والکسب من الخلق" یہی معنے ہیں اس مشہور قول کے جو امام جعفر الصادق کی طرف منسوب کیا جاتا ہے:-

"لا جبر ولا قدر بل الأمر بين الأمرين"

بشنو سخنِ مشکل و سرّ مُغلق! ہر فعل و صفت کہ باشد باعیان ملحق
از یک جہت آن جملہ مضاف است بما از وجہ دیگر جملہ مضاف است بحق (جامی)

اگر آپ نے سرِ قدر کو سمجھ لیا ہے تو آپ کی سمجھ میں یہ بھی آجائے گا کہ کیوں "کاملین" جبر کے معنیٰ "تخلیق من اللہ" لے کر ایک قسم کی قوت و طمانیت محسوس کرتے ہیں اور کیوں جاہل جبر کو سلب آزادی سمجھ کر ضیق میں گرفتار ہو کر یاس میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ قاضی محمود بحری کے انھیں نفیس اشعار میں سے ایک شعر اقبال اپنے مکالمہ میں "پیر" کی زبانی کہلواتے ہیں۔

"جبر باشد پر و بالِ کاملاں! جبر ہم زندان و بندِ جاہلاں!
بال بازاں را سوئے سلطاں برد! بال زاغاں را بگورستاں برد!"

از

پروفیسر مناظر احسن گیلانی۔ صدر شعبۂ دینیات

جامعۂ عثمانیہ

الحمد للہ وکفی والصلوٰۃ والسلام علی عبادہ الذین اصطفی

تدریسی اسباق کے ساتھ، جو طلبا، جامعہ کے لئے مخصوص ہیں کچھ دنوں سے جامعہ میں توسیعی خطبات کا سلسلہ بھی عام لوگوں کے نفع کے لئے جاری کیا گیا ہے۔ باغ عامہ کے دار البلد (ٹاؤن ہال) میں خاکسار نے بھی "تدوین حدیث" پر نائب معین امیر جامعہ قاضی محمد حسین صاحب کی فرمایش سے ایک خطبہ دیا تھا۔ وہی خطبہ مقالے کی صورت میں آج شائع کیا جاتا ہے۔ آیندہ بہ تدریج انشاء اللہ دوسرے اقساط بھی شائع ہوتے رہیں گے، کہ مضمون ابھی مکمل نہیں ہوا ہے۔

مناظر احسن گیلانی

علم حدیث پر بحث کرنے کے لئے ہمیں اپنے سامنے ان چند سوالات کو رکھ لینا چاہیئے۔

(۱) حدیث کی حقیقت کیا ہے۔

(۲) اس علم کی تدوین کب، کس طریقہ سے کس زمانہ میں شروع ہوئی، اور ان طریقوں کا اس علم کے وثوق و اعتماد پر کیا اثر مرتب ہوا یا ہو سکتا ہے۔

(۳) ابتدا سے اس وقت تک اس فن کی ممتاز خدمتیں جن بزرگوں نے انجام دیں، خود ان کی اور ان کے کارناموں کی تفصیل۔

(۴) اس فن کے متعلق کیا جدید تکمیلی کوششوں کی ضرورت باقی ہے۔

(۵) حدیث کے بعد فن حدیث کے دوسرے متعلقات یعنی فن اسماء الرجال اور اصول حدیث کی حقیقت ان کی تاریخ، موجودہ حیثیت، ان میں آئندہ ترقیوں کے امکانات۔

حدیث کی حقیقت سب سے پہلے میں پہلے سوال کو لیتا ہوں یعنی حدیث کی حقیقت کیا ہے؟ بات یہ ہے کہ عموماً دنیا میں دو طرح کی قومیں پائی جاتی ہیں، بعض بلکہ شاید زیادہ تر قومیں ایسی ہیں جنھوں نے اپنے حال کو ماضی سے وابستہ رکھنے کی کوشش نہیں کی، اگرچہ واقعہ تو یہی ہے کہ کسی قوم کا کوئی حال ماضی سے الگ ہو کر تعمیر پذیر نہیں ہو سکتا۔ لیکن باوجود اس واقعہ کے جیسے جیسے وہ آیندہ کی طرف بڑھتی رہیں، اپنے ماضی کو بھلاتی چلی آئیں ان کے پاس اپنے موجودہ حالات پر غور و فکر کرنے کے لئے گذشتہ حالات و واقعات تجربات و مشاہدات کا کوئی سرمایہ نہیں ہے۔ گویا جس طرح جنگل کی زندگی گذاری جاتی ہے، یہ بھی گذارتے ہیں، آخر ریچھوں اور بندروں کو کیا معلوم کہ ان کے جد اعلیٰ کون تھے، کن کن جنگلوں اور وادیوں پہاڑوں سے چھلانگیں مارتے ہوئے، ان کے آباؤ اجداد موجودہ مقام تک پہونچے۔ کن کن حالات سے ان کو دوچار ہونا پڑا۔

لیکن ان کے مقابلہ میں انسانوں ہی کا ایک طبقہ ان قوموں کا بھی ہے جنھوں نے حتی الوسع اس کی کوشش کی ہے کہ جہاں تک ممکن ہو حال کی تعمیر میں ماضی کے تجربات و واقعات سے نفع اُٹھایا جائے، اور اس کے لئے ان کو ضرورت محسوس ہوئی کہ گذرے ہوئے واقعات کو کسی نہ کسی طرح محفوظ کر لیا جائے۔ انسانیت کے اس گروہ کی اسی کوشش کا نام تاریخ ہے، ابتداء میں "تاریخ" کی حفاظت و بقا کا شوق قوموں میں کم رہا ہے، لیکن اب تو یہ ایک ایسی ناگزیر ضرورت بن گئی ہے، کہ اپنی توانائیوں کا ایک بڑا حصہ ہر قوم اس پر خرچ کر رہی ہے جس سے ہم اور آپ سب واقف ہیں۔ جنگل کی زندگی بسر کرنے والے بھی اب اپنے آجداد و اسلاف کے کارناموں کی جستجو گڑی ہوئی ہڈیوں اور پرانے مقبروں اور مرگھٹوں میں کر رہے ہیں۔ کونہ کونہ سے قدیم سکے برآمد کئے جا رہے ہیں، کہنہ قبروں کی کتابوں کے حروف کے پڑھنے کی کوشش کی جا رہی ہے پرانے کھنڈروں کی ایک ایک ٹھیکری چنی جا رہی ہے۔ ان ہی پر واقعی کہئے یا خیالی بلند و بالا عمارتیں

میہ ہو رہی ہیں، گویا اس علم کی ناگزیر ضرورت کو دنیا کی اکثر قوموں نے اب تسلیم کر لیا ہے، اور بجز چند ارنیابی الطبع
سکی مزاج خشک دماغ فلسفیوں کے، عام دنیا کا شدید رجحان بھی ان چیزوں کے جاننے کی طرف ہے۔

ریخ اور فن حدیث دنیا کی اسی تاریخ کے ایک عظیم الشان، حیرت انگیز انقلابی حصہ کا نام سچ پوچھئے تو حدیث ہے
ہرا مطلب یہ ہے کہ جن انقلابات و حوادث سے گذر کر نسل انسانی موجودہ حالت تک پہونچی ہے، ان میں ایک ایسا واقعہ
بس نے کسی خاص شعبہ حیات ہی میں نہیں، بلکہ مذہبی، سیاسی، معاشرتی، اخلاقی تمام شعبوں میں انسانیت کا رخ پلٹ دیا،
بس سے زمین کا کوئی خاص حصہ نہیں، بلکہ بلا مبالغہ مشرق و مغرب دونوں متاثر ہوئے، ہو رہے ہیں اور ہوتے رہیں گے
اضی کے اسی مدہش حیرت انگیز واقعہ کی تاریخ یا تفصیلی بیان کا نام حدیث ہے۔ اگرچہ عام طور پر مسلمانوں کی ابتدائی تاریخ سے
حدیث کا تعلق قرار دیا جاتا ہے، لیکن جہاں تک واقعات و حالات کا تعلق ہے میں "حدیث" کو "انسانیت" کی تاریخ کا ایک
حصہ اور ایسا حصہ قرار دیتا ہوں جس کی صرف یہی خصوصیت نہیں ہے کہ ایک بے نظیر عدیم المثال عالمگیر انقلابی عہد سے
اس کا تعلق ہے، بلکہ سچ پوچھئے تو آج جس کسی کے پاس یا جس قوم و امت کے ہاتھ میں ماضی بلکہ حال کی تاریخ کا بھی جو حصہ ہے
وہ وثوق و اعتماد میں تاریخ کے اس "محفوظ حصہ" یعنی حدیث کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔

جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں کہ میں ان آزردہ فطرت، شکیوں، میں نہیں ہوں، جو تاریخ کو جھوٹ کا جنگل قرار دے کر
ماضی کا انکار کرتے ہیں۔ اور "جو کچھ محسوس ہو رہا ہے یہ نہیں محسوس ہو رہا ہے" اس سوفسطائی نظریہ پر زور دے کر حال کے وجود کو
بھی شک کے دانتوں سے چبا کر ختم کرنا چاہتے ہیں، بلکہ تاریخ کے مقررہ معیار پر ماضی کے جن واقعات کی اب تصحیح ہو چکی ہے
ان کی قدر کرتا ہوں، اور سمجھتا ہوں کہ آیندہ کی راہ درست کرنے کے لئے، ہمیں ہمیشہ ماضی کی روشنی سے نفع اٹھانا چاہئے۔

فاقصص القصص لعلهم یتفکرون (لوگوں سے پچھلے قصے بیان کیا کرو تاکہ وہ سوچیں) (قرآن مجید)

لیکن اگر یہ صحیح ہے، جیسا کہ ایک بڑے مشہور مسلم الثبوت مورخ کا بیان ہے "کسی زمانہ کے حالات......
جب قلمبند کئے جاتے ہیں تو یہ طریقہ اختیار کیا جاتا ہے کہ ہر قسم کی بازاری افواہیں قلم بند کر لی جاتی ہیں جن کے راویوں کا
نام و نشان تک معلوم نہیں ہوتا۔ ان افواہوں سے وہ واقعات انتخاب کر لئے جاتے ہیں، جو قرائن و قیاسات کے مطابق ہوتے
ہیں، تھوڑے زمانہ کے بعد (یعنی کتابی شکل اختیار کرنے کے بعد) یہی ایک دلچسپ تاریخی کتاب بن جاتی ہے، یورپ کی اکثر تصنیفیں
اسی اصول پر لکھی گئی ہیں"۔ اور اس وقت ہمارے پاس ماضی کی تاریخوں کا جو ذخیرہ ہے خواہ وہ روم ہو یا یونان، چین ہو یا ایران
ان قدیم اقوام کی تاریخ جن ذرائع سے مرتب ہوئی ہے، اگر ان کے اساسی سرچشموں کی جانچ کی جائے گی تو جو کچھ اس فاضل مورخ
نے بیان کیا ہے، بہت کچھ اس کی توثیق کرنی پڑے گی مشکل ہی سے انسانوں کے پاس اس وقت کوئی ایسی تاریخی یادداشت
مل سکتی ہے، جسے واقعہ کے عینی شاہدوں نے خود مرتب کیا ہو۔ یا ان کے براہ راست بیانوں کو خود ان ہی سے سن کر کتابوں میں

درج کیا گیا ہو، اتفاقاً اگر کوئی ایسی چیز مل بھی جائے تو اس کا پتہ چلانا قطعاً دشوار بلکہ شاید ناممکن ہے، کہ ضبط و اتقان سیرت و کیرکٹر کے لحاظ سے ان کا کیا درجہ تھا، معتبر سے معتبر ترین کسی تاریخی ذخیرہ کے وثوق کے متعلق اگر کوئی بات پیش کی جا سکتی ہے تو یہی ہے کہ جس زمانہ میں واقعہ گزرا ہے مورخ خود ہی اس زمانہ میں موجود تھا، اتفاق سے کسی واقعہ کے متعلق اگر ایسی شہادت میسر آجاتی ہے تو تاریخ کا یہ حصہ زریں شاہکاروں میں شریک کر دیا جاتا ہے۔ لیکن خود اس معاصرت کا یہ حال ہے، کہ قدیم ماضی کے تاریک زمانہ کو تو جانے دیجئے۔ آج جب کہ جدید صناعات و ایجادات نے زمین کی طنابیں کھینچ کر ایک ملک کو دوسرے ملک سے ملا دیا ہے۔ تعلیم عام ہو چکی ہے۔ کم از کم یورپ کے مکتبوں اور اسکولوں میں روئے زمین کے اطلسوں کا مطالعہ ہر ایک کو کرا دیا جاتا ہے۔ لیکن ایک واقعہ نہیں آئے دن ایسی ایسی جہالتوں، اور غلط فہمیوں کے شکار غریب جاہل مشرقی ہی نہیں بلکہ فرزانۂ و دانا فرنگ کے ارباب خبر و علم ہوتے رہتے ہیں، کہ بعض دفعہ آدمی کو حیرت ہو جاتی ہے۔ اور تاریخ جھوٹ کا جنگل ہے، دماغ سوچنے لگتا ہے کہ کیا اس دعوی میں کچھ واقعہ کا عنصر بھی شریک ہے ؟ بہت پرانے زمانہ کی بات نہیں ہے کہ ۱۹۰۵ء میں کانگڑہ (پنجاب) کا مشہور زلزلہ ہندوستان میں آیا تھا، ایک نہیں بلکہ متعدد انگریزی اخباروں میں اس زلزلہ کے متعلق یہ خبر شائع ہوئی تھی کہ "کانگڑہ جو بمبئی کے قریب ایک جزیرہ ہے وہاں ایک سخت زلزلہ آیا" اور بیچارے اخبار والے تو شہر خبروں کی جماعت ہے۔ عام طور پر گپ نویسی میں یہ بدنام ہے، لیکن مشہور ریفرنس بک ہنرل کی امپیریل جو مشہور کتاب ہے۔ اور ہر قسم کے حوالجات کے لئے ایک مستند کتاب سمجھی جاتی ہے، اس میں اسی زلزلے کے متعلق یہ عبارت اس وقت تک موجود ہے:۔

"ایک سخت زلزلے نے ایک وسیع ضلع میں جو آگرہ اور شملہ کے درمیان واقع ہے عام تباہی اور سخت نقصان برپا کیا" نقصان کی تفصیل بتاتے ہوئے صرف اسی مورخ نے نہیں، بلکہ دوسروں نے بھی یہ ارقام فرمایا ہے۔

"اس سے کئی سو آدمی ہلاک ہوئے"

حالاں کہ پنجاب گورنمنٹ کی رپورٹ کے مطابق اس زلزلہ میں بیس ہزار سے کم آدمی ہلاک نہیں ہوئے تھے۔ معاصر مورخین کی کتابوں میں اگر اس قسم کی طرفگیوں اور بوالعجبیوں کو تلاش کیا جائے تو ایک اچھی خاصی کتاب تیار ہو سکتی ہے۔ سیاحوں کی یادداشتوں کو بھی تاریخی وقائع کے ثبوت میں بہت اہمیت دیجاتی ہے۔ اور اس سے بے پروا ہو کر دیجاتی ہے کہ خود اس سیاح کا اپنے ذاتی رجحانات، سمجھ بوجھ سچائی راستبازی میں کیا حال تھا۔ لیکن ان سیاحوں کی بدولت واقعات کی صورت کبھی کبھی کتنی مسخ ہو جاتی ہے اس کا ایک سرسری اندازہ ہمارے موجودہ میر شعبہ دینیات (نواب ناظر یار جنگ جسٹس حیدرآباد ہائی کورٹ) کے ڈرائنگ روم کی ایک تصویر سے ہو سکتا ہے۔ جو انگلستان کے ایک معتبر اخبار سے الگ کر کے محفوظ کی گئی ہے یہ ہندوستان کے ایک موقع کی تصویر ہے اور اس کے نیچے جلی خط حروف میں یہ لکھا ہوا ہے کہ بودھ مذہب کے لوگ اپنی ایک مشہور مذہبی رسم جو آدیا کے نام سے موسوم ہے ادا کر رہے ہیں، میں نے اس تصویر کے نیچے جب اس فقرہ کو پڑھا، تو بار بار حیرت ہوتی تھی کہ

آخر یہ کیا ہے۔ تصویر سے صاف معلوم ہو رہا تھا کہ ہندوستانی مسلمانوں کی ایک جماعت نماز پڑھ رہی ہے اُن کی شکل صورت، لباس، وضع، قطع، طریقہ نشست ہر چیز ہندی مسلمانوں کی تھی، لیکن معتبر سیاح نے جس وقت یہ فوٹو لیا تھا اس کے نیچے اس نے یہی عبارت درج کی تھی۔ آخر جب میر شعبہ صاحب باہر تشریف لائے۔ ان سے پوچھنے پر معلوم ہوا کہ آپ نے قصداً اس تصویر کو اسی لئے محفوظ کیا ہے، تاکہ یوروپین سیاحوں کی تاریخی شہادت کی ایک گواہی مہیا ہو، آپ نے فرمایا کہ یہ دہلی میں نماز عید کے موقعہ کی تصویر ہے، ایک مغربی سیاح نے اس عید کو ادتیا بنایا اور ادتیا کو خدا جانے کس طرح اس نے بودھ مذہب والوں کی رسم قرار دے کر اخبار میں اپنے اس جدید انکشاف کا اعلان کیا۔

ان چند تشکیکی مثالوں کے پیش کرنے سے میری یہ غرض نہیں ہے کہ واقعی میں دنیا کے موجودہ تاریخی ذخیروں کو بکلیہ غیر معتبر اور ناقابل لحاظ قرار دینا چاہتا ہوں بلکہ مقصد صرف اس قدر ہے کہ ان احتمالات و شکوک کی کمزوریوں کے باوجود بھی آج جب علمی دنیا میں "فن تاریخ" ہر قسم کے احترام و اعزاز کا مستحق ہے تو "حدیث" جو صرف مسلمانوں ہی کی تاریخ نہیں ہے بلکہ جیسا کہ میں نے عرض کیا تمام دنیا کی انسانیت کے ایک عظیم انقلابی عہد آفریں کا ایک ایسا مکمل تاریخی مرقع ہے جسے ٹھیک حقیقی اور اصلی شکل و صورت بلکہ ہر خط و خال کی حفاظت میں لاکھوں ہی نہیں بلکہ کروڑوں انسانوں کی وہ ساری کوششیں اور تدبیریں صرف ہوئی ہیں جو کسی واقعہ کی حفاظت کے متعلق آدمی کا دماغ سوچ سکتا ہے، بلکہ اس کی حفاظت و صیانت میں بعض ایسے قدرتی عوامل نے بھی کام کیا ہے جیسا کہ ابھی آپ کو معلوم ہوگا جو دنیا کے کسی تاریخی واقعہ کو نہ اس وقت تک میسر آئے اور نہ آیندہ آسکتے ہیں۔

لیکن قبل اس کے کہ میں کچھ اور کہوں، اس پر بھی تنبیہ کر دینا چاہتا ہوں کہ حدیث جس کے متعلق نہ جاننے والوں کا صرف یہ خیال ہے کہ وہ دینیاتی طرز کی کوئی چیز ہے۔ اور دینیات کے لفظ کے ساتھ ہی ان کا دماغ فوراً دور وحشت کے ان قدیم خرافات کی طرف منتقل ہو جاتا ہے جسے بدقسمتی سے اس زمانہ میں مذہب یا مذہب کی ایک قسم خیال کیا جاتا ہے، یا دینیات کے معنی چند وہمی رسوم و عادات یا چند رٹے ہوئے الفاظ منتر جنتر جادو ٹوٹکے وغیرہ کے ہیں، جن میں صحرائی باشندے کسی زمانہ میں کیا اب تک مبتلا ہیں۔ مذہب کے متعلق جن کے دماغوں میں اس قسم کے خیالات ہیں، حدیث جو مسلمانوں کے مذہبی علوم کا ایک جز ہے اس کے متعلق میرے ان دعووں کو سن کر ممکن ہے کہ حیرت ہو اور ان کی حیرت تو چنداں محل تعجب نہیں اس لئے کہ "جہل" ان مسکینوں کے لئے بڑا عذر ہے۔

حدیث کی مدرسی تعریف

لیکن جاننے والوں کو یہی شاید شبہہ ہوتا ہوگا کہ مدرسہ میں جس فن کی یہ تعریف کی جاتی ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (یعنی مسلمانوں کے پیشوا) کے اقوال و افعال اور ایسے واقعات جو ان کے سامنے پیش آئے بلکن ان میں کوئی تبدیلی نہیں کی گئی جسے اصطلاحاً تقریر کہتے ہیں، غرض پیغمبر کے اقوال و افعال و تقریر کا نام حدیث ہے، بعضوں نے

اس کو آگے بڑھا کر پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ اور بعضوں نے صحابہ کے شاگردوں یعنی تابعین کے اقوال و افعال کو بھی اس فن کے ذیل میں شریک کر لیا ہے۔

کہاں حدیث کی یہ مدرسی اور مذہبی تعبیر اور کہاں میرا یہ دعویٰ کہ حدیث مسلمانوں ہی کی نہیں بلکہ انسانیت کے اہم ترین انقلابی عہد کی تاریخ کا معتبر ترین ذخیرہ ہے، ان دونوں میں کیا نسبت ہے۔ شاید یہ خیال کیا جاتا ہو کہ زمانہ کے حالات سے متاثر ہو کر میں نے اپنی تعبیر بدلی ہے لیکن یہ واقعہ نہیں ہے۔ اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ ہر چیز کے سمجھانے کے لئے اسی زبان میں گفتگو کی جاتی ہے جسے مخاطب سمجھ سکتے ہوں۔ مجھے اس سے انکار نہیں ہے کہ میں نے اس فن کی تعریف کرتے ہوئے کچھ الفاظ ضرور بدلے ہیں، لیکن الفاظ کے بدلنے سے واقعات نہیں بدلتے۔ جو نہیں جانتے ہیں، انھیں تو آئندہ بتایا جائے گا۔ لیکن جو جانتے ہیں کہ حدیث کا تعلق جس ذات گرامی (صلی اللہ علیہ وسلم) سے ہے۔ کیا وہ اس کا انکار کر سکتے ہیں، کہ جن الفاظ میں اس فن کی میں نے تعبیر پیش کی ہے۔ کیا یہی اصل واقعہ نہیں ہے۔ اسلامی تحریک نے اپنے زمانہ آغاز سے اس وقت تک مشرق و مغرب کے باشندوں کی مذہبی، سیاسی، معاشرتی، اخلاقی پہلوؤں کے انقلاب میں جو کام کیا ہے اور کر رہا ہے ان کو پیش نظر رکھنے کے بعد مسلمان ہی نہیں، کوئی نامسلمان بھی حدیث کی اس تاریخی تعبیر کا انکار کر سکتا ہے جسے میں نے پیش کیا ہے؟

ماسوا اس کے سچ یہ ہے کہ بالکلیہ یہ میری تعبیر ہے بھی نہیں۔ فن حدیث کے سب سے بڑے امام امام الائمۃ حضرت امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب کا جو نام رکھا ہے اگر اسی پر غور کر لیا جائے تو آسانی سمجھا جا سکتا ہے کہ میں نے جو کچھ کہا ہے، یہ کوئی نئی بات نہیں ہے بلکہ سمجھنے والوں نے ہمیشہ اس فن کو اسی نگاہ سے دیکھا ہے۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب آج تو صرف "بخاری شریف" کے نام سے مشہور ہے۔ لیکن یہ اس کتاب کا اصلی نام نہیں ہے۔ بلکہ خود حضرت امامؒ نے اپنی کتاب کا نام

الجامع الصحیح المسند المختصر منؐ امورؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وؐ ایامہؐ

رکھا ہے۔ اس میں "امور" اور "ایام" کے الفاظ قابل غور ہیں، جن سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حدیث کی صحیح تعریف امام بخاری کے نزدیک ان تمام امور کو حاوی ہے جن کا کسی نہ کسی حیثیت سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے تعلق ہو، آگے ایام کے لفظ نے تو اس کی تعریف کو اور بھی وسیع کر دیا، یعنی وہی بات جو میں نے عرض کی تھی، کہ فن حدیث در اصل اس عہد اور ایام کی تاریخ کی تعبیر ہے، جس میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جیسی ہمہ گیر عالم پر اثر انداز ہونے والی ہستی انسانیت کو قدرت کی جانب سے عطا ہوئی۔ بہر کیف، اگر اصطلاحی جھگڑوں سے الگ ہو کر پھل سے درخت کے پہچاننے کے اصول کو مد نظر رکھا جائے تو حدیث کے موجودہ ذخیرہ پر سرسری نظر ڈالنے کے بعد بھی ایک معمولی آدمی اس کا اندازہ کر سکتا ہے کہ حدیث کی صحیح حقیقت اور اس کی واقعی تعریف وہی ہو سکتی ہے جس کی طرف حضرت امام بخاری نے اپنی کتاب کے نام میں ارشاد فرمایا ہے، اور میں نے جس کی تشریح کی ہے

غالباً "حدیث" کی حقیقت یا تعریف کے لئے میرا یہ مختصر بیان کافی ہو سکتا ہے۔ درسی کتابوں میں جیسا کہ ہر تعریف کے قیود و شرائط پر بحث کرکے بات کو بتنگڑ بنانے کی کوشش کی جاتی ہے میں ان دور از کار لفظی گورکھ دھندوں میں آپ لوگوں کو الجھا کر وقت نہیں ضائع کرنا چاہتا۔ اس لئے اس بحث کو اسی نقطہ پر ختم کرکے اب میں دوسرے ضروری سوالات کی طرف متوجہ ہوتا ہوں۔ ہمارے سامنے دوسرا سوال یہ تھا کہ تاریخ کے اس حصہ کی تدوین کس طرح اور کس زمانہ میں عمل میں آئی اسی سوال کے جواب میں اپ کے سامنے وہ امتیازات اور خصوصیات بھی آجائیں گے، جو تاریخ کے اس حصہ کو دنیا کی دوسرے تاریخی ذخیروں سے ممتاز کرتے ہیں۔

اس تاریخ کے ابتدائی مورخین و رواۃ کے خصوصیات

اتنا تو کم از کم ہر لکھا پڑھا آدمی جانتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی پاک، یا بالفاظ امام بخاری "امور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم و ایامہ" کے پہلے رواہ یا ابتدائی مورخین وہی حضرات ہیں جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے شرف صحبت سے فیض یاب تھے۔ یعنی صحابہ کرامؓ لیکن ان بزرگوں نے تاریخ کے اس حصہ کی روایت کیا ان ہی اسباب کے تحت ـــــ کی جن کے زیر اثر دنیا کی دوسری تاریخیں مدّون ہوئی ہیں؟

میرا مقصد یہ ہے کہ دنیا کے عام تاریخی سرمایوں کی تدوین میں جس طرح عموماً حال کو ماضی سے مربوط رکھنے کا جذبہ یا پچھلوں کی مجلسوں کو پہلوں کی داستانوں سے گرم رکھنے کا ذوق کار فرما رہا ہے، کیا حدیث کی تدوین بھی اسی جذبہ کے تحت ہوئی؟ میرا خیال ہے کہ حدیث کی تدوین کی بحث چھیڑنے سے پہلے سخت ضرورت تھی کہ پہلے ان اسباب یا جیسا کہ میں نے پہلے بھی اشارہ کیا ہے کہ ان قدرتی عوامل کو سامنے لانے کی حاجت ہے، جو دنیا کی عام تاریخ سے اس خاص حصہ یعنی حدیث کو بالکل جدا کر دیتے ہیں، ممکن ہے کہ اس بحث میں آپ کا کچھ زیادہ وقت میں لوں، لیکن بات چونکہ بالکل نئی ہے، اس لئے اجمال سے کام لینے میں اندیشہ ہے کہ میں جو کچھ کہنا چاہتا ہوں، وہ شائد پورے طور سے ذہن نشین نہ ہو سکے۔ میں ان امتیازی اسباب و عوامل کو الگ الگ کرکے بیان کرتا ہوں۔

"عام تاریخی ذخیروں سے حدیث کے امتیازات"

(۱)

عام تاریخوں سے تاریخ کے اس حصہ کو جو پہلا امتیاز حاصل ہے وہ اس امر کی بساطت ہے جس سے اس کا تعلق ہے، میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ہمارے پاس اس وقت تاریخ کے جو عام ذخیرے ہیں عموماً ان کا تعلق کسی قوم کی حکومت کسی عظیم الشان جنگ الغرض اسی قسم کی منتشر اور پراگندہ گوناگوں چیزوں سے ہے، جن کا احاطہ آسان نہیں ہے بخلاف اس کے حدیث اس تاریخ کا نام ہے جس کا تعلق براہ راست ایک خاص شخصی وجود، یعنی سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس ہے، ایک قوم، ایک

ملک، ایک حکومت، ایک جنگ، کے تمام اطراف وجوانب کو صحیح طور پر سمیٹ کر بیان کرنا ایک طرف ہے، اور دوسری طرف ملک نہیں ملک کی کوئی خاص قوم نہیں، کسی قوم کا کوئی قبیلہ نہیں کسی قبیلہ کا کوئی خانوادہ نہیں، بلکہ صرف ایک واحد بسیط شخص کی زندگی کے واقعات کا بیان کرنا ہے، خود اندازہ کیجئے کہ احاطہ وتدوین کے اعتبار سے دونوں کی آسانی ودشواری میں کوئی نسبت ہے پہلی صورت میں کوتاہیوں، غلط فہمیوں غلطیوں کے جتنے قوی اندیشے ہیں یقیناً اسی نسبت سے دوسری صورت میں صحت و واقعیت کی اسی قدر عقلاً توقع کی جاسکتی ہے۔

(۲)

دوسرا امتیاز جو پہلے امتیاز سے بہت زیادہ اہم ہے، وہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے مورخوں یعنی صحابہ کرام کا باہمی تعلق ہے بلاشبہ اس وقت ہمارے سامنے مختلف اقوام وممالک سلاطین اور حکومتوں کی تاریخیں ہیں، لیکن جن مورخوں کے ذریعہ سے یہ تاریخیں ہم تک پہونچی ہیں، کیا ان میں کسی تاریخ کا اپنے مورخ یا مورخین سے وہ تعلق تھا جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو صحابہ کرام کے ساتھ تھا، سب سے پہلی بات تو یہی ہے کہ مشکل ہی سے آج کوئی ایسا تاریخی حصہ ہمارے پاس نکل سکتا ہے جس کے مورخین خود ان واقعات کے عینی شاہد ہوں، بلکہ جیسا کہ پہلے بھی میں نے ذکر کیا ہے کہ عموماً ان تاریخوں کی تدوین یوں ہی ہوئی ہے کہ ابتداء میں مبہم مجہول الحال افواہوں کی صورت میں واقعات ادھر ادھر بکھرے رہے، پھر ان میں سے جب کسی کو شوق ہوا تو اس نے ان ہی افواہوں کو قلمبند کرنا شروع کیا، پھر خود اس مورخ ہی نے یا اس کے بعد والوں نے قرائن وقیاسات سے جہاں تک ممکن ہوا، جس حصہ کو چاہا باقی رکھا، جسے چاہا قلم زد کردیا، یہ تو شروع میں ہوا، بعد کو جوں جوں ان قلم بند شدہ واقعات پر زمانہ گذرتا گیا، اوراق میں زیادہ بوسیدگی پیدا ہوئی، کیڑوں کی خوراک سے بچ کر جو حصہ باقی رہا پچھلی نسلوں کے لئے وہی تاریخی وثیقہ بن گیا، آج اسی ذہنیت کا نتیجہ ہے کہ مطبوعہ کتابوں سے زیادہ بھروسہ قلمی کتابوں پر اور قلمی کتابوں میں بھی سب سے زیادہ قیمتی وہ مسودات ہیں جو بوسیدہ اور کرم خوردہ ہو چکے ہوں اور سنگی، برنجی یا آہنی تختیوں کا کوئی ذخیرہ اگر کسی مورخ کو مل گیا تو وہ ہی چیز جو ہمارے ہی جیسے انسانوں نے کسی زمانہ میں لکھ کر زمین میں گاڑ دی تھی ....

.... بلکہ ہم تو اپنے کو اپنے معاصرین کو ایک حد تک جانتے بھی ہیں، لیکن ان کے لکھنے والوں کا تو کچھ پتہ نہیں ہوتا لیکن کیا کیجئے کہ بایں ہمہ وہ معصوم فرشتوں کے بیان کی حیثیت اختیار کرلیتے ہیں۔

ل بلکہ اگر بعض ثقہ راویوں کا یہ بیان صحیح ہے کہ ہندوستان کی بعض قوموں کے علمی مرکزوں میں "قدیم ہند" کے لئے تاریخی مواد فراہم کرنے کی ایک صورت یہ بھی نکالی گئی ہے کہ آہنی اور برنجی پتروں یا تختیوں پر پرانی زبانوں پرانے حروف میں اپنے مطلب کے موافق عبارتیں کندہ کرلی جاتی ہیں، اور کسی مشہور آثاری کھنڈر میں ان ہی کو دفن کردیا جاتا ہے پھر کچھ دنوں کے بعد ان ہی کو نکال کر علمی ذخیرہ میں جدید اکتشاف کی حیثیت سے ان کا اور ان سے جو نتائج نکلتے ہیں اضافہ کردیا جاتا ہے۔ اگر یہ واقعہ صحیح ہے تو علم پر جاہلوں کا یہ کتنا بڑا ظلم ہے اور اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ہم جن قدیم کتبوں پر اندھا دھند ایمان لارہے، ان میں بھی اشتباہ کی کس حد تک گنجایش ہے بلکہ سکندر کی لائبی مدفونہ زرہوں کا افسانہ اگر صحیح ہے تو صرف کتابیں ہی نہیں بلکہ ان کھنڈروں سے جو چیزیں نکل رہی ہیں اور ان سے جو نتائج نکالے جارہے ہیں محل غور وفکر بن جاتے ہیں ۱۲

لیکن اسی کے ساتھ مجھے اس کا بھی اعتراف کرنا چاہئے کہ گذشتہ بالا کلیہ سے تاریخ کے بعض حصے مستثنیٰ بھی ہیں، خصوصاً اسلامی دور میں مسلمان بادشاہوں کے حکم سے جب تاریخوں کی تدوین کا سلسلہ شروع ہوا، اور باضابطہ شاہی وسائل و ذرائع کے ذریعہ سے مورخوں کو واقعات کے فراہم کرنے میں امداد دی گئی، یقیناً ان کتابوں کی نوعیت قدیم تاریخوں سے بالکل جداگانہ ہے اسی طرح مسلمان مورخوں کی بنائی ہوئی راہوں پر اس زمانہ میں خصوصاً مغربی قومیں نسبتاً زیادہ حزم و احتیاط سے کام لے رہی ہیں لیکن کچھ بھی ہو کسی زمانہ کی تاریخ ہو، ان کے مورخوں کو ان واقعات سے یا صاحب واقعات سے قطعاً وہ تعلق نہ تھا اور نہ ہو سکتا ہے، جو صحابہ کرام کو ذات قدسی صفات سے تھا، یہی نہیں کہ ان بزرگوں نے حضور کے ہاتھ پر ایمان و اسلام کی بیعت کی تھی، آپ کی نبوت پر وہ ایمان لائے تھے، آپ سے ان کو وہ تعلق تھا جو ایک امتی کو اپنے پیغمبر سے ہونا چاہئے، بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر جیسا کہ واقعات سے پتہ چلتا ہے، کہ وہ اپنے ماں باپ بیوی بچوں، بلکہ اپنی جانوں سے بھی زیادہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی زندگی کو عزیز رکھتے تھے، وہ سب کچھ حضور پر قربان کرنے کے لئے تیار تھے، گویا ایک قسم کے عشق و سرمستی کے نشہ میں مخمور تھے، یقیناً یہ ایسا امتیاز ہے جو کسی تاریخی واقعہ کو اپنے مورخین کے ساتھ حاصل نہیں۔ آخر دنیا کی ایسی کونسی تاریخ ہے جس کے بیان کرنے والے مورخین اس تاریخ سے ایسا والہانہ تعلق رکھتے ہوں کہ بیان کرتے جاتے ہیں اور روتے جاتے ہیں، کانپتے جاتے ہیں۔ عبداللہ بن مسعودؓ کے متعلق ان کے دیکھنے والوں کا بیان ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر کے بہت کم حدیثیں بیان کرتے تھے، لیکن اگر کبھی زبان پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا نام آگیا، راوی کا بیان ہے کہ اس کے بعد ارتعد وارتعدت ثیابه تنفخ اوداجه مغرورقة عیناه۔ (کانپنے لگتے اور ان کے کپڑوں میں تھرتھری پیدا ہو جاتی۔ گردن کی رگیں پھول جاتی تھیں، آنکھیں آنسوؤں سے بھر جاتیں (مستدرک حاکم) ایک عبداللہ بن مسعود ہی نہیں، بلکہ ان اصحاب کی ایک فہرست تیار ہو سکتی ہے جن پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر مبارک کے وقت ایک خاص قسم کی کیفیت پیدا ہو جاتی تھی۔ حضرت ابوذر کبھی کبھی کوئی حدیث بیان کرنا چاہتے، مگر منھ سے اوصانی حبی ابوالقاسم اوصانی خلیلی صلی اللہ علیہ وسلم الفاظ نکلتے اور چیخ مار مار کر بیہوش ہو جاتے تھے، اسی قسم کے واقعات حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالی عنہ کے ذکر میں بھی ملتے ہیں اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ جس تاریخ کو اس کے مورخوں میں محبوبیت کا یہ مقام عالی حاصل ہو قدرتی طور پر ان کے دل و دماغ ان کے حافظے اس سے کس حد تک متاثر ہو سکتے ہیں۔

(۳)

تیسری خصوصیت اس تاریخ اور اس کے راویوں کی یہ ہے کہ علاوہ مذکورہ بالا تعلقات کے، ان براہ راست مورخوں یا چشم دید راویوں اور گواہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک پر بیعت ہی اس بات پر کی تھی کہ "تاریخ کے اس عجیب و غریب واقعہ" کے ہر ہر جزء، ایک ایک خط و خال کے زندہ نقوش اپنے اندر پیدا کریں گے، انھوں نے جس قرآن کو خدا کی شریعت اور قدرت کا قانون یقین کر کے مانا تھا اس میں بار بار مطالبہ کیا گیا تھا کہ تم میں ہر ایک کی زندگی کا نصب العین صرف یہی

ہونا چاہیئے کہ جو کچھ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں انھیں سنو، سن کر یاد رکھو، اور ان پر ایمان لاؤ، یقین کرو، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو کچھ کرتے ہیں، ان کی ہر ہر ادا پر نگاہ رکھو اور ٹھیک من وعن جس طرح ان کو جو کچھ کرتے ہوئے دیکھتے ہو تم بھی اس کام کو اسی طرح انجام دینے کی کوشش کرو۔

(۱) ما آتاکم الرسول فخذوہ و ما نھاکم عنہ فانتھوا	رسول نے جو کچھ تمھیں دیا ہے اسے پکڑے رہو، اور جس سے انھوں نے روکا ہے اس سے رک جاؤ،
(۲) وما ارسلنا من رسول الا لیطاع باذن اللہ	ہم نے کوئی رسول نہیں بھیجا لیکن صرف اسی لئے کہ اس کی پیروی اور اطاعت خدا کے حکم سے کی جائے۔
(۳) قل ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی یحببکم اللہ	کہدو اگر تم اللہ کو چاہتے ہو، تو میری پیروی کرو اللہ بھی تمھیں چاہنے لگےگا۔
(۴) لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ	تمھارے لئے اللہ کے رسول میں اچھا نمونہ ہے۔

سمع وطاعت، اطاعت واتباع کے انہی جلال مطالبوں سے قرآن گونج رہا تھا، اور ان لوگوں کے سامنے گونج رہا تھا، جو ہر چیز سے دست بردار ہو کر صرف اس کی آواز میں گم ہونے کا آخری اور قطعی فیصلہ کر چکے تھے۔

ان کا یہ فیصلہ غلط تھا، یا صحیح، مجھے اس وقت اس سے بحث نہیں، لیکن حضرات صحابہ کرام کے اس "فیصلہ" کا علم مسلم اور غیر مسلم ہر طبقہ کو ہے بتایا جائے کہ دنیا کے کس تاریخی واقعہ سے اس کے مورخین اور راویوں کا یہ تعلق ہے، عجیب بات ہے کہ جن بزرگوں سے کسی زمانہ میں انسانوں کے کسی گروہ کو اگر یہ تعلق پیدا بھی ہوا تھا تو ان کی تاریخ ہی آج ناپید ہے، اور تاریخ کا جو سرمایہ آج ہمارے پاس ہے، اس کے مورخوں کو ان تعلقات کی ہوا بھی نہ لگی تھی۔

کہاں پچھلوں کی مجلسوں کی گرم بازاری کے لئے مورخین کے بیانات اور کہاں ان سوختہ سامانوں کی تاریخی شہادتیں

(۴)

اسی کے ساتھ ہمیں اس کا بھی اضافہ کرنا چاہیئے، کہ صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و اعمال کی اطاعت و اتباع ہی ان بزرگوں کے لئے ضروری نہ تھی، بلکہ جس قرآن اور جس فرمان نے ان پر یہ فریضہ عاید کیا تھا اسی نے ان کو اس کا بھی ذمہ دار بنایا تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جو کچھ کہتے ہوئے انھوں نے سنا ہے، اور جو کچھ کرتے ہوئے انھوں نے دیکھا ہے، وہ دوسروں تک مسلسل پہونچاتے چلے جائیں، ہر حاضر غائب کو اور ہر پہلا پچھلوں کو ان کی طرف بلاتا جائے۔ قرآنی آیتوں

(۱) کنتم خیر امۃ اخرجت للناس تأمرون بالمعروف و تنھون عن المنکر	تم ایک بہترین امت ہو انسانوں کی (بہی خواہی) کے لئے تم ظاہر کئے گئے ہو، تاکہ اچھی باتوں کا لوگوں کو حکم دو، اور بری باتوں سے ان کو روکو
(۲) ولتکن منکم اُمّۃ یدعون الی الخیر ویأمرون بالمعروف وینھون عن المنکر۔	چاہیئے کہ تم میں ایک گروہ ہو، جو نیکی اور بھلائی کی طرف لوگوں کو بلائے اچھی باتوں کا حکم دے اور بری باتوں سے روکے۔

ہی کی یہ تفسیر تھی جو مختلف پیرایوں میں صحابہ کرام کو مخاطب کر کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرمایا کرتے، منیٰ کا میدان ہے خیف کی مسجد ہے ایک لاکھ سے اوپر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے والوں کا مجمع ہے، سب کو مخاطب کر کے فرمایا جاتا ہے

(۱) نضّر اللہ عبداً سمع مقالتی فوعاھا ثم اداھا الیٰ من لم یسمعھا۔ (صحاح) | تروتازہ رکھے اللہ اس بندہ کو جس نے میری بات سنی پھر اسے یاد رکھا اور جس نے نہیں سنا ہے اس تک اسے پہونچا دیا۔

یہی منیٰ کا میدان ہے حجۃ الوداع کے مشہور تاریخی خطبہ میں اعلان فرمایا جاتا ہے:۔

(۲) ترکت فیکم شیئین لن تضلوا بعد ھما کتاب اللہ وسنتی ولن یتفرقا حتیٰ یردا علی الحوض (صحاح) | میں تم میں دو چیزیں چھوڑتا ہوں جن کے بعد تم پھر گمراہ نہیں ہو سکتے (ایک تو) اللہ کی کتاب (اور دوسری) میری سنت یہ دونوں باہم ایک دوسرے سے جدا نہ ہوں گے جب تک کہ حوض (کوثر) پر پھر میرے سامنے آجائیں

مجمع سے یہ دریافت فرمانے کے بعد کہ کیا میں نے پہونچا دیا۔ آسمان کی طرف انگلیاں اُٹھا کر" اللّٰھم ھل بلغت[1] اللّٰھم ھل بلغت اللّٰھم ھل بلغت کے ارشاد فرمانے کے بعد آخری رخصت کے اس خطبہ کو اس مشہور متواتر فقرہ پر ختم فرمایا جاتا ہے:۔

الا فلیبلغ الشاھد الغائب (صحاح) | چاہیئے کہ جو حاضر ہے وہ غائب کو پہونچاتا جائے۔

جس دردناک، اثر انگیز ماحول میں اس خاتمہ کا اعلان ہوا ہے، اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ جن جذبات وہیجانات سے مخاطب مجمع بھرا ہوا تھا اس پر کیا اثر ہوا ہوگا۔ اسی اثر کا آپ کو یقین تھا کہ صحابہ کی جماعت کو خطاب کر کے بطور پیشگوئی آپ فرماتے:۔

تسمعون، ویسمع منکم ویسمع من الذین یسمعون منکم (ابوداؤد) ...... (مستدرک) | تم مجھ سے سن رہے ہو تم سے بھی سنا جائیگا اور جن لوگوں نے تم سے سنا ہے ان سے بھی لوگ سنیں گے،

نہ صرف عام مجامع میں یہ اعلان کیا جاتا تھا بلکہ ملک کے مختلف اطراف سے وقتاً فوقتاً وفود کے جو سلسلے دربار نبوت میں حاضر ہوا کرتے تھے عموماً ان کو ایسی جگہ ٹھیرایا جاتا تھا، جہاں سے "اس واقعہ" کے معائنہ اور مشاہدہ کو ان کو کافی موقعہ مل سکتا ہو، جس کے وہ مورخ بنائے جاتے تھے۔ پھر جو کچھ سنانا اور دکھانا مقصود ہوتا وہ سنایا اور دکھایا جاتا تھا۔ آخر میں رخصت کرتے ہوئے حکم دیا جاتا، جیسا کہ بخاری میں ہے

احفظوھن واخبروھن من وراءکم | ان باتوں کو یاد رکھو اور جو لوگ تمھارے پیچھے ہیں انھیں ان سے مطلع کرتے رہنا

حافظ ابن حجر اس فقرہ کی شرح میں لکھتے ہیں۔

یشمل من جاؤا من عندھم وھذا باعتبار المکان ویشمل من یحدث لھم من الاولاد وغیرھم | یہ ان لوگوں کو بھی شامل ہے، جن کے پاس سے یہ لوگ آئے تھے اور یہ بات مکان کے لحاظ سے ہے اور ان آئندہ نسلوں کو بھی شامل ہے

[1] یعنی اے اللہ کیا میں نے پہونچا دیا کیا میں نے پہونچا دیا کیا میں نے پہونچا دیا تین دفعہ ارشاد فرمایا ۱۲

وھذا باعتبار الزمان (فتح الباری) | جو بعد کو پیدا ہونے والی ہیں اور یہ بات زمانہ کے حساب سے ہوگی۔

اور یہ تو سب ہی جانتے ہیں، کہ اسلام کے دائرہ میں جو قبائل داخل ہوتے جاتے تھے دربار رسالت سے ان کی تعلیم و تلقین کے لئے ذمہ دار اصحاب کو بھیجا جاتا تھا، حکم دیا جاتا تھا، کہ جو کچھ تم نے ہم سے سیکھا ہے، وہ انھیں بھی جاکر سکھاؤ، صرف استحبابی احکام ہی نہیں بلکہ قرآن کی آیت:-

ان الذین یکتمون ما انزلنا من البینات والھدیٰ من بعد ما بیناہ للناس فی الکتاب اولٰئک یلعنھم اللہ ویلعنھم اللاعنون

جو لوگ چھپاتے ہیں اس چیز کو جسے ہم نے اتارا ہے، اور جو کھلی کھلی باتوں اور سوجھ بوجھ (ہدایت) کی باتوں پر مشتمل ہے اور اس کے بعد چھپاتے ہیں جب انسانوں کے لئے کتاب میں ہم نے اسے بیان کردیا ہے، یہی لوگ ہیں، جن پر خدا بھی لعنت کرتا ہے اور لعنت کرنے والے بھی لعنت کرتے ہیں،

کی بنیاد پر صحابہ کرام جس تاریخ کی نشر و اشاعت کے ذمہ دار ٹھرائے گئے تھے اس کا چھپانا گناہ خیال کرتے تھے۔ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ حدیث بھی روایت کرتے تھے:-

من سئل عن علم ثم کتمہ الجم یوم القیامۃ بلجام من نار (ابو داؤد و ترمذی)

جو کوئی پوچھا جائے کسی علم کی بات سے اور اسے وہ چھپائے تو قیامت کے دن آگ کی لگام اسے پہنائی جائے گی

اور اسی کا نتیجہ تھا کہ سکرات میں مبتلا ہیں، لیکن بعض صحابہ سے یہ مروی ہے کہ اس وقت بھی محض اس خیال سے کہ "علم کے چھپانے" کا الزام ان پر نہ رہ جائے حدیث بیان کرتے جاتے تھے۔ (بخاری و مسلم و عام صحاح)

(۵)

ان تمام امور کے ساتھ اس کو بھی پیش نظر رکھنا چاہیئے کہ جس ذات گرامی کے ہر قول کو وہ خدا کی بات اور خدا کا حکم سمجھتے تھے، اسی نے بار بار بکثرت، ان کی فطرت میں مشہور حدیث من کذب علی متعمدا فلیتبوء مقعدہ من النار[1] کے تہدیدی خوف کو اس طرح راسخ کرنے کی کوشش کی تھی، کہ جتنے صحابیوں سے یہ حدیث مروی ہے، مشکل ہی سے چند حدیثیں اس کی ہم پایہ ہوسکتی ہیں اور یوں بھی قرآن کی رو سے یہ اتنی بدیہی بات تھی، کہ جس قسم کے ایمان و یقین کی دولت سے یہ لوگ سرفراز تھے، اس فعل کی جرأت کس کو ہوسکتی تھی۔ جس اعلیٰ کردار کے وہ مالک تھے یوں بھی ان سے غلط بیانی کی توقع کون کرسکتا ہے، ماسوا اس کے جب وہ جانتے تھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کسی امر کا انتساب دراصل اس چیز کو خدا کی طرف منسوب کرنا ہے، اور ایک جگہ نہیں، بے شمار آیتوں میں قرآن نے مفتری علی اللہ (خدا پر جھوٹ باندھنے والے) کو سب سے بڑا ظالم قرار دیا ہے، کیا قرآن پر تازہ ایمان رکھنے والوں کے لئے اس کے بعد اس کی کوئی گنجایش ہوسکتی تھی، کہ وہ قصداً العیاذ باللہ اپنے محبوب رسول پر جھوٹ باندھیں، یہی وجہ ہے کہ

[1] جو مجھ پر قصداً جھوٹ باندھے گا چاہیئے کہ اپنا ٹھکانہ آگ میں تیار کرلے ۱۲

بعض صحابہ تو جس وقت "حدیث" بیان کرنے کے لئے بیٹھتے، قبل کچھ بیان کرنے کے من کذب علی متعمداً والی حدیث کو ضرور پڑھ لیتے تھے، تاکہ ان میں اپنی نازک تاریخی ذمہ داری کا احساس بیدار اور تازہ ہو جائے۔ امام احمد بن حنبل اپنی مسند میں راوی ہیں، کہ خصوصیت کے ساتھ ذخیرۂ حدیث کے سب سے بڑے راوی یعنی حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ کا یہ دوامی قاعدہ تھا کہ:۔

یبتدء حدیثہ بان یقول قال رسول اللہ الصادق المصدوق ابو القاسم صلی اللہ علیہ وسلم من کذب علی متعمداً فلیتبوء مقعدہ من النار

(صابہ ج ۷)

اپنی حدیث جس وقت بیان شروع کرتے تو کہتے۔ "فرمایا رسول اللہ صادق و مصدوق ابو القاسم صلی اللہ علیہ وسلم نے جس نے مجھ پر قصداً جھوٹ باندھا چاہئے کہ اپنا ٹھکانہ آگ میں تیار کر لے"

اس کے بعد جو کچھ بیان کرنا چاہتے تھے، بیان فرماتے۔

(۶)

اسی کے ساتھ ہمیں یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جو کچھ صحابہ کو سناتے تھے یا کرکے دکھاتے تھے، اس کے متعلق صرف یہ حکم دے کر کہ تم بھی ان کو یاد رکھنا یا کرنا، محض اسی پر کفایت نہیں فرماتے تھے، بلکہ اس کی باضابطہ نگرانی فرماتے تھے کہ اس حکم کی کس حد تک تعمیل کی جاتی ہے، مہمات شریعت اور اساسی امور کے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نگرانی کا کیا حال تھا اس کا اندازہ آپ کو اس سے ہو سکتا ہے کہ ایک معمولی بات یعنی ایک صحابی کو یہ بتاتے ہوئے کہ جب سونے لگو، تو یہ دعا پڑھ کر سویا کرو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بتانے کے بعد فرمایا کہ اچھا میں نے کیا کہا اسے دہراؤ، صحابی نے "آخری فقرہ" امنت بکتابك الذی انزلت و نبیك الذی ارسلت[۱] میں "نبیك" کے لفظ کو "رسولك" کے لفظ سے بدل دیا، جو تقریباً ہم معنی الفاظ ہیں۔ یعنی بجائے نبی کے رسول کا لفظ استعمال کیا، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زبان مبارک سے چونکہ "نبیك" کا لفظ ادا فرمایا تھا، حکم ہوا کہ میں نے یہ نہیں کہا، وہی کہو جو میں نے بتایا۔ ظاہر ہے کہ قانونی طور پر سونے کی دعا کی حیثیت ان شرعی حقائق کی نہیں ہے، جنہیں فرض و واجب کے ذیل میں شمار کیا جاتا ہے، لیکن باوجود اس کے ایک ایک لفظ پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ایسی سخت نگرانی تھی۔ بخاری میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عام گفتگو کے متعلق یہ دوامی عادت بیان کی جاتی ہے کہ انہ[۲] کان اذا تکلم بکلمةٍ اعادھا ثلثا۔ غالباً اس میں بھی زیادہ تر دخل اسی مقصد کو تھا۔ فعل کے متعلق مشہور حدیث ہے کہ ایک صاحب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے نماز پڑھ رہے تھے، حالانکہ نماز کے تمام ارکان یعنی قیام رکوع وسجود میں کوئی کمی نہیں ہوئی تھی، صرف ذرا عجلت اور جلد بازی سے کام لے رہے تھے، نماز سے جب وہ فارغ ہوئے تو وہ یہ سن رہے تھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم صلِ فانّك لم تُصلِّ (پھر نماز پڑھو تم نے نماز نہیں پڑھی)

---

[۱] ایمان لایا میں اس کتاب پر جو تو نے اتاری اور اس نبی پر جسے تو نے بھیجا۔ [۲] جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کوئی بات کرتے تو اس کو تین دفعہ دہراتے۔

ارشاد فرما رہے ہیں انہوں نے پھر نماز دہرائی، لیکن اب بھی اس میں وہ وقار اور طمانیت نہیں پیدا ہوئی تھی جس سے صَلُّوا كَمَا رَأَيْتُمُونِي أُصَلِّي (ٹھیک اسی طرح نماز پڑھو جس طرح مجھے پڑھتے ہوئے دیکھتے ہو) کے حکم کی تعمیل ہوتی۔ الغرض تیسرے بار سمجھانے کے بعد انہوں نے اپنی نماز جیسی کہ چاہیے ادا کی۔ نماز میں سکینت و اطمینان کی حیثیت اکثر فقہاء امصار کے نزدیک فرض و واجب کی نہیں ہے، لیکن جن لوگوں کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی پوری زندگی، اس کے ہر پہلو، ظاہر و باطن اندر اور باہر کا مورخ بنانا چاہتے تھے، آن پر آپ ان معاملات کے متعلق بھی پوری نگرانی رکھتے تھے۔ کیا دنیا میں کوئی ایسی تاریخ بھی موجود ہے، جس نے اپنے مورخین کی اور راویوں کے بیان و ادا کی خود نگرانی کی ہو اور ایسی سخت کڑی نگرانی!

تدوین حدیث کے سلسلہ میں جن امور کی تعبیر میں نے غیر معمولی خاص قدرتی عوامل سے کی ہے، اور عام تاریخی سرمایہ سے تاریخ کے اس حصہ جن بنیادوں پر میں امتیاز کا مدعی ہوں، اس کے ٹھوس اور خصوصی اسباب تو یہ تھے۔

لیکن خصوصیتوں کا یہ قصہ ان ہی پر ختم نہیں ہو جاتا۔ جن بزرگوں کے ہاتھوں علم کے اس حیرت انگیز ایوان کی تعمیر ہوئی، ابھی ان کی اور بھی چند باتیں قابل لحاظ ہیں میرا مقصد یہ ہے کہ ان تمام ذمہ داریوں کے ساتھ جن کا ذکر آپ سن چکے قرآن اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پیغمبرانہ دعوت جو شاعرانہ زبان میں نہیں بلکہ فی الحقیقت مولانا حالی مرحوم کی اس بلیغ تعبیر کی صحیح تصویر تھی۔

وہ بجلی کا کڑکا تھا یا صوت ہادی عرب کی زمین جس نے ساری ہلا دی
ایک آواز میں سوتی بستی جگا دی نئی اک لگن سب کے دل میں لگا دی

اس نے صحابہ کرام کی ذہنی قوتوں، اور عملی توانائیوں میں نئی زندگی کی روح بھر کر آن میں ایسی ہلچل پیدا کر دی تھی کہ بقول گاڈفری ہگنس "عیسائی اس کو یاد رکھیں تو اچھا ہو کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغام نے وہ نشہ آپ کے پیروؤں میں پیدا کر دیا تھا جس کو عیسیٰ کے ابتدائی پیروؤں میں تلاش کرنا بے سود ہے۔"

اور میں تو کہتا ہوں کہ عیسائی ہی نہیں بلکہ دنیا کو چاہیئے کہ یہ یاد رکھے کہ اس نشہ کی نظیر نہ اس کے پہلے دیکھی گئی اور نہ اس کے بعد دیکھی جا سکتی ہے۔ عروہ بن مسعود ثقفی نے جو اس وقت تک مسلمان نہیں ہوئے تھے، صلح حدیبیہ کے موقع پر قریش کو صحابہ کرام کے اس نشہ کی خبر کتنے صحیح الفاظ میں دی تھی۔

اي قوم واللّٰه لقد وفدت على الملوك و وفدت على قيصر وكسرى والنجاشي واللّٰه ان رأيت ملكاً قط يعظمه اصحابه ما يعظم اصحاب محمد محمداً واللّٰه ان تنخم نخامةً الا وقعت في كف رجل منهم فدلك بها وجهه وجلده واذا

لوگو! خدا کی قسم مجھے بادشاہوں کے دربار میں بھی باریابی کا موقع ملا ہے قیصر (روم) کسریٰ (ایران) نجاشی (ابی سینیا) کے سامنے حاضر ہوا ہوں قسم خدا کی میں نے کسی بادشاہ کو نہیں دیکھا جس کی لوگ اتنی عظمت کرتے ہوں، جتنی عظمت محمد کے ساتھی محمد کی کرتے ہیں، قسم خدا کی جب وہ بلغم تھوکتے ہیں تو نہیں گرتا ہے

مرهم ابتدروا امره واذا توضأ كادوا يقتتلون على وضوءه واذا تكلم خفضوا اصواتهم عنده وما يحدون اليه النظر تعظيما له (بخاری)[لہ]

وہ لیکن ان کے ساتھیوں میں سے کسی آدمی کے ہاتھ میں، پھر وہ اپنے چہرہ اور اپنے بدن پر اسے مل لیتا ہے، محمدؐ جب کسی بات کا انہیں حکم دیتے ہیں اس کی تعمیل کی طرف وہ جھپٹ پڑتے ہیں، جب محمد وضو کرتے ہیں، تو اس وقت ان کے وضو کے پانی پر آپس میں الجھ پڑتے ہیں جب محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) بات کہتے ہیں تو ان کی آوازیں پست ہو جاتی ہیں محمد کو نگاہ بھر کر ان کی عظمت کی وجہ سے وہ نہیں دیکھ سکتے۔

یہ دوست کی نہیں، بلکہ ایک دانا دشمن کی شہادت ہے، اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ جس جماعت کے نشہ کا یہ حال ہو، جو احکام و اوامر تو بڑی چیزیں ہیں تھوک اور وضو کے غسالہ تک کو اپنے اندر پیوست کرتے تھے، اور ایک دوسرے پر سبقت کرنے میں گویا باہم الجھ پڑتے تھے، ایک ایک موے مبارک کے متعلق یہ حال تھا کہ بخاری میں ہے کہ حضرت عبیدہ تابعی جنھیں حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ خادم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک موئے مبارک ہاتھ آگیا تھا، فرماتے

لأن تكون عندی شعرة منها احب الی من الدنيا ومافيها۔

میرے پاس کسی بال کا ہونا، اس سے زیادہ محبوب ہے کہ دنیا اور جو کچھ دنیا میں ہے وہ سب کچھ میرے یہاں ہو۔

جن لوگوں کا تعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اس قسم کا ہو، انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ کی "زندگی" جس کے خدا کی طرف سے بھی وہ محافظ اور مبلغ قرار دیے گئے تھے، سوچنا چاہیے کہ ان ہی لوگوں نے اس "زندگی" کی نگہداشت میں کس اہتمام کس انہماک اور توجہ سے کام لیا ہوگا، ایک ایک موے مبارک بھی جن کے نزدیک دنیا و مافیہا سے زیادہ محبوب تھا ان ہی کے نزدیک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و افعال کی غور کرنا چاہیے کہ کیا قیمت تھی۔ اب ایک طرف حضرات صحابہ کرام کے ان جذباتی طوفانوں کو اپنے سامنے رکھیے، اور اسی کے ساتھ اس پر بھی غور کیجیے، کہ جس عہد میں اس "تاریخ" کی حفاظت و اشاعت کی ذمہ داری قدرت کی جانب سے انھیں سپرد ہوئی تھی، اس زمانہ میں ان کے پاس کسی قسم کا کوئی دماغی مشغلہ قرآن مجید کے سوا موجود نہ تھا۔ عرب جاہلیت کی تاریخ ہم سب کے سامنے ہے، کون نہیں جانتا کہ اس حیرت انگیز مدہش اچانک دماغی بیداری کے زمانہ سے پہلے وہ اور ان کا ملک تقریباً ان عام علمی اور ذہنی مشغلوں سے مفلس تھا، جن کا چرچا عموماً حضارت وتمدن کے ساتھ وابستہ ہے۔ اگرچہ میں اس کا تو قائل نہیں جیسا کہ عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ عرب کے ایام جاہلیت کا یہ مطلب ہے کہ ان کی حالت ہندوستانی بھیلوں اور گونڈوں کی تھی، نہ صرف قریش بلکہ اور بھی دوسرے قبائل کے صحیح حالات سے

لہ اس حدیث کے مختلف فقرے صحاح کی کتابوں اور سیرت کی کتابوں میں بھی پائے جاتے ہیں۔

جو واقف ہیں، وہ ایک سکنڈ کے لئے یہ تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہو سکتے بلکہ جیسا کہ عنقریب آپ کے سامنے اس کی تفصیل آئے گی کہ "جاہلیت" کا یہ ترجمہ کہ وہ لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے عربی زبان اور قرآن مجید جس میں یہ لفظ غالباً پہلی دفعہ استعمال ہوا اس کے عام محاوروں کے خلاف ہے عربوں کی جہالت کا جو یہ مطلب سمجھتا ہے، وہ در اصل واقعات سے جاہل ہے، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ لکھنے پڑھنے کے سلسلہ میں عرب کا بھی اس زمانہ میں تقریباً وہی حال تھا، جو عموماً اس زمانہ میں اگر کامل متمدن ممالک نہیں، تو نیم متمدن ممالک کا تھا، یعنی جس طرح قدیم زمانہ میں تقریباً ہر ملک اور قوم میں لکھنے پڑھنے والوں کا ایک خاص پیشہ ور طبقہ ہوتا تھا، اور عام پبلک کو اس سے چنداں تعلق نہیں تھا، نہ اس کی اتنی اہمیت تھی، کسی ملک میں یا دریوں کسی میں موبدوں کسی میں برہمنوں، الغرض اسی قسم کے لوگوں کے ساتھ یہ کام مخصوص تھا، اگر بالکلیہ نہیں تو قریب قریب عرب کا بھی یہی حال تھا، آئندہ یہ بتایا جائے گا کہ عرب میں بھی، ایک خاصی تعداد خوندوں اور نویسندوں کی تھی، نہ صرف مرد بلکہ ایام جاہلیت میں بھی بعض لکھی پڑھی عورتیں پائی جاتی تھیں، شرفا ہی نہیں بلکہ غلاموں میں بھی ایسے افراد موجود تھے، میں اپنے اسی دعوی کی تھوڑی بہت تفصیل آگے بھی کروں گا، لیکن بایں ہمہ اسی کے ساتھ یہ بھی صحیح ہے، کہ معمولی نوشت وخواند جو چند گنے چنے لوگوں تک محدود تھی، اس سے آگے، عربوں کی ذہنی اور دماغی قوتوں کے لئے اس زمانہ میں کوئی خاص اہم خوراک موجود نہ تھی اور تھوڑی بہت اگر کچھ تھی بھی، تو وہ بہت ادنی درجہ کی تھی ان کا سب سے بڑا دماغی مشغلہ شعر و شاعری کا تھا یا باہم ایک دوسرے پر تفاخر کے لئے یا توہین کے لئے، وہ انساب کے علم سے بھی دلچسپی رکھتے تھے، اور بھی ابتدائی نوعیت کی کچھ فنی چیزیں محدود سے چند افراد کے پاس تھیں، لیکن اسلام نے شریفانہ کردار کا جو معیار مقرر کیا تھا اس میں گانے بجانے، رقص و سرود، مے نوشی مفاخرت یا مشاجرت وغیرہ کی کوئی گنجائش نہیں رکھی تھی، ان کی خمری و فخری فحش و مبالغہ والی شاعری کی بھی اس نے کوئی حوصلہ افزائی نہیں کی تھی۔ ایک طرف عربوں کی ذہنی اور علمی بھوک کی وہ شدت، اور دوسرے طرف یوں ہی ان کے ملک کا دماغی مشغلوں سے خالی ہونا چند بچی کھچی ادنی درجہ کی کچھ غذائیں ان کے پاس جو موجود تھیں، ان کا بھی ان کے سامنے سے ہٹ جانا اور سب کو ہٹا کر اس شدید دماغی تشنگی کے وقت میں ان کے سامنے صرف قرآن اور مبلغ قرآن صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا علم اور فن کے رنگ میں پیش ہونا اسی کی کمی بیشی پر سوسائٹی میں افراد کے مدارج کا قدرتاً مقرر ہو جانا، غور کرنے کی بات ہے، کہ ایسے ماحول میں ہر چیز سے ٹوٹ کر ہمہ تن ان ہی دو چیزوں میں اگر وہ ڈوب گئے تھے، تو آپ ہی اندازہ کیجئے کہ اس کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا، ایسی حالت میں یقیناً یہی ہو سکتا تھا اور یہی ہو کر رہا، بلکہ اسی کے ساتھ ہم جب اس واقعہ کو بھی ملا لیتے ہیں، کہ فاقہ کش غریب اور مفلس عرب جو اپنے ملک کے خاص حالات کے لحاظ سے ایام جاہلیت میں معاشی حیثیت سے انتہائی سخت کوششیوں کا شکار بنا ہوا تھا، تعیش و رفاہیت کی زندگی کا تو کیا ذکر ہے، ضروری معاشی رسد کی تکمیل میں بھی ان کو آسمان و زمین کے قلابے ملانے پڑتے تھے، ساری عمر عرب کے چٹیل ریگستانی اور سنگستانی صحراؤں میں بیچارے صرف اس لئے کہ دو وقت کی خشک روٹی خواہ کسی شکل میں ہو مل جائے اور وہ بھی بہ مشکل میسر آتی تھی، لیکن اسلام نے ایک طرف

ان کے باطنی قویٰ، اور ذہنی طلب میں یہ طوفان برپا کیا۔ دوسری طرف پندرہ بیس سال کی مدت میں جسمانی اور معاشی مطالبوں کے لئے رسد کا ایک ایسا بے پناہ سمندر ان کے اس غیر آباد، قلیل التعداد ملک میں ٹھاٹھیں مارنے لگا کہ سچ یہ ہے کہ اس کی نظیر بھی عرب کے آسمانوں نے نہ اس سے پہلے دیکھی تھی، اور نہ آج تک پھر وہ تماشا دیکھنا اسے نصیب ہوا۔ اُن خزائن اور دفائن غنائم اور نفل کے سوا جو قرنہا قرن سے کسرائے ایران کے خزانے میں جمع ہو رہے تھے، یا وہ دولت جو زمین فرعون (مصر) سے یا ارض شام سے آئی تھی ستون فی ستین (یعنی ساٹھ گز لمبا ساٹھ گز چوڑا) والا جواہر نگار بہار نامی ایرانی غالیچہ جس کے تمام نقش و نگار جن کا تعلق مختلف مناظر اور موسموں سے تھا انمول جواہرات کے ذریعہ سے کاڑھے گئے تھے، کسریٰ کا وہ مرصع تاج جو اپنے قیمتی اور وزنی پتھروں کی وجہ سے بجائے سر پر رکھنے کے سونے کی زنجیر سے لٹکا دیا جاتا تھا اور کج کلاہ ایران اسی میں اپنا سر داخل کر دیتا تھا، کھجوروں کے تنہ پر مدینہ میں جو مسجد کھڑی تھی اس میں یکے بعد دیگرے یہ سب کچھ ہر طرف سے چلا آ رہا تھا۔ خوراکی رسد کا یہ حال تھا کہ عام مادہ کے قحط میں حضرت عمرؓ نے مصر کے والی عمرو بن عاص کو غلہ کے لئے جب لکھا تو انہوں نے جواب دیا کہ اونٹوں کی ایسی قطار غلہ سے لاد کر پایہ تخت خلافت میں بھیجتا ہوں جس کا پہلا اونٹ مدینہ میں ہوگا اور آخری اونٹ کی دُم میرے ہاتھ میں ہوگی۔ یہ سب تو وقتی دولت تھی، اصل چیز دیکھنے کی یہ ہے کہ دس پندرہ سال کے عرصہ میں حجاز یمن یمامہ بحرین عراق ایران شام مصر کے لاکھوں مربع میل کے جو علاقے فتح ہوئے، جن میں بجز حجاز کے تقریباً اکثر حصہ صرف ثروت و دولت کا بے پناہ سرچشمہ تھا، مصر سے پہلا خط عمرو بن العاص کا حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ کے نام آیا تھا کہ ایک ایسی زمین پر خدا نے قبضہ دلایا ہے، جو اچانک موتی کی طرح سفید اور پھر عنبر کی مانند سیاہ اور اسی کے بعد ہیرے کے مانند سرسبز ہو جاتی ہے، ان سارے علاقوں کا ایک بڑا حصہ اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جاگیروں پر تقسیم کر دیا گیا تھا۔ کون اندازہ کر سکتا ہے کہ اموال غنیمت کے حصوں کے ساتھ ساتھ ہر صحابی کے گھر میں سالانہ کتنی دولت ان جاگیروں سے آتی تھی، تاریخوں میں اس کی تفصیل موجود ہے، ذہبی نے لکھا ہے کہ عہد فاروقی تک پہونچتے پہونچتے مدینہ کے بازار کی یہ حالت ہو گئی تھی کہ عہد نبوت میں جس گدھے کی قیمت پندرہ درہم تھی، اب وہ پندرہ سو میں ملتا تھا۔ بخاری کی مشہور روایت ہے کہ حضرت زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ نے غابہ کی زمین جو مدینہ کے پاس ہے کل ایک لاکھ ستر ہزار درہم میں مول لی تھی، لیکن ان کے بیٹے حضرت عبد اللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ نے اسے جب فروخت فرمایا تو اس کی قیمت سولہ لاکھ ملی تھی حضرت زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ جو اپنی داد و دہش کی وجہ سے مرنے کے وقت ایک پیسہ نہ چھوڑ سکے، لیکن مکانات اور زمین کی شکل میں جو ان کی جائداد تھی، اس کی قیمت جیسا کہ بخاری میں ہے پچاس کرور دو لاکھ لگائی گئی تھی، حضرت عبد الرحمٰن بن عوف نے انتقال کے وقت جو ترکہ چھوڑا اس کا حساب تو بہت طویل ہے، لیکن فراخی و فراغبالی کا اس سے اندازہ ہو سکتا ہے، کہ اپنے ثلث مال سے انھوں نے وصیت کی تھی کہ ہر بدری صحابی جن کی تعداد اس وقت تقریباً ایک سو کے قریب رہ گئی تھی، چار چار سو دینار دئے جائیں، صحابہ اور صحابہ کی اولاد جو وہی عرب تھے جن کے پاس نہار کے اوپر

رو کے لئے کوئی لفظ ہی نہ تھا، لاکھوں اور کروڑوں کی تعداد میں ایک ایک وقت میں صرف خیرات کرتی تھی، یا اپنے
نے جلنے والے احباب و اعزہ کو دے ڈالتی تھی عام تاریخی کتابوں میں بہ کثرت ان کی داد و دہش کے واقعات کا ذکر ہے
بخوف طوالت ان کی تفصیل ترک کی جاتی ہے۔

بہرحال مجھے حدیث کے ابتدائی رواۃ یا اس تاریخ کے ابتدائی مورخین کی دولت اور آمدنی کی تفصیل مقصود
ں ہے بلکہ صرف یہ دکھانا ہے کہ گزشتہ بالا حالات کے ساتھ جب ان کی معاشی فراغبالی کو بھی پیش نظر رکھا جائے اور پھر
سوچا جائے کہ علم کی پیاس کی جو آگ ان کے دل میں لگائی گئی تھی، اس کی تسکین کے لئے ان کے پاس کتنے وسیع مواقع قدرت
نے مہیا کر دے تھے، ہو سکتا تھا اور تھوڑے دنوں بعد ہو بھی گیا کہ مال و دولت کی اس فراوانی نے ان ہی صحابیوں کی
وسری اور تیسری پشت میں ان امیرانہ مشاغل کو پیدا کر دیا تھا، جو اس کے لازمی[ل] نتائج ہیں لیکن ہم جن لوگوں سے بحث
ر رہے ہیں، ان میں ایک ایسا روحانی اور اخلاقی انقلاب پیدا ہو چکا تھا کہ وہ اتنی آسانی کے ساتھ کردار کے اس بلند
سلامی معیار کو نہیں چھوڑ سکتے تھے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت نے ان میں پیدا کر دیا تھا اور اس کی شہادت
ن کی زندگی سے ملتی ہے، بجائے رنگ رلیوں کے ان کے مصارف وہی تھے، جو اسلام نے ان کے لئے مقرر کیا تھا
ہر ایک نیکی کرنے میں ایک دوسرے پر سبقت کرتا تھا۔ وہی عبد الرحمن بن عوف جن کا ذکر ابھی گذرا، مشہور بات ہے کہ
اپنے ذاتی روپیے سے خرید خرید کر انھوں نے تقریباً تیس ہزار غلاموں کو آزاد کیا تھا، اور از یں قبیل سب ہی کا یہی حال
تھا، صرف یہی نہیں بلکہ ان میں اکثر خصوصاً جن کا زیادہ میلان تعلیم قرآن اور تدوین حدیث کی طرف تھا، ان کی تمام جائدادوں
اور مالی ذرائع کی نگرانی بھی قہرمانوں اور قیموں کے سپرد تھی، وہی وصول کرتے تھے اور وہی اس کا حساب کتاب رکھتے تھے
ان بزرگوں کو اپنے کام کے سوا اور کسی بات سے کوئی سروکار نہ تھا، حضرت ابن عباس جو ترجمان القرآن حبر الامۃ وغیرہ
عالمانہ القاب سے ملقب ہیں اور تدوین حدیث میں ان کا بھی بڑا حصہ ہے، ان کے ایک بھائی عبید اللہ کی طبیعت کا میلان
توجود و سخا کی طرف تھا، کہا جاتا ہے کہ معمولی معمولی باتوں پر ہزاروں روپے لوگوں کو دیدے تھے ایک شخص نے ان سے آکر کہا کہ تم پر
میرا حق ہے بولے کیا اس نے کہا کہ تم چاہ زمزم پر پانی پی رہے تھے چہرہ پر دھوپ پڑ رہی تھی میں نے اپنی چادر سے سایہ کر دیا
تھا بولے ہاں تیرا احسان یاد ہے قیم (دارو غہ) کو آواز دی پوچھا تیری تحویل میں اس وقت کتنی رقم ہے؟ دس ہزار درہم نقرئی
اور دو سو طلائی دینار ہیں، اس نے جواب دیا۔ حضرت عبید اللہ نے حکم دیا سب اس شخص کو دیدو، اور یہ ان کا عام حال تھا،
لیکن وہی دولت جسے عبید اللہ اس طریقہ سے خرچ کرتے تھے، ان کے بڑے بھائی حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ
علم کی نشر و اشاعت پر صرف فرماتے تھے بخاری میں ان کے مشہور شاگرد ابو جمرہ سے مروی ہے کہ صرف اس لئے تاکہ

ل قاضی ابو یوسف نے کتاب الخراج میں روایت درج کی ہے کہ فارس کے غنائم جن میں الجواہر واللولو، والذہب والفضۃ کی کثیر مقدار تھی حضرت عمر کے سامنے جب ان کا ڈھیر لگایا گیا تو رونے لگے
اور فرمایا کہ جس قوم کو یہ چیزیں ملیں بالآخر ان میں بغض و عداوت کا پیدا ہونا ضرور ہے ۱۲

ابن عباس کی آواز[1] دوسروں تک وہ پہونچایا کریں حضرت نے اپنی آمدنی کا ایک حصہ ابو جمرہ کے لئے مخصوص فرمادیا تھا اور یہ حال تو اس وقت کا ہے جب مسند درس پر جلوہ فرما ہو چکے تھے، لیکن یہی ابن عباس باوجود اس ثروت و دولت کے اپنے طلب حدیث کے دنوں کو یاد کرکے فرماتے

كنت لآتي الرجل في الحديث يبلغني انه سمعه من رسول الله صلى الله عليه وسلم فاجده قائلا فاتوسد ردائي على بابه تسفي الريح التراب على وجهي حتى يخرج فاذا خرج قال يا ابن رسول الله صلى الله عليه وسلم مالك فاقول بلغني حديث عنك انك تحدثه عن رسول الله صلى الله عليه وسلم فاحببت ان اسمعه منك فيقول هلا بعثت الي حتى اتيك فاقول انا احق اليك

(دارمی)

حدیث کے طلب میں میں کسی ایسے آدمی کے پاس آتا جن کے متعلق مجھے خبر ملتی کہ انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کچھ سنا ہے اور پاتا کہ وہ دوپہر میں آرام کر رہے ہیں، تو اپنی چادر کو تکیہ بنا کر ان کے دروازے پر پڑ جاتا ہوائیں دھول اڑا اڑا کر میرے چہرے پر ڈالتیں، اور میں اسی حال میں پڑا رہتا، تا آں کہ خود وہ آدمی باہر نکل آتے، باہر نکل کر (جب مجھے دیکھتے) تو کہتے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صاحبزادے آپ کہاں تشریف لائے ہیں، میں کہتا کہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے تم کوئی حدیث روایت کرتے ہو، میں نے چاہا کہ اس حدیث کو تم سے سنوں، جواب میں وہ صاحب کہتے آپ کسی کو بھیج دیے ہوتے میں خود حاضر ہو جاتا میں کہتا کہ تمھارے پاس حاضر ہونے کا مستحق میں ہوں۔

صحابہ کرام اور ان کے تلامذہ تابعین تبع تابعین نیز دوسرے ائمہ اور بزرگوں نے اس فن کی تدوین میں جب کیا مشقتیں برداشت کی ہیں، ان کا تفصیلی ذکر آگے آرہا ہے، اس مثال کے پیش کرنے کی غرض اس وقت صرف یہ تھی کہ دولت وامارت نے ان کو امیرانہ چونچلوں میں الجھا نہیں دیا تھا بلکہ ان میں کتنے ایسے تھے جن کی آمدنی کا اکثر حصہ اسی علم کی خدمت میں صرف ہوتا تھا۔ مردوں ہی میں نہیں بلکہ عورتوں میں بھی اس علمی ولولہ کی یہ کیفیت تھی کہ معمولی معمولی عورتیں محض اس لئے کہ ان کا بچہ فن حدیث کا عالم ہو جائے، ہزار ہا روپے خرچ کر ڈالتی تھیں، اس موقع پر عہد صحابہ کا قصہ یاد آیا کہ فروخ نامی ایک معمولی آدمی تھے، آزاد شدہ غلاموں کے طبقہ سے ان کا تعلق تھا، غالبًا فوج میں ملازم تھے، لیکن اس وقت مدینہ کی دولت کا یہ حال تھا کہ ادنیٰ ادنیٰ غلام سپاہی بھی تیس تیس چالیس ہزار دینار طلائی سکہ پس انداز کر سکتا تھا تقریبًا سیر کی اکثر کتابوں میں یہ واقعہ درج ہے کہ اپنا سارا اندوختہ بیوی کو سپرد کرکے وہ کسی نوکری پر طویل مدت کے لئے باہر چلے گئے، پندرہ بیس سال کے بعد واپسی ہوئی، جس وقت جا رہے تھے ان کی بیوی حاملہ تھیں پیچھے میں لڑکا پیدا ہوا، نام ربیعہ رکھا گیا، اس نیک دل خاتون کے علمی ذوق کا حال سنئے، کہ انھوں نے شوہر کے سارے اندوختہ کو بچے کی تعلیم و تربیت پر ختم کر دیا۔ اور اس زمانہ کی تعلیم کیا تھی

---

[1] بعضوں کا خیال یہ بھی ہے کہ ابو جمرہ چونکہ فارسی جانتے تھے اس لئے حضرت ابن عباس کی باتوں کا ترجمہ عربی نہ جاننے والوں کو سنا دیا کرتے تھے ممکن ہے کہ دونوں کام کرتے ہوں ۱۲

یہی قرآن و حدیث کی خدمت، فروخ جب گھر واپس ہوئے تو لڑکا جوان ہو کر نہ صرف عالم بلکہ مسجد نبوی کے حلقہائے درس کے ایک ممتاز ترین معلم کی حیثیت حاصل کر چکا تھا۔ امام مالک، امام اوزاعی سفیان ثوری جیسے لوگ جنھیں بعد کو امت میں امامت کا منصب عطا ہوا، وہ ان کے شاگردوں میں شریک تھے۔ فروخ باہر سے بھی چار پانچ ہزار روپیہ کما کر لائے تھے، وہ تین دن کے بعد بیوی سے اپنے گذشتہ پس انداز کا حساب دریافت کیا، بولیں کہ سب کو میں نے گاڑ رکھا ہے کچھ دم لے لو، تو انھیں نکالوں، لیکن ذرا کل تم صبح کی نماز کے بعد مسجد نبوی کے حلقہائے درس میں گشت تو لگانا۔ دوسرے دن انھوں نے یہی کیا، ایک حلقہ میں پہونچے تو خدا کی قدرت نظر آئی کہ ان کے لڑکے کو چاروں طرف سے شاگردوں کا حلقہ گھیرے ہوئے ہے۔ خوشی کے مارے پھولے نہ سمائے، گھر پہونچے اور بیوی سے حال بیان کیا، بیوی نے کہا کہو روپیہ لینا چاہتے ہو یا ایسا عالم لڑکا، میں نے تمھارے روپے اسی کی تعلیم پر خرچ کر دئے، فروخ نے اپنی بیوی کی تحسین کی۔

علم حدیث کی تفصیل و تدوین اشاعت و نشر میں عہد صحابہ اور اس کے بعد لوگوں نے کتنی حیرت انگیز مالی قربانیاں کی ہیں اس کے لئے ایک مستقل مقالہ کی ضرورت ہے میں اس وقت صرف دماغوں کو ادھر متوجہ کرنا چاہتا ہوں کہ منجملہ دیگر اسباب کے عہد صحابہ کی معاشی فراغبالی کو بھی دنیا کی تاریخ کے اس عجیب حصہ کی حفاظت میں غیر معمولی دخل ہے اور یہ سچ بھی ہے کہ جو کام ؎

دو یار زیرک و از بادۂ کہن دو منے   فراغتے و کتابے و گوشۂ چمنے

کے ماحول میں انجام پا سکتا ہے، چہ خورد بامداد فرزندم کے سوال کے ہتھوڑوں سے چور دوں میں بجز خاص استثنائی صورتوں کے عموماً ایسے پراگندہ روزوں سے پراگندہ دماغی ہی کی توقع کی جا سکتی ہے؟

خصوصاً جو واقعہ خاص اس علم کے ساتھ پیش آیا ہے، اس کے لئے تو یہ ہونا زیادہ ضروری تھا، کہ چند گنے گنائے آدمیوں سے اس کا تعلق نہیں ہے اگر ایسا ہوتا تو استثنائی قانون کا ممکن تھا کہ ظہور ہوتا لیکن آپ کو آیندہ معلوم ہو گا کہ تاریخ کے اس بسیط اور مختصر حصہ کے بیان کرنے والوں کی تعداد لاکھوں سے متجاوز ہے۔ میرا مقصد یہ ہے کہ اب تک حدیث کے ابتدائی راویوں، یعنی صحابہ کرام کے کیفی حالات و خصوصیات سے میں بحث کر رہا تھا، لیکن اس تاریخ کے مورخوں کا جو مقداری امتیاز ہے، میرے خیال میں تدوین حدیث کے "قدرتی عوامل" میں غور و فکر کے لئے ان کو بھی کچھ کم اہمیت حاصل نہیں ہے، بلکہ ایک لحاظ سے تو یہ اس فن کی ایک ایسی امتیازی شان ہے جس کی نظیر فن تاریخ ہی میں نہیں دوسرے علوم میں بھی بہ مشکل مل سکتی ہے۔ ڈاکٹر اشپرنگر کا یہ مشہور فقرہ کہ "کوئی قوم دنیا میں نہ ایسی گذری نہ آج موجود ہے، جس نے مسلمانوں کی طرح اسماء الرجال کا سا عظیم الشان فن ایجاد کیا ہو، جس کی بدولت آج پانچ لاکھ شخصوں کا حال معلوم ہو سکتا ہو"

اسماء الرجال اور اس کی ضرورت کی تفصیل تو آگے آئے گی، میں اس وقت آپ کی توجہ اس "تاریخ" کے اساسی مورخوں کی تعداد اور ان کی مختلف نوعیتوں کی طرف متوجہ کرنا چاہتا ہوں۔

حدیث کے ابتدائی راویوں کی تعداد غور کیجئے! انصاف سے کہنا چاہیئے کہ علمی دنیا کے ہاتھ میں آج تاریخ کا جتنا کچھ بھی سرمایہ ہے، وہی جس کی تعلیم و تعلم پر جامعات اور یونیورسٹیوں میں اور نشر و اشاعت تدوین و ترتیب پر، تصنیف گاہوں، اور طابع و اشاعتی اداروں میں حکومتوں، اور عام پبلک کی جانب سے بلا مبالغہ ہر سال کروڑہا کروڑ روپیے صرف ہو رہے ہیں، ور ان تمام مصارف کا شمار بہترین علمی خدمتوں میں ہے اور بلا شبہہ یہ بہت بڑی علمی خدمت ہے، لیکن تھوڑی دیر کے لئے اپنے س علمی و فنی سرمایہ کا جائزہ لیجئے، قدیم ہو یا جدید، تاریخ کے کسی حصہ پر اس حیثیت سے نظر ڈالئے کہ ابتداء ان واقعات کے یان کرنے والوں، یا ان کو ریکارڈ کرنے والوں کی تعداد کیا تھی؟ قطع نظر اس سے جیسا کہ میں نے شروع میں کہا تھا کہ واقعات کے بنی شاہدوں کا ان تاریخوں میں بجائے خود ایک پیچیدہ ترین سوال ہے، اور بالفرض اگر خوش قسمتی سے تاریخ کا کوئی حصہ یسا مل بھی جائے جسے ہم خود چشم دید گواہوں کا بیان قرار دے سکتے ہوں، اور اسی کے ساتھ یہ بھی مان لیا جائے کہ ہمیں ان کی ماغی اور اخلاقی منزلت کا بھی کسی نہ کسی ذریعہ سے علم حاصل ہو گیا ہو، اگرچہ جاننے والے جانتے ہیں کہ یہ کوئی آسان مرحلہ نہیں ہے، تاہم مان لیجئے کہ اس میں کامیابی ہو بھی جائے۔ پھر بھی جہاں تک میرے معلومات ہیں اور میرا اندازہ ہے ان تاریخوں کے بتدائی راویوں کی تعداد، بمشکل ایک دو سے آگے متجاوز ہو سکتی ہے۔ آخر ہماری تاریخوں کی آج جو کچھ بھی بنیاد ہے، وہ کوئی پرانے مانے کی کسی پرانے مصنف کی کوئی یادگار، پرانی قبروں کا کوئی کتابہ، پرانے سکوں کے ٹھپے، پرانے کھنڈروں کی کوئی شگی یا برنجی نتی، یا از یں قبیل کوئی اور چیز، یقینی سے یقینی تر چیز کسی شخص کی ذاتی خود نوشت سوانح عمری ہو سکتی ہے، اس احتمال کے سوا کہ اس قسم کی یوگرافیاں کیا موجودہ زمانہ کے مینوفسٹی بیانات نہیں ہو سکتیں اور مان لیا جائے کہ ان میں گفتنی کے ساتھ تمام ناگفتنیوں کے مدراج کا بھی التزام کیا گیا ہو، یا یوں کہئے کہ صاحب شعر و دیوان ہونے کی حیثیت کے ساتھ محلہ[۵] والوں کے معلومات بھی اس میں یان کئے گئے ہوں، اور جن کے کردار و سیرت کے متعلق ہمارے پاس کوئی شہادت موجود نہ ہو، ہر قسم کے وسوسے ان کے متعلق یدا ہو سکتے ہیں، لیکن ان سب سے بھی اگر قطع نظر کر لیا جائے تو جب بھی اس یقینی ترین تاریخی سرمایہ (خود نوشت سوانح عمری) ی حیثیت ایک شخصی بیان ہی کی ہو سکتی ہے، اخلاقی اطمینان کے باوجود ایک شخصی دماغ پریشانیاں و ذہول، بھول چوک کی راہیں نتی کھلی ہوئی ہیں، ظاہر ہے۔

لیکن اب آیئے، تاریخ کے ایک اس نادرۂ روزگار حصہ پر نظر ڈالئے جس کا نام "حدیث" ہے۔ جن چشم دید گواہوں، اور بنی شاہدوں کے بیانات سے یہ "واقعات" حاصل کئے گئے ہیں، ان کی تعداد کیا تھی، ابھی سلسلہ روایت کے بعد کی کڑیوں سے نث نہیں، بلکہ آپ کے سامنے اس کا صرف پہلا حلقہ یعنی ان لوگوں کا سوال ہے، جو خود اس واقعہ میں شریک تھے، انھوں نے س کو دیکھا، اور اس نظر سے دیکھا جس سے ہر معمولی واقعہ نہیں دیکھا جاتا، بلکہ ایک امتی جس نظر سے اپنے پیغمبر کو، یا ایک مرید

---

[۵] یہ اکبر مرحوم کے مشہور شعر ~ اکبر کی حقیقت کو تم کچھ پوچھو محلے والوں سے ۔ ہاں شعر تو اچھا کہتے ہیں دیوان تو ان کا دیکھا ہے ، کی طرف تلمیح ہے ۱۲

اپنے پیرکو یا صاف لفظوں میں کہئے' محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عجیب وغریب صحابیوں نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ دیکھنے کے بھی وہ ذمہ دار تھے اور بیان کرنے کے بھی ذمہ دار تھے' جانتے ہیں کہ ان کی تعداد کیا تھی علی بن ابی زرعہ جو فن رجال کے بڑے مشہور ائمہ میں ہیں ان سے یہی سوال پوچھا گیا' جواب میں انھوں نے فرمایا:۔

توفی النبی صلی اللہ علیہ وسلم ومن راٰہ وسمع منہ زیادۃ علی مائۃ الف انسان من رجل وامرأۃ کلھم قد روی عنہ سماعا ورویۃ

اصابہ صـ۳ ج ۱

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات جس وقت ہوئی' اس وقت ان لوگوں کی تعداد جنہوں نے حضور کو دیکھا اور آپ سے سنا تھا ایک لاکھ سے زیادہ تھی ان میں مرد بھی تھے اور عورتیں بھی حضور سے سن کر اور دیکھ کر روایت کرتے تھے'

یہ یاد رکھنا چاہئے' کہ ابن ابی زرعہ نے یہ صحابیوں کی تعداد نہیں بتائی ہے' بلکہ ان خاص اصحاب کی تعداد ہے جنہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا اور دیکھنے کے بعد آپ کے متعلق کوئی نہ کوئی بات روایت کی ہے "حدیث" تاریخ کے جس حصہ کی تعبیر ہے' اس کے ابتدائی رواۃ کی یہ تعداد کیا کوئی معمولی بات ہے؟ عموماً اس کو سن لیا جاتا ہے اور لوگ گذر جاتے ہیں' لیکن مقابلہ سے بات سمجھ میں آتی ہے' ایک طرف آپ کے سامنے تاریخ کا وہ ذخیرہ ہے جس کے ابتدائی راویوں کا حال اگر معلوم بھی ہوسکتا ہے تو ان کی تعداد دو تین سے آگے بمشکل متجاوز ہوسکتی ہے' اور بیچاری ایک تاریخ کیا بڑے بڑے مذہبی مستندات جن کے بھروسہ میں آج کروڑہا کروڑ انسان ایمانی زندگی بسر کر رہے ہیں' زیادہ تر ان کا بھی یہی حال ہے' خیال تو کیجئے کہ کہاں ایک لوقا[1] ایک مرقس یا ایک سنجے گاڑی بان کا بیان' اور کہاں یہ ایک لاکھ سے اوپر چشم دید گواہوں کی شہادتیں' پھر یہ بھی تو دیکھنا چاہئے کہ عام تاریخی واقعات جیسا کہ پہلے بھی کہہ چکا ہوں پراگندہ اور منتشر کتروں کا مجموعہ ہے' لیکن ان بکھری ہوئی کتروں کے سمیٹنے والے ایک دو' ادھر ایک شخصی ذات محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہے جن کی سچی اور ہو بہو جیسے کہ وہ تھے' ان کی تصویر اتارنے کے لئے ارد گرد' لاکھوں زندہ آنکھوں کے کیمرے قدرت کی جانب سے کھڑے کئے گئے ہیں۔

چہ نسبت خاک را با عالم پاک

راویوں کی تعدادی مقدار کے روایت پر کیا کیا اثرات مرتب ہو سکتے ہیں؟ بادنیٰ تامل ہم اسے سمجھ سکتے ہیں۔

کثرت تعداد کا روایتوں کی وثاقت پر اثر سب سے پہلی بات تو یہی ہے' ایک یا دو آدمی سے ظاہر ہے کہ اتنے واقعات کا احاطہ یقیناً ناممکن ہے' جو مشاہدہ کرنے والوں کی کثرت کی صورت میں ممکن ہے' پھر اسی کے ساتھ جب اس کو بھی ملا لیتے ہیں کہ ان راویوں میں صرف مرد ہی نہیں' بلکہ عورتوں کی بھی ایک بڑی جماعت شریک ہے تو احاطہ کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہو جاتا ہے' اگر آنحضرت

---

[1] مختلف انجیلوں کے مختلف ابتدائی راویوں کے نام ہیں اور سنجے اس گاڑی بان کا نام ہے' جو ہندوؤں کی مشہور کتاب "گیتا" کا سری کرشن سے تنہا راوی ہے' محض اسی کی روایت کی بنیاد پر ہندو گیتا کو گویا ایک قسم کی آسمانی کتاب سمجھتے ہیں ۱۲

لی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے مورخین صرف مرد ہوتے، تو اس کا یہ مطلب ہوتا کہ ہم تک حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت
یبہ کے محض وہی واقعات پہونچے ہیں جن کا تعلق گھر کے باہر کی زندگی سے ہے، لیکن بجائے جلوت کے خلوت یا گھریلو زندگی
ے حالات پر یقیناً پردہ پڑا رہتا، اور ایسے بہت سے مسائل جن کا خصوصی تعلق صرف عورتوں سے ہے ان کے متعلق کوئی
اضح ہدایت نامہ ہمارے پاس نہ ہوتا، لیکن کون نہیں جانتا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا ہر پہلو جلوت کا
ہو یا خلوت کا، کسی کو راز میں نہیں رکھا گیا، راویوں کی کثرت اور ان کی ان مختلف نوعیتوں ہی کا نتیجہ ہے، کہ دوست ہی
ہیں، آج دشمن بھی اس کے اعتراف پر مجبور رہیں کہ :-

”یہاں پورے دن کی روشنی ہے، جو ہر چیز پر پڑ رہی ہے، اور ہر ایک تک وہ پہونچ سکتی ہے“ یہ باسورتھ اسمتھ
لی شہادت ہے، جس کا اظہار اس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت (ص۱۰۱) میں کیا ہے، اور اسی کے ساتھ یہ نکتہ بھی
اگر ملحوظ رکھا جائے کہ باہر میں ہو یا اندر میں قدرت نے ایسے اسباب فراہم کر دیے تھے، کہ صحرائے عرب کے ایک دور افتادہ
نخلستانی قصبہ میں تقریباً دنیا کے بڑے بڑے قابل ذکر مذاہب یعنی بت پرستی، یہودیت، عیسائیت، مجوسیت کے ماننے والوں کو
مسلمان کر کے حق تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت مبارک میں پہونچا دیا تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اصلاحی
وتکمیلی زد میں دنیا کے تمام مذاہب پر جو پڑ رہی تھیں اس کے سمجھنے کے لئے خود ان مذاہب کے جاننے والوں کی ضرورت تھی
اور قدرت نے اس کا بھی سامان کر دیا تھا، باہر میں بھی اور اندر میں بھی، جس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں ہے، اور عام طور پر لوگ اس سے
واقف بھی ہیں، عملی طور پر ان عینی شاہدوں کی کثرت کا ایک بڑا فائدہ یہ بھی تھا کہ قطع نظر اس سے کہ، ایک واقعہ کے جب بہت سے
دیکھنے والے ہوتے ہیں تو ہر ایک دوسرے کی تکذیب کے خیال سے عموماً غلط بیانی کرنے میں ہچکچاتا ہے، اگرچہ صحابہ کرام کے
جن خصوصیات کا ذکر میں نے اوپر کیا ہے اور یوں بھی ان سے قصداً کسی غلط بیانی کی کون توقع کر سکتا ہے، لیکن جیسا کہ قرآن نے
قانون شہادت کے ذکر کے سلسلہ میں بیان کیا ہے، کہ ایک گواہ کے سمجھنے یا یاد رکھنے میں اگر کوئی غلطی ہوئی ہو تو دوسرا اس کی
اصلاح کر سکتا ہے، حدیث کے پڑھنے والے جانتے ہیں کہ ایک موقعہ پر نہیں بلکہ متعدد مواقع اس قسم کے پیش آئے ہیں، جہاں
راویوں کی کثرت تعداد کی وجہ سے غلط فہمیوں کی اصلاح ہوئی ہے میرا مضمون بہت طویل ہو جائے گا، ورنہ ان کے نظائر جن سے
معمولی طلبہ تک واقف ہیں، یہاں پیش کرتا۔

ماسوا اس کے صحابی راویوں کی جو تعداد ابن ابی زرعہ کے حوالے سے میں نے اوپر نقل کی ہے ظاہر ہے، کہ صحبت
مبارک میں ان سب کا اجتماع ایک وقت میں نہیں ہوا تھا۔ اور نہ یہ ممکن تھا کہ ہر لمحہ یا ہر جگہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ
ساتھ یہ سارا مجمع رہتا، اگرچہ حجۃ الوداع کے موقعہ پر تقریباً لاکھ سے اوپر صحابیوں کا مجمع جمع ہو گیا تھا، لیکن یہ ایک دفعہ کا واقعہ ہے
ورنہ عموماً مدینہ منورہ میں جو تعداد صحابہ کی رہتی تھی، یا غزوات و اسفار میں جو لوگ آپ کے ساتھ ہوتے تھے، ان کی ظاہر ہے کہ
اتنی تعداد کبھی اکٹھی نہیں ہوئی، بیس ہزار دس ہزار پانچ ہزار تین ہزار، چار ہزار یا اس سے نیچے کی تعداد فوجی مہموں میں حضور

صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ عموماً رہی ہے۔ اگرچہ مدینہ منورہ میں ابتداءً انصار کے ساتھ مہاجرین کا ایک مختصر گروہ آپ کے ساتھ تھا۔ لیکن جس وقت غزوہ تبوک کا واقعہ پیش آیا ہے، کعب بن مالک جو اس سفر میں رفاقت سے محروم رہے تھے، اور اس کا ایک دلچسپ واقعہ بخاری میں ان ہی کی زبانی منقول ہے، اس میں مدینہ کے اصحاب کا ذکر فرماتے ہوئے آپ نے یہ جملہ فرمایا تھا۔

والناس کثیر لا یحصیہ دیوان	لوگ بکثرت تھے، کسی دفتر میں ان کی تعداد منضبط نہ تھی

بہرحال مدینہ منورہ میں بالآخر اچھی خاصی جماعت باہر کے مہاجرین کی بھی جمع ہو گئی، لیکن ظاہر ہے کہ ان سب کو ہر وقت اپنے مختلف مشاغل کی وجہ سے مجلس مبارک میں حاضری میسر نہیں آتی تھی، کسی وقت کوئی رہتا تھا، کسی وقت کوئی، اب اگر راویوں کی تعداد دو چار پر ختم ہو جاتی، تو کیا وہ ذخیرہ جمع ہو سکتا تھا جو آج جمع ہوا ہے، واقعہ یہ ہے کہ گرد و پیش میں ان ہزاروں مردوں اور عورتوں کے رہنے آنے جانے کا نتیجہ یہ ہوا، کہ ہر ایک کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے کسی نہ کسی واقعہ یا کسی قول کے محفوظ کرنے کا موقعہ ملا، اور اپنی مذکورہ بالا ذمہ داریوں کی بنیاد پر بعض لوگوں نے تو یہ عام قاعدہ مقرر کر لیا تھا کہ اپنی حاضری کے دنوں میں اس عجیب و غریب شخصی تاریخ کے متعلق جن واقعات کا علم حاصل ہوتا تھا دوسرے دن اپنے غائب رفیق کو من وعن سنا دیا کرتے تھے، بخاری میں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے۔

کنت انا وجار لی من الانصار فی بنی امیۃ بن زید وھی من عوالی المدینہ وکنا نتناوب النزول علی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ینزل یوماً وانزل یوماً فاذا انزلت جئتہ بخبر ذلک الیوم من الوحی وغیرہ واذا نزل فعل مثل ذلک۔	میں اور میرا ایک انصاری پڑوسی، ہم دونوں امیہ بن زید والوں کی بستی میں رہتے تھے اور مدینہ کے عوالی کی یہ بھی ایک بستی ہے اور ہم دونوں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں باری باری سے حاضر ہوتے تھے، ایک دن وہ حاضر ہوتے ایک دن میں حاضری دیتا، میں جس دن حاضر ہوتا اس دن کے حالات اور خبریں وحی وغیرہ کی ان کو سناتا، اور جب وہ حاضر ہوتے تو یہی کرتے۔

ابتداء اسلام میں محدود معاشی ذرائع ہونے کا یہ لازمی نتیجہ تھا، مہاجرین بیچاروں کو اپنے اپنے اہل و عیال کی پرورش کے لئے عموماً بیوپار یا صنعتی کاروبار میں مشغول ہونا پڑتا تھا، جس گاؤں کا حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ذکر کیا، یہاں آپ کی نگرانی میں کپڑے بننے کی کارگاہیں تھیں، سنح نامی گاؤں میں حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا کارخانہ تھا، انصار عموماً اپنے باغوں، اور کھیتوں پر کام کرتے تھے، لیکن بایں ہمہ ایک جماعت ان لوگوں کی بھی تھی، جو اپنے ور گھر سے جدا ہو کر نومسلموں کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجد نبوی میں صُفّہ نامی جو مدرسہ قائم فرمایا تھا، اس میں داخل ہو جاتے تھے ان کے قیام و طعام کا نظم خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یا مدینہ کے خوش باش لوگ کیا کرتے تھے، اس لئے معاشی افکار سے الگ ہو کر ان کا زیادہ کام یہی تھا کہ قرآن سیکھیں، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و سنن کو یاد کریں، اسی جماعت کے

سرگروہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں جو ذخیرہ حدیث کے سب سے بڑے راوی ہیں، لوگوں کو ان کی کثرت روایت پر کبھی تعجب ہوتا تو خود ہی فرماتے :۔

انکم تزعمون ان اباھریرۃ یکثر الحدیث عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم واللہ الموعد انی کنت امرأً مسکینا اصحب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم علی ملاء بطنی وکان المھاجرون یشغلھم الصفق بالاسواق وکانت الانصار یشغلھم القیام علی اموالھم (بخاری)

تم لوگ خیال کرتے ہو کہ ابوہریرہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ حدیثیں بیان کیا کرتا ہے اور قسم ہے خدا کی کہ میں ایک غریب مسکین آدمی تھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس صرف پیٹ پر پڑا رہتا تھا، اور مہاجرین بازار کے کاروبار میں مشغول رہتے اور انصار اپنے اموال (باغ اور کھیت) میں الجھے رہتے۔

ایک دوسرے موقع پر یہ بیان کرتے ہوئے کہ اس سلسلہ میں وہ کیا کرتے تھے خود تفصیل فرماتے ہیں :۔

قدمت علی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بخیبر وانا یومئذ قد زدت علی الثلثین فاقمت معہ حتی مات وادور معہ بیوت نسائہ واخدمہ واغزو معہ واحج (ابن سعد)

میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بمقام خیبر حاضر ہوا، اس وقت میری عمر تیس سال سے اوپر ہو چکی تھی، پھر میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس قیام کر لیا، یہاں تک کہ آپ کی وفات ہو گئی، میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ آپ کی عورتوں کے گھروں میں گھوما کرتا اور آپ کی خدمت کرتا حضور کے ساتھ جہاد کرتا حج کرتا رہا۔

طالب العلمی کے ان دنوں میں ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر کیا کیا گذری بعد کو مزے لے لے کر بیان کرتے، کبھی کہتے جیسا کہ امام بخاری راوی ہیں :۔

واللہ الذی لا الہ الا ھو ان کنت لاعتمد علی الارض بکبدی من الجوع واشد الحجر علی بطنی۔

اسی خدا کی قسم جس کے سوا کوئی الہ نہیں ہے کہ بھوک کی وجہ سے میں جگر تھام کر زمین پر ٹیک لگا لیتا، اور اپنے پیٹ پر پتھر باندھتا،

کبھی فرماتے :۔

رأیتنی اصرع بین منبر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وحجرۃ عائشۃ فیقال مجنون وما بی جنون ان ھی الا الجوع (صحاح)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے منبر اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے حجرہ کے درمیان میں چکرا کر گر پڑتا، خیال کیا جاتا کہ میں پاگل ہوں، حالانکہ مجھے جنون سے کیا تعلق، وہ تو صرف بھوک کا اثر تھا

مگر یہ سب کچھ گذر رہا تھا، دوسرے ساتھیوں کو یہ بھی دیکھ رہے تھے کہ کاروبار کرکے آرام اٹھا رہے ہیں، لیکن تیس بتیس سال یہ دوستی یمنی نوجوان۔

موج خوں سر سے گذر ہی کیوں نہ جائے　　آستان یار سے اُٹھ جائیں کیا

کہہ کر بیٹھ گیا تھا اور اس وقت تک بیٹھا رہا جب تک کہ حق توفی رسول اللہ علیہ وسلم اور اس قسم کے یہ ایک آدمی نہیں ہیں، حضرت عبد اللہ بن مسعود جن کا خطاب ہی صحابہ کی جماعت میں صاحب[1] النعلین والسواک والوسادہ تھا حضرت ابوموسیٰ اشعری کہتے ہیں کہ ہم جب یمن سے آئے، تو ابن مسعود کے متعلق مدت تک ہم سمجھتے رہے کہ:-

انہ رجل من اھل بیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لما نری من دخولہ ودخول امہ علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم (اصابہ)

کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر کے کوئی آدمی ہیں، جس کی وجہ ان کی اور ان کی ماں کی آمد و رفت تھی جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ہوتی رہتی تھی،

ان کو دربار رسالت سے یہ حکم ملا ہوا تھا کہ

"علی ترفع الحجاب وتسمع سوادی" (اصابہ)

تم ابن مسعود! پردہ کو اٹھا کر میرے حجرہ میں آسکتے ہو، اور تنہائی کی گفتگو سن سکتے ہو۔

اسی طرح حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں جو ۹ سال تک مسلسل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خانگی خدمت میں رہے اور ان کے سوا بھی حضور کے موالی مثلاً رافع بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہم میں جو بہت کم مجلس رسالت کی حاضری سے محروم رہتے تھے یہ تو مردوں میں اور عورتوں میں یہی حال امہات المومنین کا تھا، جن میں کوئی نہ کوئی خلوت کی زندگی میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہتی تھیں، ان ہی باتوں کا یہ نتیجہ ہوا، کہ صحابہ میں جن لوگوں کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق جن امور کا علم براہ راست حاصل نہ ہوتا تھا ان کو اپنے دوسرے بھائیوں اور ساتھیوں کے ذریعہ سے معلوم کرلیا کرتے تھے، اور اس میں بڑے اور چھوٹے کی بحث نہیں تھی، خود حضرت ابوہریرہ کا بیان ہے کہ،

کانوا یعرفون لزومی فیسالونی عن حدیثہ منھم عمر وعثمان وعلی وطلحۃ والزبیر (ابن سعد)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ میری وابستگی کا حال لوگوں کو چونکہ معلوم تھا اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں مجھ سے پوچھا کرتے، ان پوچھنے والوں میں عمر بھی ہیں اور عثمان بھی علی بھی طلحہ بھی زبیر بھی

حدیث کی کتابوں میں اس کا ایک ذخیرہ موجود ہے، جس میں خلفاء راشدین اور دوسرے جلیل القدر اصحاب نے باہم ایک دوسرے سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث پوچھی ہے، مردوں میں اگر پتہ نہیں چلتا، تو امہات المومنین کے پاس آدمی بھیجا جاتا کہ ان کو اگر کوئی علم ہو تو بیان کریں، ایک دن حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ جن کا ابھی ذکر گذرا حالانکہ ۹ سال تک صحبت نبوی

---

[1] آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جوتیاں مسواک اور گدے کی نگرانی ان ہی کے ذمہ تھی اسی لئے ان کو یہ خطاب دیا گیا تھا ۱۲

میں ان کو ہمہ وقتی رفاقت کا موقعہ ملا ہے، لیکن ایک حدیث بیان کر رہے تھے، کہ حلقہ کے لوگوں میں سے کسی نے پوچھا

انت سمعتہ من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم | کیا آپ نے اس حدیث کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جواب میں فرمایا،

ماکل مانحدثکم بہ سمعناہ من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ولکن کان یحدث بعضنا بعضا

(مستدرک حاکم)

ہم تم سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جو باتیں بیان کیا کرتے ہیں سب خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی سے ہم نے نہیں سنا ہے، بلکہ ہم میں بعضوں نے بعض سے بھی سنا ہے (یعنی ایک صحابی نے دوسرے صحابی سے سنا ہے)

اور یہ بھی تھا بہت بڑا عظیم نفع، حضرات صحابہ کی کثرت تعداد کا، ہر ایک اپنی کمی دوسرے کے علم سے پوری کرتا تھا، اپنے علم کی تکمیل کے شوق ہی کا نتیجہ یہ تھا کہ تابعین یا اصاغر صحابہ ہی کے زمانہ میں نہیں، بلکہ خود باہم ایک صحابی نے دوسرے صحابی سے اپنی علمی نقص کی تکمیل کے لئے کبھی کبھی لمبے لمبے سفر کئے ہیں، اور قرآن نے جس اسوہ حسنہ کی کامل اتباع اور پیروی کا ان سے جو مطالبہ کیا تھا، اس کا لازمی نتیجہ یہی ہونا بھی چاہئے تھا، حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ، جن کا گھر مدینہ ہی میں تھا، اور خاص طور پر "حدیث" کے مشہور سرمایہ داروں میں ان کا شمار ہے، جیسا کہ آگے بیان ہوگا، خود بیان کرتے ہیں کہ

بلغنی حدیث عن رجل من اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم فابتعت بعیرًا فشددت علیہ رحلی ثم سرت الیہ شھرًا حتی قدمت الشام فاذا عبد اللہ بن انیس الانصاری فاتیت منزلہ وارسلت الیہ ان جابرًا علی الباب فرجع الی الرسول فقال جابر بن عبد اللہ فقلت نعم فخرج الی فاعتنقتہ واعتنقنی قال قلت حدیث بلغنی عنک انک سمعتہ من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی المظالم لم اسمعہ انا منہ قال سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول الحدیث

(جامع بیان العلم ابن عبد البر ص ۹۳)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابیوں میں سے ایک صاحب کے واسطے سے مجھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث پہونچی میں نے اسی وقت ایک اونٹ خریدا، اور اس پر اپنا کجاوا کس کر ایک ماہ تک چلتا رہا یہاں تک کہ شام پہونچا، اور عبد اللہ بن انیس انصاری (جن سے حدیث پہونچی تھی) ان کے گھر پہونچا، اندر آدمی بھیجا کہ دروازہ پر جابر کھڑا ہوا ہے، آدمی نے واپس ہو کر پوچھا کہ کیا جابر بن عبد اللہ ہیں؟ میں نے کہا ہاں عبد اللہ بن انیس باہر نکل پڑے دونوں ایک دوسرے کے گلے سے لپٹ گئے پھر میں نے پوچھا کہ مجھے آپ کے ذریعہ سے ایک حدیث پہونچی ہے، جسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے "مظالم" کے متعلق آپ نے سنی ہے، اور میں نہیں سن سکا ہوں عبد اللہ بن انیس نے جواب میں فرمایا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا آپ فرماتے تھے (پھر عبد اللہ نے پوری حدیث سنائی)

اس سے بھی زیادہ دلچسپ واقعہ مشہور صحابی حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ مدفون قسطنطنیہ[1] کا ہے کہ ایک حدیث انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے براہ راست خود سنی تھی، لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس میں کچھ شک پیدا ہوا، آپ کے ساتھ اس حدیث کے سننے کے وقت عقبہ بن عامر رضی اللہ تعالیٰ عنہ صحابی بھی دربار رسالت میں موجود تھے لیکن وہ مصر میں قیام پذیر ہو گئے تھے سن کر حیرت ہوگی، کہ صرف ایک حدیث میں معمولی شک مٹانے کے لئے حضرت ابو ایوب رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ مدینہ منورہ سے مصر روانہ ہوتے ہیں، اور حضرت عقبہ بن عامر کے پاس حاضر ہو کر فرماتے ہیں،

حدثنا ما سمعته من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی ستر المسلم لم یبق احد سمعه غیری وغیرك

مجھ سے اس حدیث کو بیان کرو، جسے تم نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مسلمانوں کی عیب پوشی کے متعلق سنا ہے، اب اس حدیث کے سننے والوں میں میرے اور تمھارے سوا کوئی باقی نہیں رہا۔

حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ ان کے سامنے اس حدیث کو دہراتے ہیں حدیث یہ تھی من ستره مسلمًا علی خزیة ستره اللہ یوم القیامة وہ سنتے ہیں اس کے بعد کیا ہوتا ہے، وہ اس سے بھی عجیب تر ہے کہ

فاتی ابو ایوب راحلته فرکبها وانصرف الی المدینة وماحل رحله

حضرت ابو ایوب رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنی سواری کے پاس آتے ہیں، اور سوار ہوتے ہیں، مدینہ منورہ روانہ ہو جاتے ہیں آپ نے (مصر) میں اپنا کجاوہ بھی نہ کھولا،

(۹۴- جامع)

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ جن کے نام نامی سے حدیث کا ابتدائی طالب علم بھی واقف ہے ان کے متعلق بیان کیا جاتا ہے، کہ "ان ابا سعید رحل فی حرف" یعنی حدیث کے ایک حرف کی تصحیح کے لئے ابو سعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ نے باضابطہ کوچ کیا، دارمی میں ایک اور صحابی کے متعلق ہے، ان رجلًا من اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم رحل الی

فضالة بن عبید اللہ وهو بمصر فقدم علیه وهو یمد لناقة له فقال مرحبا قال اما انی لم آتك زائرًا ولکن سمعت انا وانت حدیثًا من رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم رجوت ان یکون عندك منه علم (دارمی)

کہ آنحضرت کے صحابیوں میں سے ایک صاحب فضالہ بن عبد اللہ کے پاس مصر روانہ ہوئے اور وہ اپنی اونٹنی کا چارہ تیار کر رہے تھے فضالہ نے صحابی کو دیکھ کر مرحبا کہا، صحابی نے جواب میں فرمایا کہ میں تمھاری ملاقات کو نہیں آیا ہوں لیکن ہم نے اور تم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک حدیث سنی ہے میں یہ امید لے کر آیا ہوں

---

[1] قسطنطنیہ میں آپ کے دفن کا واقعہ بڑا عبرت انگیز ہے، کہا جاتا ہے کہ مسلمان قسطنطنیہ کا محاصرہ کئے پڑے تھے جس میں حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی تھے، اتفاق سے بیمار ہوگئے اور یقین ہوگیا کہ آخری وقت ہے وصیت فرمائی کہ میری وفات کے بعد جنازہ کو لے کر مسلمان حملہ کریں اور دشمن کی زمین میں جہاں تک گھس سکتے ہوں گھستے چلے جائیں، آخری نقطہ جہاں تک تمھاری رسائی ہو اسی میں مجھے دفن کر دینا جنازہ لے کر مسلمانوں نے حملہ کیا، اور غنیم کو پسپا کرتے ہوئے فصیل کی دیوار تک پہونچ گئے، وہیں قبر کھود حضرت کو دفن کر دیا گیا محمد فاتح نے جب صدیوں بعد قسطنطنیہ فتح کیا تو خواب میں آپ نے اپنی قبر کا نشان دیا اسی پر جامع ابی ایوب تیار ہوئی ۱۲

یہ تو بڑے بڑے صحابیوں کا حال تھا، باقی ایسے کمسن اصحاب جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت مبارک سے اتنا فائدہ نہ اٹھا سکے تھے، یا ان کے معاصر اور تلامذہ جنہیں تابعین کہتے ہیں، اس باب میں تو ان کے کارناموں کا کوئی ٹھکانہ ہی نہیں ہے۔ میں نے ذکر کیا تھا کہ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما باوجود قرابتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت کے صحابہ کے دروازوں پر تلاش حدیث میں گرد کھاتے پھرتے تھے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے صحابہ کی کثرت تعداد کے اس فائدے کو محسوس کر لیا تھا کہ ان کے ذریعہ سے اپنی تاریخ کے تمام خط و خال کی تکمیل میں پوری مدد مل سکتی ہے اس سلسلہ میں اپنے ایام طلب کے قصے بیان کرتے ہوئے فرماتے کہ میں نے اپنے ایک رفیق سے کہا کہ

هلم فلنسال اصحاب النبی صلی الله علیه وسلم فانهم الیوم کثیر | چلو بھائی! ہم لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابیوں سے چل کر دریافت کریں، کیونکہ ابھی ان کی بڑی تعداد موجود ہے

لیکن ان کے رفیق بخت کے چھوٹے تھے بولے:۔

یا ابن عباس اتری الناس یحتاجون الیك وفی الناس من اصحاب النبی صلی الله علیه وسلم (دارمی) | ابن عباس! کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ لوگ تمہارے بھی محتاج ہوں گے حالانکہ ابھی تو لوگوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بہت سے صحابی موجود ہیں۔

لیکن اس بیچارے کو کیا معلوم تھا کہ یوں ہی چھوٹے بڑوں کے گذرنے کے بعد بڑے بنتے ہیں۔ بعد کو اپنے علمی سرمایہ کی بدولت جب ابن عباس مرجع انام بن گئے، تو وہ بیچارے پچھتاتے تھے، اور کہتے تھے، کا ن هذا الفتیٰ اعقل منی (یہ نوجوان مجھ سے زیادہ دانش مند تھا) تابعین میں سعید بن المسیب مسروق وغیرہ جن کے حالات آگے آرہے ہیں، ان کے بیانوں میں اس قسم کے واقعات بکثرت ملتے ہیں حضرت سعید بن المسیب سے امام مالک راوی ہیں۔

انی کنت لاسیر اللیالی والایام فی طلب الحدیث (جامع) | حدیث کے تلاش میں میں کئی کئی دن اور کئی کئی راتیں مسلسل چلتا رہا ہوں۔

حضرت مسروق کے متعلق بھی بیان کیا جاتا ہے کہ رحل فی حرف (یعنی صرف ایک لفظ کے لئے کوچ کیا) ان تابعیوں کی نزاکت ذوق کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے، کہ بسا اوقات کوئی حدیث ان کو ایسے آدمی سے پہونچتی جو شرف صحبت سے فیض یاب نہ ہوتے، حالانکہ اس حدیث کا علم ان کو حاصل ہو چکا ہوتا، لیکن اگر یہ معلوم ہو جاتا کہ جس صحابی سے یہ روایت بیان کی جاتی ہے وہ زندہ ہیں، تو خواہ وہ کسی مقام پر ہوتے، ان تک پہونچ کر کوشش کرتے کہ براہ راست بھی اس روایت کو صحابی سے خود سن لیں، دارمی نے ابو العالیہ سے یہ روایت درج کی ہے۔

کنا نسمع الروایة بالبصرة عن اصحاب رسول الله صلی الله علیه وسلم فلم نرض حتیٰ رکبنا الی المدینة | ہم لوگ بصرہ میں ایک روایت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابیوں سے سنتے ہوئے سے سنتے، مگر ہم صرف اسی پر قناعت نہیں کر لیتے تھے، جب تک سوار ہو کر مدینہ

فسمعناها من افواههم (دارمی) | پہونچ کر خود ان صحابیوں کی زبانی بھی اس روایت کو نہ سن لیتے

یہ کسی خاص شخص کا حال نہیں ہے بلکہ عام تابعین کے طرز عمل کا بیان ہے۔

طلب حدیث کے لئے رحلت کا ایسا عام مذاق پھیل گیا تھا، کہ بطور امور عامہ کے بعض بعض تابعین کی زبان پر یہ لطیفہ جاری ہو گیا یعنی شاگردوں سے حدیث بیان کرتے اور آخر میں انھیں مخاطب کرکے بطور طیبت کے فرماتے:۔

خذها بغیر شئی قد کان الرحل یرحل فیما دونها الی المدینة (ابن سعد) | بغیر کسی معاوضہ کے (مفت) یہ حدیث لے لو ورنہ حال یہ تھا کہ اس سے بھی کم چیز کے لئے لوگ مدینہ تک سفر کرتے تھے۔

یہ حضرت شعبی کا قول ہے جو کوفہ میں اپنے طلبہ سے مزاحاً کبھی کبھی کہا کرتے تھے۔

مذکورہ بالا عوامل و موثرات سچ پوچھئے تو بجائے خود ان میں ایک حدیث یعنی تاریخ کے اس عجیب و غریب سرمایہ کی حفاظت کی کافی ضمانت ہے، لیکن جہاں یہ سارے اسباب اکٹھے ہو گئے ہوں، اور اب اسی کے ساتھ آپ اس عام تاریخی دعوی کو بھی اپنے سامنے رکھ لیجئے کہ:

مذهب العرب انهم کانوا مطبوعین علی الحفظ مخصوصین بذالك (جامع) | عرب کا عام طریقہ تھا، کہ زبانی یاد رکھنے کی کچھ ان کی فطری عادت سی تھی، اس بات میں ان کو خاص خصوصیت حاصل تھی۔

عرب کا بدو کتابوں کے طومار کو دیکھ کر مذاق اڑاتا تھا، بدوں کا یہ عام چلتا ہوا فقرہ تھا "حرف فی تامورك خیر من عشرة فی کتبك" (دل میں ایک حرف کا محفوظ رہنا، کتابوں کی دس باتوں سے بہتر ہے)

عرب کا مشہور شاعر کہتا ہے ؎

لیس بعلم ما حوی القمطرا	ما العلم الا ما حوی الصدرا
علم وہ نہیں ہے، جو کتابوں میں درج ہے	نہیں ہے علم لیکن صرف وہی جو سینہ میں محفوظ ہو،

دوسرا کہتا ہے ؎

استودع العلم قرطاسا فضیعه	وبئس مستودع العلم القراطیس
جس نے علم کو کاغذ کے سپرد کیا اس نے اسے ضائع کیا	علم کے بدترین مدفن کاغذ ہیں،

تیسرے کا شعر ہے ؎

علمی معی حیث ما یممت احمله	بطنی وعاء له لا بطن صندوق
میرا علم میرے ساتھ ہے جہاں جاتا ہوں اسے اٹھائے جاتا ہوں	میرا اندر اس علم کا برتن ہے نہ کہ شکم صندوق،
ان کنت فی البیت کان العلم فیه معی	اذا کنت فی السوق کان العلم فی السوق
اگر گھر میں رہتا ہوں تو علم میرے ساتھ رہتا ہے	جب بازار میں ہوتا ہوں تو میرا علم بھی بازار میں ہوتا ہے

کم از کم ان اشعار سے اس قوم کے خاص رجحان کا پتہ چلتا ہے۔ لکھنے اور کتابت کے متعلق شاید ہی کسی زبان میں اس قسم کے اشعار مل سکتے ہیں۔ سوسائٹی کے اس خاص مذاق کا یہ نتیجہ تھا، کہ قدرتی طور پر ان کو اپنے حافظہ پر بھروسہ کرنا پڑتا تھا۔ قاعدہ ہے کہ انسان اپنی جس قوت کو زیادہ استعمال کرتا ہے، اسی میں جلا پیدا ہو جاتی ہے مختلف اقوام کی مختلف چیزوں کے ساتھ خاص مناسبت کی یہی وجہ ہے اسی لئے یہ مسلم ہے کہ ان العرب قد خصت بالحفظ (عرب حافظہ کی قوت میں خصوصیت رکھتے تھے) ان کے حافظہ کی قوت کے جو واقعات کتابوں میں درج ہیں، کتابی قوموں کے لئے حقیقت یہ ہے کہ ان کا باور کرنا دشوار ہے۔ حافظ عمر بن عبدالبر لکھتے ہیں،

کان احدھم یحفظ اشعار بعض فی سمعۃ واحدۃ	ان میں بعض لوگ صرف ایک دفعہ سن کر لوگوں کے اشعار یاد کر لیا کرتے تھے

ابن عباس کے متعلق مشہور ہے، کہ ان کے سامنے عمر بن ابی ربیعہ شاعر آیا اور ستر شعر کا ایک طویل قصیدہ پڑھ گیا۔ شاعر کے جانے کے بعد ایک شعر کے متعلق کچھ گفتگو چلی، ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے فرمایا کہ مصرعہ اس نے یوں پڑھا تھا۔ جو مخاطب تھا اس نے پوچھا کہ تم کو پہلی دفعہ میں کیا پورا مصرعہ یاد رہ گیا! بولے کہو تو پورے ستر شعر سنا دوں، اور سنا دیا۔

حدیث کے مشہور راوی امام زہری کا بیان لوگ نقل کرتے ہیں کہ

انی لأمر بالبقیع فاسد آذانی مخافۃ ان یدخل فیھا شیٔ من الخنا فو اللہ ما دخل اذنی شیٔ قط فنسیتہ (ابن عبدالبر)	میں "بقیع" کی طرف گذرتا ہوں، اور اپنے کانوں کو بند کر لیتا ہوں، اس اندیشہ سے کہ اس میں کوئی بری خراب بات نہ داخل ہو جائے کیونکہ قسم خدا کی میرے کان میں کوئی بات اب تک ایسی داخل نہیں ہوئی ہے، جسے میں بھول گیا ہوں۔

شعبی بھی یہی کہتے تھے:۔

ماکتبت سوداء فی بیضا وما استعدت حدیثا من النسیان (ابن سعد)	میں نے کبھی سیاہی سے سفیدی پر کچھ نہیں لکھا، اور نہ کسی شخص کی گفتگو میں نے کبھی بھولنے کے باعث دہروائی

غیروں پر تو حجت نہیں ہو سکتی، لیکن علماء اسلام کا خیال ہے، کہ علاوہ اس کے کہ عرب کا حافظہ کچھ قدرتی طور پر غیر معمولی تھا، یہ بھی سمجھا جاتا ہے کہ قرآن مجید کے متعلق جس نے " انا لہ لحافظون" کا اعلان کیا تھا اسی قوت نے قرآن کی عملی شکل یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کی حفاظت جن کے سپرد کی تھی ان کے حافظوں کو غیبی تائیدوں کے ذریعہ سے بھی کچھ غیر معمولی طور پر قوی تر کر دیا تھا۔ اور یہ تو بخاری میں ہے کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے دربار رسالت میں نسیان کی جب شکایت کی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی خاص توجہ اور دعا کے ذریعہ سے ان کے حافظہ کو ایسا بنا دیا تھا کہ پھر وہ کوئی چیز بھول نہیں سکتے تھے، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے یہ روایت تمام صحاح کی کتابوں میں مروی ہے۔ تقریباً شہرت کی انتہائی درجہ پر پہونچی ہوئی ہے۔

حدیث کے زندہ نسخے بہرحال صحابہ کا ذوق اتباع، اتباع میں حتی الوسع ممکنہ حد تک اپنے کو بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے قریب تر کرنے کی کوشش، اور اسی رنگ میں دوسروں کو رنگنے کا ان میں بے پناہ جذبہ، ان تمام خصوصیات کے ساتھ جن کا میں نے ذکر کیا، اگر اس کے بعد میں یہ دعویٰ کروں کہ جن واقعات و حالات اور جن اقوال و ملفوظات کا ظہور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ہوا تھا، صحابہ کرام اپنے اپنے علم کی حد تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زندہ مُثنّی بنے ہوئے تھے، اور اس طرح تاریخ کی وہ کتاب یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی، عہد صحابہ میں بجائے ایک نسخہ کے ہزاروں نسخوں کی صورت میں موجود ہو چکی تھی، تو کیا میرے اس دعویٰ کو کوئی غلط ثابت کر سکتا ہے، پس تدوین حدیث کی پہلی صورت تو خود صحابہ کرام کی زندگی تھی، اور یہ تھا حفاظت حدیث یا اس تاریخ کے محفوظ کرنے اور ہونے کی پہلی صورت۔ میرا یہ دعویٰ نہیں ہے کہ ہر صحابی اپنی زندگی میں بالکلیہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہو بہو نقل تھے، اگرچہ خلفائے راشدین ہی نہیں بلکہ درجہ میں ان سے بھی جو فروتر اصحاب ہیں، ہم کتابوں میں یہ الفاظ ان کے متعلق پاتے ہیں، عبدالرحمن بن زید سے ترمذی میں مروی ہے کہ میں نے حضرت حذیفہ صحابی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا۔

حدثنا باقرب الناس من رسول اللہ علیہ وسلم هدیا ودلا نلقاہ فناخذ عنہ ونسمع منہ

مجھے بتائیے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے طرز و روش چال ڈھال میں جو آدمی سب سے زیادہ قریب ہو وہ کون ہے تاکہ میں ان سے ملوں اور ان سے علم حاصل کروں، حدیثیں سنوں،

ایک معاصر[1] دوسرے معاصر کے متعلق یہ شہادت ادا کرتا ہے، یعنی حذیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ، فرماتے ہیں۔

اقرب الناس هدیا و دلا و سمتا برسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ابن مسعود

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے طرز و روش چال ڈھال وضع و انداز میں سب سے زیادہ قریب ترین آدمی ابن مسعود ہیں۔

صرف ان ہی باتوں میں نہیں جن کا تعلق شریعت و قانون سے ہے بلکہ بعض صحابہ تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کی ہو بہو تصویر اتارنے کے لئے یہاں تک کرتے تھے کہ ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے متعلق عام طور سے مشہور ہے۔

کان تیبع آثارہ فی کل مسجد صلی فیہ وکان یعترض براحلتہ فی طریق رای رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عرض ناقتہ

(اصابہ)

جن جن مقامات پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے (راستوں) میں نمازیں پڑھی تھیں ابن عمر ان مقامات کو تلاش کرتے تھے (اور نمازیں پڑھتے تھے) راہ میں جہاں کہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی اونٹنی کا رخ پھیرا تھا، ابن عمر بھی قصداً اس مقام پر یہی کام کرتے تھے۔

---

[1] فن تنقید رجال میں انسانی فطرت کی اس کمزوری کا خیال کیا گیا ہے۔ جس کی تعبیر "المعاصرۃ اصل المنافرۃ" "ہم عصری باہمی نفرت کی بنیاد ہے" کے مشہور فقرہ سے کی گئی ہے۔ اسی لئے معاصر کی معاصر کے متعلق تعریف بہت اہم سمجھی جاتی ہے ۱۲

یہاں تک بیان کیا گیا ہے کہ سفر کے موقع پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم اگر استنجا کے لئے اونٹ سے کہیں اتر کے بیٹھتے تو باوجود عدم ضرورت کے استنجا کرنے والوں کی شکل بنا کر ابن عمر اونٹ سے اتر کر وہاں بیٹھا کرتے، اسی سلسلہ میں ان کی یہ عام عادت بیان کی جاتی ہے:

یسأل من حضر اذا غاب عن قولہ و فعلہ — آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جس قول و فعل سے یہ غائب رہتے تو جو لوگ اس وقت حاضر ہوتے ان سے پوچھ لیتے (اصابہ)

امام مالک سے ان کے شاگرد یحییٰ نے ایک دن پوچھا کہ:

سمعت المشائخ یقولون من اخذ بقول ابن عمر لم یدع الاستقصاء قال نعم — کیا آپ نے بزرگوں سے یہ سنا ہے کہ ان کا خیال تھا جس نے ابن عمر کے قول کو اختیار کیا، اس نے (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع کی تکمیل میں) کوئی چیز نہیں چھوڑی؟ بولے ہاں! (اصابہ)

بہر حال یہی "استقصا" یا سیرت طیبہ کی کامل "تصویر کشی" یا "ہو بہو نقل" آثار فی نصب العین تو سب ہی کا تھا لیکن ہر شخص کے لئے اس کا میسر آنا آسان نہیں ہے۔ تاہم اسی کے ساتھ جتنے بھی صحابی تھے، ان کی زندگی کا ایک بڑا حصہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے قالب میں ڈھلا ہوا تھا، اور اسی بنیاد پر میں ہر صحابی کو در اصل حدیث کا ایک نسخہ یا موجودہ اصطلاح میں اجازت دیجئے تو اڈیشن قرار دیتا ہوں، یہ اور بات ہے کہ ان میں بعض اڈیشن بہت زیادہ کامل اور حاوی تھے۔ اور بعض میں وہ کاملیت نہیں پائی جاتی تھی۔ اور اگر صحابہ کی جو تعداد اوپر بیان کی گئی ہے، صحیح ہے تو ایمان و اسلام اور جوش عمل کی ان میں جو سینہ زوریاں تھیں ان کو سامنے رکھتے ہوئے یہ کہنا یقیناً مبالغہ نہ ہو گا کہ عہد نبوت میں ہی ہماری وہ تاریخ جس کا نام حدیث ہے اس کے کامل و ناقص زندہ نسخوں اور اڈیشنوں کی تعداد لاکھوں تک پہونچ چکی تھی، کیا دنیا میں کوئی تاریخ یا کسی تاریخ کا کوئی حصہ ایسا موجود ہے، جس کے عینی شاہد اتنی تعداد میں خود اس واقعہ کے مجسم آئینے بن کر دنیا کے سامنے پیش ہوئے ہوں؟ اور کیا آئندہ ان نسخوں کی تعداد میں کوئی کمی ہوئی؟ کاملیت کے اعتبار سے جتنی بھی کمی ہوئی ہو لیکن کمیت اور مقدار کے لحاظ سے ہر شخص جانتا ہے کہ اس تیرہ ساڑھے تیرہ سو کی صدیوں میں ہر سال اس کی تعداد میں اضعافاً مضاعفۃً اضافہ ہی ہوتا رہا، اور ہو رہا ہے، ہر مسلمان خواہ وہ دنیا کے کسی حصہ میں آباد ہو، آج اس کی زندگی میں جتنے صحیح مذہبی اور اخلاقی عناصر شریک ہیں، کیا یہ اسی تاریخ کے کسی حصہ کا عکس نہیں ہے؟ آج بھی جو مسلمان ہندوستان کے کسی کوردہ دیہات میں جو نمازیں پڑھتا ہے قسم کھا کر کہہ سکتا ہے، اور یقیناً وہ اپنی اس قسم میں سچا ہے کہ وہ اسی طرح ہاتھ اٹھاتا ہے، جس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اٹھاتے تھے، وہی کہتا ہے، جو حضور کہتے تھے، وہی پڑھتا ہے جو حضور پڑھتے تھے، اسی طرح وہ جھکتا ہے جس طرح حضور جھکتے تھے۔ اسی طرح زمین پر سر رکھتا ہے جس طرح حضور رکھتے تھے۔ اسی پر مسلمانوں کے دوسرے مذہبی اور دینی اعمال و عقائد کو قیاس کر لیجئے، کچھ نہیں تو کم از کم اس تاریخ کی کوئی ایک آدھ ہی بات کلمہ شہادت ہی سہی، اس تاریخ کا یہ جزء تو ہر ایک مسلمان کے

اندر اب تک محفوظ ہے۔

حدیث کا بہت بڑا حصہ متواتر ہے اور اسی بنیاد پر کل کے متعلق تو نہیں لیکن تاریخ کے اس عظیم الشان ذخیرے کے ایک بڑے حصہ کو میں متواتر خیال کرتا ہوں یعنی بغیر کسی انقطاع کے نسلاً بعد نسل لاکھوں اور لاکھوں کے بعد کروڑ ہا کروڑ انسانوں کے ذریعہ سے مشرق و مغرب میں یہ حصہ منتقل ہوتا ہوا دنیا کے موجودہ دور تک پہونچا ہے، اور انشاء اللہ تعالیٰ قیامت تک پہونچتا رہے گا، ان کی مقدار کیا ہوگی؟ اس کے لئے صرف اتنا کہا جا سکتا ہے کہ امت اسلامیہ کے تمام فرقے جن مسائل پر متفق ہیں تقریباً سب کا یہی حال ہے۔ عقائد و ایمانیات کے سوا طہارت غسل و وضو عبادات نماز روزہ حج زکوٰۃ معاملات عقوبات سیاسیات مباحات و محظورات وغیرہ وغیرہ مختلف ابواب سے ان اتفاقی مسائل کا اگر انتخاب کیا جائے جو عہد نبوت سے اس وقت تک ہر ملک اور ہر فرقہ کے مسلمانوں میں طبقۃً بعد طبقۃٍ سلفاً عن خلف تواتر کے ساتھ اس حیثیت سے مسلّم ہیں کہ یہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کا حکم اور طرز عمل تھا، تو کون کہہ سکتا ہے کہ ان کی تعداد ہزاروں سے متجاوز نہ ہوگی؟ اور ان کا شمار کرنا زیادہ دشوار بھی نہیں ہے۔

گویا قرآن کے بعد ہم جس چیز کو بغیر کسی تذبذب و دغدغہ کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارک کے ساتھ منسوب کر سکتے ہیں، وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و افعال و تقریرات کا یہی حصّہ ہے جو ہم تک تعامل و توارث کے ذریعہ سے پہونچا ہے، لیکن اس مسٔلہ میں صرف اسی پر قناعت نہیں کی گئی ہے بلکہ اسی کے ساتھ ان معلومات کے ہر ہر جزء کو مسلسل روایت کے ذریعہ سے فن حدیث میں محفوظ کرنے کی کوشش کی گئی ہے، اور یوں باہم ایک کی دوسرے سے توثیق ہوتی ہے اب روایتوں کے ذریعہ سے یہ چیزیں جس طرح مروی ہیں، ان کو، اور مسلمانوں نے تعامل کے ذریعہ سے ان چیزوں کو جس طرح ایک نسل سے دوسری نسل تک منتقل کیا ہے دونوں کو سامنے رکھئے، ہر ایک کی تصدیق دوسرے سے ہوگی، البتہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کی زندگی کا وہ حصہ جس کی منتقلی اس اتفاقی تعامل کے ذریعہ سے عمل میں نہیں آئی ہے، ان کے لئے سب سے پہلے تو ہمارے پاس وہی روایت کا ذریعہ ہے۔ روایت کے اس سلسلہ کی آیندہ کڑیوں پر تو آگے بحث آئے گی، عہد صحابہ میں جس حزم و احتیاط کے ساتھ ان چیزوں کو اپنی اصلی حالت پر محفوظ رکھنے کی کوشش کی گئی ہے، اس کی داستان آپ سن چکے خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کا ہر ہر لفظ اور ہر ہر فعل کی نگرانی صحابہ کرام کا ایک ایک لفظ کے شک مٹانے کے لئے سینکڑوں میل کا سفر طے کرنا، اس کا ذکر بھی آپ سن چکے ہیں۔ لیکن بات اسی پر ختم نہیں ہو گئی، بلکہ جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں، خود صحابہ بھی ایک دوسرے سے اس معاملہ میں پوچھ گچھ کا سلسلہ جاری رکھتے تھے، ہر ایک اپنے علم کو دوسرے کے علم پر پیش کرتا تھا، ان کے اس طرز عمل ہی سے روایت کی قوت بڑھتی چلی جاتی تھی۔

متابعات اور شواہد اسی کے ساتھ صحابہ سے روایت کرنے والے حتی الوسع اس کی کوشش

رتے تھے کہ ایک ہی روایت کو جن جن صحابیوں سے سننا ممکن ہو، اس میں کمی نہ کی جائے اصطلاح حدیث میں روایت کے
ں طریق عمل کا نام متابعت تھا، اور جو روایتیں اس طریقہ سے حاصل کی جاتی تھیں یعنی ایک ہی واقعہ کو تصدیق و توثیق
ے لئے شاگرد اپنے استاذ کے رفیقوں اور ہم عصروں سے بھی جو روایت کرتا ہے، تو ان کا نام اصطلاحاً متابعات و شواہد ہے۔
یسے جیسے زمانہ گذرتا گیا محدثین میں توابع و شواہد کے جمع کرنے کا شوق زیادہ شدت پذیر ہوتا رہا۔ آپ کو یہ سن کر حیرت ہوگی
صرف ایک مشہور حدیث انما الاعمال بالنیات سات سَو طریقوں سے مروی ہے، یعنی حدیث ایک ہے لیکن اس کی
ندیں سات سو ہیں، اور یہ عدد بھی ایک خاص نقطہ نظر سے ہے، ورنہ اس حدیث کے طرق در اصل اس سے بھی زیادہ ہیں۔
وایتوں میں قوت پیدا کرنے کا یہ بہترین طریقہ تھا، محدثین نے اس پر بہت زیادہ زور دیا ہے جس کا قصہ انشاء اللہ تعالیٰ
ینده آئے گا۔ حدیث کی مشہور کتاب صحیح مسلم میں امام مسلم کا نقطہ نظر زیادہ تر اسی عمل پر مرکوز رہا ہے۔ خیر یہ تو بعد کو ہوا لیکن
عہد صحابہ میں بھی جہاں تک ممکن ہوا ہے، اس طریقہ کے برتنے کی کوشش کی گئی ہے، اسی کا آج یہ نتیجہ ہے کہ غیر متواتر حدیثوں کا
بی جو ذخیرہ ہمارے پاس ہے زیادہ تر ان میں ایک ایک حدیث کے راوی آٹھ آٹھ دس دس صحابی ہیں۔ مشہور محدث امام
ترمذی نے اپنی کتاب میں جہاں اور بہت سی مفید باتیں اضافہ کی ہیں، اس کا بھی التزام کیا ہے کہ ہر حدیث کو بیان کرکے
آخر میں بتاتے ہیں کہ کن کن صحابیوں سے یہ حدیث مروی ہے، اور یہ تو واقعہ کی عینی شاہدوں یا ہمعصروں کی تعداد ہے، بعد کو
یعنی صحابہ کے شاگردوں، اور ان کے شاگردوں کے شاگردوں کے تعداد میں جو اضافہ ہوتا چلا گیا ان کا تو شمار کرنا مشکل ہے، لیکن
ہمارے پاس بحمد اللہ ایسی ایک نہیں متعدد کتابیں موجود ہیں، جن میں ہر حدیث کے تمام اسناد ایک جگہ جمع کر دیے گئے ہیں۔ آج
دنیا میں کون ہے جو گذرے ہوئے واقعات میں سے کسی ایک واقعہ کے متعلق بھی وثوق و اعتماد کے ان آہنین ذرائع کو پیش
کر سکتا ہے۔ باسورتھ اسمتھ حدیث کی اسی تاریخی ثقاہت کو دیکھ کر یہ لکھنے پر مجبور ہوا ہے:۔

”کوئی شخص یہاں (سیرت نبوی) کے متعلق نہ خود کو دھوکہ دے سکتا ہے اور نہ دوسرے کو دے سکتا ہے
کہ یہاں دن کی پوری روشنی ہے“ (لائف آف محمد از باسورتھ اسمتھ ص ۱۵)

لیکن ابھی بات پوری نہیں ہوئی، ایک اہم نقطہ بحث کا ابھی باقی ہے، قبل اس کے میں ادھر توجہ کروں، ایک
عام غلط فہمی کا ازالہ کرتے ہوئے چلوں۔ عموماً لوگوں کا یہ خیال ہے کہ ”حدیث“ کی ابتدائی نوعیت کسی علم کی نہیں تھی، متفرق طور
پر متفرق صحابیوں نے آنحضرت سے کچھ سنا، یا کچھ کرتے ہوئے دیکھا تھا، پھر یا تو بہ ضرورت انھوں نے کبھی اس کا اظہار
کر دیا یا بعض تو یہاں تک خیال کرتے ہیں کہ جیسے گھر کے پرانے بڑے بوڑھے اپنی ریٹائرڈ زندگی میں، نوجوانوں کے
درمیان بیٹھ کر اپنے عہد جوانی کے قصے دل بہلانے اور گرمیٔ بزم کے لئے بیان کرتے ہیں، یونہی العیاذ باللہ حدیث کی ابتدا
ہوئی، بعد کو پھر بہ تدریج لوگوں نے اس کو ایک علم بنا لیا؟

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوہ حسنہ اور سیرت طیبہ کو جو تعلق قرآن اور خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال کی

بنیاد پر مسلمانوں کی اخلاقی و مذہبی زندگی سے تھا، آپ اس کا حال سن چکے، کیا ان کے بعد کوئی ایک سکنڈ کے لئے بھی سوچ سکتا ہے، کہ خدانخواستہ کسی زمانہ میں بھی آپؐ کے اقوال و اعمال خصوصاً عہد صحابہ میں اتنے غیر اہم ہو سکتے تھے، جیسا کہ اس شیطانی وسوسہ کا اقتضا ہے، بلکہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خدا کی طرف سے اس کے ذمہ دار تھے، کہ قرآن کی تعمیلی شکل اور اس کے تشریحی مطالب کو خود اپنی زندگی کے نمونوں سے مسلمانوں کو بتائیں، اور مسلمان بھی اس کے ذمہ دار قرار دیے گئے ہیں کہ ان کو اپنی زندگی کا جزء بنائیں۔ اور دوسروں کو بھی اسی راہ پر چلانے کی کوشش کریں، ایسی صورت میں دیوانوں کے سوا اس قسم کے اوہام میں اور کون مبتلا ہو سکتا ہے۔ ماسوا اس کے خود عہد نبوت میں جیسا کہ کہہ چکا ہوں کہ قرآن اور سنن وسیرت کے سیکھنے سکھانے کے لئے ایک باضابطہ تعلیم گاہ صفہ کے نام سے قائم تھی، جس میں طلباء کی تعداد ایک ایک وقت میں اسی اسی تک ہوتی تھی۔ اس مدرسہ میں تعلیم دینے کا کام ابوہریرہ، ابن مسعود، زید بن ثابت، اُبی بن کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہم وغیرہم عہد صحابہ میں انجام دیتے تھے، مسلمان ہو ہو کر باہر سے لوگ آتے تھے اور حسب ضرورت اس مدرسہ میں قیام کر کے اپنے گھر جاتے تھے۔ خود قرآن میں اس کا حکم بھی دیا گیا تھا جیسا کہ ارشاد ہے

فلولا نفر من کل فرقۃ منھم طائفۃ لیتفقھوا فی الدین ولینذروا قومھم اذا رجعوا الیھم لعلھم یحذرون (توبہ)	پھر ایسا کیوں نہ ہو کہ ہر فرقہ سے ایک گروہ روانہ ہو تاکہ دین کی سمجھ حاصل کرے اور اپنے لوگوں کو ڈرائے جب ان کی طرف واپس ہو، ہو سکتا ہے کہ لوگ (اس کے بعد) پارسائی اختیار کریں۔

اس مدرسہ میں انھیں کن کن باتوں کی باضابطہ تعلیم دی جاتی تھی، حدیثوں میں اس کا تفصیلی ذکر موجود ہے، فروہ بن مسیک جو یمن سے مدینہ منورہ آئے تھے اور بعد کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے یمن کے قبائل مراد و زبید مذحج کے گورنر بنا کر بھیجے گئے، ان کے ذکر میں بیان کیا جاتا ہے۔

جاء من الیمن وتعلم القرآن وفرائض الاسلام وشرائعہ (ابن سعد)	یمن سے آئے اور قرآن، اسلام کے فرائض و قوانین کی تعلیم حاصل کی۔

اور یہ تو ان لوگوں کی تعلیم کا طریقہ تھا، جو خود مدینہ چلے آتے تھے۔ لیکن جو نہیں آ سکتے تھے، ان کے لئے آستانہ نبوت سے باضابطہ معلمین بھیجے جاتے تھے۔ اسی سلسلہ میں بیر معونہ اور رجیع کے معلموں کا مشہور واقعہ ہے، جن میں ان بیچارے معلموں کو دھوکہ دے کر شہید کر دیا گیا تھا۔ ان کے سوا حضرت معاذ بن جبل حضرت علی کرم اللہ وجہہ منجملہ اور اغراض کے تعلیمی غرض سے بھی یمن بھیجے گئے تھے۔ حضرت معاذ کو جو حکم دیا گیا تھا اس کا ذکر پہلے آ چکا ہے۔ حضرت ابو امامہ باہلی رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں،

بعثنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الی قومی ادعوھم الی اللہ تبارک تعالی واعرض علیھم شرائع الاسلام (مستدرک)	مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی قوم کی طرف اس لئے بھیجا کہ ان کو اللہ تبارک و تعالیٰ کی طرف بلاؤں، اور ان پر اسلامی قوانین پیش کروں

الغرض قرآن کے ساتھ ساتھ شرائع اسلام یعنی قرآن کے احکام کی تعمیلی شکل جو صحابہ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم خود کر کے بتایا کرتے تھے، عہد نبوت ہی میں ان دونوں ہی کی حیثیت مستقل علم کی ہو چکی تھی۔ حدیث کا وہ ذخیرہ جس میں تعلیم و تعلم پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف پیرایوں میں ابھارا ہے، آج کل کی لیڈرانہ تقریروں میں تو اس کے تحت داغ اور امیر کی شاعری اور شیکسپیئر کالی داس کے ڈراموں کو تک داخل کر دیا جاتا ہے، لیکن سچ یہ ہے کہ زیادہ تر ان سے مراد ان ہی چیزوں کی تعلیم تھی، پھر حضور صلی اللہ و علیہ وسلم کے بعد جیسا کہ ہونا چاہیئے تھا، نہ صرف مدینہ منورہ بلکہ ان تمام مرکزی شہروں میں جہاں جہاں اسلام کی حکومت پہونچ چکی تھی، اور حضرات صحابہ کرام کی مختلف جماعتیں وہاں جا کر توطن پذیر ہو گئی تھیں، جن میں خود مدینہ منورہ مکہ معظمہ یمن یمامہ بحرین دمشق کوفہ بصرہ مصر کو خاص اہمیت حاصل ہے جلیل القدر اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان شہروں کے جوامع میں قرآن کے ساتھ ساتھ روایت حدیث کے باضابطہ حلقے قائم کر دے تھے۔ مدینہ منورہ میں مردوں میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور عورتوں میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے خدمات اس سلسلہ میں سب سے زیادہ نمایاں تھے۔ اسی طرح دمشق میں حضرت ابو درداء، کوفہ میں عبداللہ بن مسعود، بصرہ میں عمران بن حصین، ازیں قبیل ہر مرکزی شہر میں ان اغراض سے تعلیمی حلقے جاری ہو چکے تھے حضرت ابو ہریرہ کا ذوق روایت تو اس حد تک پہونچا ہوا تھا، کہ جمعہ کے دن بھی چوں کہ مسجد میں عام مسلمانوں کا بڑا مجمع جمع ہو جاتا تھا، اس مجمع کو غنیمت خیال کر کے تقریباً ہر جمعہ میں قبل اس کے کہ امام خطبہ کے لئے منبر پر آئے، آپ کا یہ عام قاعدہ تھا جیسا کہ حاکم کی مستدرک میں روایت ہے کہ

کان ابوھریرۃ یقوم یوم الجمعۃ الی جانب المنبر .... ثم یقبض علی رمانۃ المنبر یقول قال ابوالقاسم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قال محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قال الصادق المصدوق صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ..... فاذا سمع باب المقصورۃ بخروج الامام جلس۔

جمعہ کے دن حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ منبر کے ایک کنارے کھڑے ہو جاتے پھر منبر کا گولا تھام کر فرماتے "فرمایا ابوالقاسم صلی اللہ علیہ وسلم نے" "فرمایا محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے" "فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے" "فرمایا الصادق المصدوق صلی اللہ علیہ وسلم نے" پھر جب انھیں محسوس ہوتا کہ "مقصورہ"[1] کے دروازہ سے امام نکل رہا ہے، بیٹھ جاتے۔

ابن سعد کی ایک تابعی سے روایت ہے:۔

دخل مسجد حمص فاذا الحلقۃ فیھم رجل جمیل

کہ وہ (شام کے مشہور شہر حمص میں داخل ہوئے، کیا دیکھتے ہیں

---

[1] خلفاء پر جب اچانک حملے ہونے لگے، تو مسجد میں ایک کمرہ خاص بنا دیا جاتا تھا جس میں خلیفہ نشست وغیرہ پڑھتے اور اس سے باہر ہو کر منبر پر آتے اسی کو مقصورہ کہتے تھے ۱۲

براح الثنایا وفی القوم من ھو أسن منہ وھم قبلون علیہ یستمعون کلامہ فسألتہ ن انت فقال انا معاذ بن جبل

(ابن سعد)

کہ ایک خوبصورت آدمی جن کے دانت الگ الگ تھے، وہ لوگوں کے مجمع میں بیٹھے ہوئے ہیں، مجمع میں ایسے آدمی بھی ہیں جو اس حسین آدمی سے عمر میں بڑے ہیں، اور اسپر جھکے ہوئے اس کی باتیں سن رہے ہیں، میں نے پوچھا تم کون ہو، بولے میں معاذ بن جبل ہوں۔

بصرہ کا ذکر کرتے ہوئے ایک دوسرے صاحب کا بیان ہے:-

تیت البصرۃ فدخلت المسجد فاذا انا بشیخ بیض الراس واللحیۃ مستند الی اصطوانۃ ی حلقۃ یحدثھم۔ (ابن سعد)

میں بصرہ پہونچا، اور مسجد میں داخل ہوا، کیا دیکھتا ہوں کہ ایک بوڑھے آدمی جن کے سر کے بال سپید تھے مسجد کے ستون سے پیٹھ لگا کر ایک حلقہ میں بیٹھے ہوے حدیثیں بیان کر رہے ہیں،

ہشام بن عروہ کہتے ہیں کہ

کان لجابر بن عبد اللہ حلقۃ فی المسجد النبوی یوخذ عنہ العلم (اصابہ ج ا صـ۲۱۳)

مسجد نبوی میں حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ایک حلقہ درس تھا جس میں لوگ ان سے علم حاصل کرتے تھے۔

اور یہ سب کے سب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جلیل القدر اکابر اصحاب میں ہیں، اس کے بعد پھر کون کہہ سکتا ہے کہ "فن حدیث" کی حیثیت عہد نبوت یا عہد صحابہ میں باضابطہ علم کی نہیں، بلکہ افواہی قصوں کی تھی۔

حدیث کی کتابی تدوین

بہرحال یہاں تک تو "فن حدیث" کے وثوق و اعتماد کے صرف دو ذریعوں پر بحث ہوئی یعنی یک تو تعامل دوسری روایت، لیکن آخر میں ایک سوال رہ جاتا ہے اور دنیا کے اس کا غذی دور میں عموماً گدگدی اسی کی اٹھتی ہے، دل ہی دل میں لوگ سوال کرتے ہیں، کہ یہ سب کچھ سہی لیکن کتابی شکل میں آخر تاریخ کا یہ حصہ کب آیا گویا اسی زمانہ کو تدوین حدیث کا آغاز قرار دینا چاہتے ہیں، اگرچہ واقعہ تو یہی ہے کہ گذشتہ بالا سازو سامانوں کے ہوتے ہوئے شاید اس کی ضرورت بھی باقی نہیں رہتی، بلکہ کتابت کے متعلق جو عربی مذاق تھا، اس کو دیکھتے ہوئے تو اس کی اور بھی کوئی اہمیت نہیں رہجاتی فقہ و حدیث کے مشہور امام اوزاعی تو فرمایا کرتے تھے:-

کان ھذا العلم شیئاً شریفاً اذ کان من افواہ الرجال یتلاقونہ ویتذاکرونہ فلما صار فی الکتب ذھب نورہ وصار الی غیر اھلہ

(جامع بیان العلم، ج ۱ صـ۹)

حدیث کا علم بہت ہی قیمتی اور شریف اس وقت تک تھا جب لوگوں کے منھ سے حاصل کیا جاتا تھا لوگ باہم ملتے جلتے رہتے تھے اور آپس میں اسی کا مذاکرہ کرتے رہتے تھے لیکن جب سے حدیثیں کتابوں میں درج ہوگئیں، اس کا نور اور اسکی رونق جاتی رہی اور ایسے لوگوں میں پہونچ گیا جو اس کے اہل نہیں ہیں۔

اور اسی لئے تاریخ حدیث کے بیان کرنے والوں نے حدیث کی کتابی تدوین کا آغاز کب سے ہوا، اس کی طرف بہت کم توجہ کی۔ لیکن آج اس کا نتیجہ ہے کہ جو نہیں جانتے ہیں ان مسکینوں کو تو یہ باور کرایا جاتا ہے، کہ مسلمانوں کی اس حدیث کا کیا اعتبار جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دو سو برس بعد مدون ہوئی۔ اچھے پڑھے لکھے لوگ اپنے اس دعوی کے ثبوت میں بیچارے امام بخاری اور مسلم کے سن وفات کو پیش کر دیتے ہیں، گویا ان کے نزدیک سب سے پہلے حدیثوں کو جس نے قلمبند کیا، وہ یہی حضرات تھے، اور یہ تو خیر جاہلوں کی باتیں ہیں۔ لیکن بعض محدثین کے بیانات سے عموماً ارباب واقفیت بھی اس مغالطہ میں مبتلا ہیں کہ سب سے پہلے جس نے حدیث مدون کی وہ ابن شہاب زہری ہیں جن کا زمانہ پہلی صدی کے اختتام کا ہے، گویا یہ لوگ ایک سو برس پیچھے ہٹ کر کتابت حدیث کی تاریخ کو لے جاتے ہیں، اس زمانہ کے مطالبوں سے پریشان ہو کر بعض بزرگوں نے جب زیادہ کد و کاوش کنج و کاؤ سے کام لیا، تو انھوں نے اعلان فرمایا کہ زیادہ تو نہیں، لیکن حدیثوں کا تھوڑا بہت حصہ عہد صحابہ، بلکہ عہد نبوت میں بھی قید تحریر میں آگیا تھا۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ اب تک جو کچھ کہا گیا ہے، اس میں پوری تحقیق سے کام نہیں لیا گیا، ان لوگوں کو اپنی تائید میں یہ مغالطہ بھی مل جاتا ہے کہ عہد نبوت و صحابہ میں تحریری ساز و سامان ہی کہاں تھا۔ تھوڑا بہت جو تھا، اسی حیثیت سے کچھ چیزیں قید تحریر میں آگئی ہوں گی، کتابت و تحریر کے سامانوں کی اس زمانہ میں عرب کے اندر کیا حالت تھی یہ ایک مستقل مضمون ہے، شروع میں بھی اس کی طرف میں نے اشارہ کیا ہے، اور اس وقت اگر تفصیل سے کام لیتا ہوں تو بات بہت طول ہو جائے گی، اس کے لئے مستقل مقالہ کی ضرورت ہے۔ لیکن کم از کم جو قرآن پڑھتا ہے، میری سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ وہ عرب جو قرآن کا ماحول ہے، اس کے متعلق تحریری سامانوں کے اس افلاس کا کس طرح یقین کر سکتا ہے، بھلا جس کتاب کا نام ہی قرآن (پڑھی جانے والی چیز) ہو، فاتحہ کے بعد جس کی پہلی سورۃ کی پہلی آیت کا دوسرا لفظ کتاب ہو، اور مسلسل کتاب زبر اسفار قراطیس لوح کا ذکر تقریباً ہر بڑی سورہ میں بار بار آتا ہو، پہلی آیت جو پیغمبر پر نازل ہوئی اس میں پڑھنے لکھنے قلم تک کا ذکر موجود ہو، روشنائی (مداد) دوات سفرہ کاتبین سجل کا ذکر جس کتاب میں پایا جاتا ہو، کون خیال کر سکتا ہے کہ یہ کتاب ایسے لوگوں میں اتری جو نوشت و خواند سے ایسے عاری تھے جیسے جنگل کے بھیل، اور گونڈ ہیں۔ سر دست[۱] صرف اسی ایک قرآن کے اندرونی اشارہ پر اکتفا کر کے میں اب اپنے دعوی کا اعلان کرنا چاہتا ہوں کہ عملی تواتر اور روایت ان دو ذریعوں کے سوا حدیث کی کوئی معمولی مقدار نہیں، بلکہ اس وقت ہمارے پاس اس تاریخ کا جو ذخیرہ موجود ہے اس کا غالب ترین حصہ کم از کم نمبر اول کی صحیح حدیثوں کی جو تعداد ہے، خود اس کے عینی شاہدوں کے زمانہ میں زیادہ تر ان ہی کے ہاتھوں سے قید تحریر میں آچکا تھا، اور اس کے بعد اس دعوی پر یہ اور اضافہ کرتا ہوں کہ ان واقعات کا ایک بڑا جز جس طرح تواتر کے ساتھ مسلمانوں میں منتقل ہوتا چلا آرہا ہے، اور روایت کے متابعاتی و شواہدی طریقوں سے جس طرح یہ موجود

---

[۱] میں نے اب تک اس موضوع پر کوئی مستقل مقالہ تو نہیں لکھا ہے لیکن "جاہلیت اولی و جاہلیت آخری" کے عنوان سے جو میرا مضمون شائع ہو چکا ہے اس میں پیش نظر مواد کا ایک حصہ آگیا ہے خدا نے چاہا تو انشاء اللہ اپنے معلومات کو کسی مستقل کتاب کی شکل میں مرتب کردوں گا ۱۲

شکل میں آیا ہے ٹھیک اسی طرح اپنے چشم دید گواہوں کے زمانہ سے قید تحریر میں آکر مسلسل اسی طرح کتابی شکل میں باقی رہا اور اب تک باقی ہے! میرا مطلب یہ ہے کہ کسی کو یہ شبہہ نہ ہو کہ ممکن ہے، کہ ابتداء میں بعض لوگوں نے حدیث کے بعض ذخیروں کو لکھا ہو لیکن بعد کو وہ کتابی ذخیرے ضائع ہوگئے، اور درمیان میں پھر زبانی روایت پر اس کا دار و مدار رہ گیا ہو، اور آخر میں لوگوں نے اسے پھر قلم بند کیا۔ ایسا سمجھنا بھی قطعاً واقعات کے خلاف ہے، بلکہ جس طرح گلستاں جب سے سعدی نے لکھی، اور اب تک درمیان میں غائب ہوئے بغیر اسی کتابی شکل میں منتقل ہوتی چلی آرہی ہے، یعنی اس کتاب پر ایسا کوئی زمانہ نہیں گذرا کہ دنیا سے بالکلیہ ناپید ہوگئی ہو، اور پھر لوگوں نے اپنے حافظوں کے ذریعہ سے اسے دوبارہ قید تحریر میں لالیا ہو جیسا کہ توارت وغیرہ کے متعلق ایک دفعہ نہیں بار بار یہ واقعہ پیش آتا رہا ہے کہ تین تین سو چار چار سو سال کے لئے اس کا تحریری سرمایہ ناپید ہوگیا، اور پھر سینوں سے اس کو سفینوں میں لانے کی کوشش[1] کی گئی، حدیث کے اس کتابی ذخیرہ پر بحمد اللہ یہ حادثہ کبھی نہیں گذرا۔

بہرحال یہ تو میرا دعویٰ ہے، اس دعوی کے ثبوت کے جو ذرائع میرے پاس ہیں اب انہیں پیش کرتا ہوں لیکن قبل اس کے کہ اور باتیں بیان کی جائیں پہلے یہ سن لینا چاہئے کہ اس وقت امت کے ہاتھ میں حدیثوں کا جو معتبر اور قابل اعتماد ذخیرہ موجود ہے، اس کی مقدار اور ان حدیثوں کی تعداد کیا ہے؟ یوں تو عام طور سے جہاں حدیث کے حافظوں کا ذکر کیا جاتا ہے، ان کی تعداد بہت زیادہ بتائی جاتی ہے، مثلاً کہا جاتا ہے کہ امام احمد بن حنبل کو نامعتبر، یا رد شدہ حدیثوں کے سوا جو قابل اعتماد حصہ محفوظ تھا اس کی تعداد سات لاکھ کے اوپر تھی، اسی طرح امام ابو زرعہ جو حفاظ حدیث میں خاص امتیاز رکھتے ہیں ان کی حدیثوں کی تعداد بھی سات لاکھ بتائی جاتی ہے، امام بخاری کے متعلق عام طور سے لکھتے ہیں کہ انھیں دو لاکھ کے قریب تو غیر صحیح اور ایک لاکھ صحیح حدیثیں زبانی یاد تھیں، امام مسلم سے لوگوں نے ان کا یہ دعویٰ نقل کیا ہے کہ اپنی کتاب صحیح کے متعلق خود فرمایا کرتے تھے کہ اپنے کان سے سنی ہوئی تین لاکھ حدیثوں سے میں نے یہ مجموعہ منتخب کیا ہے، اسی طرح مختلف لوگوں کی طرف بڑے بڑے اعداد منسوب ہیں لیکن ان بیانوں سے عوام جو سمجھتے ہیں کیا اس کا مقصود بھی وہی ہے؟ بات یہ ہے کہ لوگ محدثین کی ایک اصطلاح سے چوں کہ ناواقف ہیں اس لئے انھیں حیرت ہوتی ہے، بلکہ یہ بھی وسوسہ ہوتا ہے کہ مثلاً امام بخاری کو اگر اتنی صحیح حدیثیں زبانی یاد تھیں تو پھر انھوں نے اپنی کتاب میں سب کو کیوں درج نہیں کیا؟ واقعہ یہ ہے کہ حدیث کی حفاظت و بیان کا جو روایتی طریقہ ہے پہلے بھی میں بتا چکا ہوں کہ اس طریقہ کو مستحکم و مضبوط بنانے کے لئے ابتداءً سے متابعات و شواہد کی کثرت کا طریقہ مروج ہوگیا تھا یعنی ایک ایک حدیث کو جن جن سندوں اور طریقوں سے روایت کرنا ممکن تھا، محدثین ان تمام طرق کو جمع کرنے کی کوشش کرتے تھے، اور ان کی یہ اصطلاح تھی کہ ایک ہی حدیث کو ان کے مختلف طریقوں کے اعتبار سے بجائے ایک کے، طریقوں کے حساب سے شمار کرتے تھے، مثلاً انما الاعمال بالنیات کی حدیث جیسا کہ بیان کر آیا ہوں واقع کے لحاظ سے ایک حدیث ہے لیکن محدثین چوں کہ

---

[1] منجملہ دیگر عام مصادر کے میری کتاب النبی الخاتم صلی اللہ علیہ وسلم میں توارت و انجیل وغیرہ کے متعلق اس سلسلہ کے کافی معلومات مل سکتے ہیں ۱۲

سات سو طریقوں سے اسے روایت کرتے ہیں، اس لئے بجائے ایک کے صرف اسی ایک حدیث کی تعداد سات سو ہو جاتی ہے اور یہ کسی ایک حدیث کا نہیں بلکہ حدیث کے بیشتر حصہ کا یہی حال ہے، حدیثوں کے ان عجیب و غریب اعداد کی بنیاد ایک تو یہ ہے دوسرے پہلے بھی بتا چکا ہوں کہ گو ابتدا میں حدیث جس کے لفظی و لغوی معنی بات کے ہیں، اس کا اطلاق محض آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ملفوظات طیبہ پر کیا جاتا تھا پھر اس میں وسعت پیدا ہوئی۔ اور آپ کے افعال و تقریرات کو بھی اس کے نیچے درج کیا گیا اسی طرح رفتہ رفتہ اطلاق میں اور کشادگی پیدا ہوئی اور صحابہ کے اقوال و فتاوی، فیصلوں بلکہ تابعین و تبع تابعین تک کی چیزوں کو بعض لوگوں نے "حدیث" کے نیچے داخل کر دیا۔ ظاہر ہے کہ اس کی وجہ سے قدرتاً حدیثوں کی تعداد بڑھ جاتی ہے، لیکن عامی خیال کرتے ہیں کہ یہ براہ راست رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں کی تعداد ہے، صاحب توجیہ النظر لکھتے ہیں:-

ان کثیرا من المتقدمین کانوا یطلقون اسم الحدیث علی ما یشمل آثار الصحابة والتابعین وتابعیهم وفتاواهم ویعدون الحدیث المروی باسنادین حدیثین ص۹۳

متقدمین کی بڑی جماعت عموماً حدیث کے لفظ کا اطلاق ایسے عام مفہوم پر کرتی تھی جس میں صحابہ تابعین تبع تابعین کے آثار و فتاوی سب داخل ہیں نیز ایک ہی حدیث جو دو سندوں سے مروی ہوتی اسے دو حدیث قرار دیتے تھے۔

اور یہی مراد ہے ابن جوزی کے اس فقرے سے جو حدیثوں کے ان اعداد کو درج کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ ان ا مراد بهذا العدد الطرق لا المتون (تلقیح ص۱۸۵) یعنی ان اعداد سے مقصد حدیثوں کے متن کی مقدار نہیں ہے بلکہ ان کے طریقے اور اسناد مراد ہیں۔

یہ حدیث کے ان بڑے بڑے اعداد کا حال ہے، لیکن واقعی وہ حدیثیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی مبارک سے براہ راست تعلق رکھتی ہیں، آپ کو سن کر حیرت ہوگی کہ کہاں لاکھ دو لاکھ چار لاکھ کی باتیں تھیں، اور اب سنئے کہ امام بخاری کی صحیح سند کے ساتھ جو حدیثیں مروی ہیں ان کی تعداد دے کے بمشکل دو ہزار چھ سو دو ہے، اور امام مسلم کی حدیثوں کی تعداد کل چار ہزار ہے لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ مسلم میں بخاری کے سوا چار ہزار حدیثیں ہیں، بلکہ زیادہ تر دونوں کی روایتیں مشترک ہیں، اور یہ تو ان دو بڑی کتابوں کی حدیثوں کا حال ہے۔ موطا امام مالک جسے بعض لوگ صحیح بخاری پر بھی ترجیح دیتے ہیں، اس کی کل حدیثوں کی تعداد صرف چھ سو ستیانوے ہے۔ بہر حال شمار کرنے سے یہ معلوم ہوا ہے کہ صحیح حسن ضعیف ہر قسم کی تمام حدیثیں جو اس وقت صحاح ستہ مسند احمد اور دوسری کتابوں میں موجود ہیں ان کی تعداد پچاس ہزار بھی نہیں ہے، اور یہ ہر رطب و یابس کے مجموعہ کی تعداد ہے، تمام کتابوں سے چھان بین کر ابن جوزی نے نہیں، جن کی تنقید کا معیار بہت سخت ہے، بلکہ حاکم جو نرمی اور مسامحت میں مشہور ہیں ان کا بیان ہے کہ اول درجہ کی صحیح حدیثوں کی تعداد دس ہزار تک بھی نہیں پہونچ سکتی، اب حاکم کی اس رپورٹ کو اپنے سامنے رکھئے اور اس کے بعد میں بتانا چاہتا ہوں کہ ان خطوط، اور معاہدوں، امان ناموں، جاگیر و قطائع وغیرہ کے فرامین کے سوا جن کو خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لکھوایا ہے، اور جن کی تعداد سینکڑوں سے متجاوز ہے، اور حدیث کی جو تعریف ہے، ان پر وہ بھی صادق

صفحہ ۹۸ پر

آتی ہے، حدیث کے اس کتابی ذخیرہ کے سوا، عہد نبوت و قرون صحابہ میں حدیث کا کتنا سرمایہ کتابی شکل اختیار کر چکا تھا، دنیا کو یہ سن کر حیرت ہوگی، لیکن کیا کیا جائے واقعہ یہی ہے، کہ دس ہزار ہی نہیں بلکہ اس سے بھی کہیں زیادہ تعداد میں حدیثیں عہد نبوت و عہد صحابہ میں کتابی شکل اختیار کر چکی تھیں آخر آپ خود جوڑ لیجئے۔ محدثین لکھتے ہیں کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیثوں اور مرویات کی تعداد پانچ ہزار تین سو چوہتر ہے، اور ایک ذریعہ سے نہیں مختلف ذرائع سے یہ ثابت ہے کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ خود اپنی یادداشت کے لئے بھی اپنی روایت کردہ حدیثوں کو کتابی شکل میں لے آئے تھے۔ حافظ بن عبد البر نے جامع میں ان کی اس کتاب کے واقعہ کو اس طرح درج کیا ہے، کہ مشہور صحابی عمرو بن امیہ ضمیری جن کو طلسم ہوشربا اور داستان امیر حمزہ نے عمرو عیار کے نام سے بہت مشہور کر دیا ہے ان کے صاحبزادے حسن بیان کرتے ہیں

تحدثت عند ابی هریرة بحدیث فانکره فقلت انی قد سمعته منك فقال ان کنت سمعته منی فهو مکتوب عندی فاخذ بیدی الی بیته فارانا کتبا کثیرة من حدیث رسول الله صلی الله علیه وسلم فوجد ذلك الحدیث فقال قد اخبرتك انی کنت حدثتك به فهو مکتوب عندی

میں نے ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے سامنے ایک حدیث بیان کی انھوں نے اس کا انکار کیا، میں نے عرض کیا کہ اس حدیث کو میں نے آپ ہی سے سنا ہے، تو بولے اگر تم نے مجھ سے یہ حدیث سنی ہے تو پھر وہ میرے پاس لکھی ہوئی ہوگی، پھر انھوں نے میرا ہاتھ پکڑا، اور اپنے گھر میں لے گئے، مجھے انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں کی بہت سی کتابیں دکھائیں اسی (ذخیرہ) میں وہ حدیث بھی پائی گئی، حضرت ابو ہریرہ نے اس کے بعد فرمایا میں نے تمہیں خبر دی تھی کہ میں نے جو حدیث تم سے بیان کی تھی وہ میرے پاس لکھی ہوئی ہے۔

حافظ ابن حجر نے بھی دوسری سند سے فتح الباری میں اس روایت کو درج کیا ہے، اس سے صرف یہی نہیں معلوم ہوتا ہے کہ ابو ہریرہ کے پاس صرف چند حدیثیں لکھی ہوئی تھیں بلکہ جو کچھ وہ روایت کرتے تھے کتابی شکل میں ان کے پاس وہ موجود تھی جب یہ معلوم ہے کہ ان کی مرویات کی تعداد پانچ ہزار سے اوپر ہے، اس کے بعد اگر کہا جائے کہ پانچ ہزار سے اوپر حدیثیں اس وقت لکھی ہوئی تھیں، تو کیا اس روایت سے اس کی تصدیق نہیں ہوتی، اور صرف ایک نسخہ نہیں، دارمی جو حدیث کی مستند کتاب ہے اور اس کا درجہ صحاح ستہ کی اکثر کتابوں سے بلند ہے، اس میں ہے کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مشہور شاگرد بشیر بن نہیک نے ایک نسخہ ان کی حدیثوں کا تیار کر کے خود ان کو پڑھ کر سنایا تھا، روایت کے الفاظ یہ ہیں:۔

(حاشیہ صفحہ ۹۷)۔ ہمارے فاضل و عزیز دوست ڈاکٹر مولانا حمید اللہ صاحب ڈی فل ڈی لٹ پروفیسر جامعہ عثمانیہ نے ان کو ایک خاص فاضلانہ ترتیب کے ساتھ جمع بھی کر دیا ہے" اور اب ان کی یہ کتاب مصر میں الوثائق السیاسۃ کے نام سے طبع ہو رہی ہے اب تک ڈاکٹر صاحب ممدوح کو عہد نبوی کے (۲۷۰) کتابی وثایق مل چکے ہیں ۱۲

عن بشیر بن نهیک قال کنت اکتب ما اسمع من ابی هریرۃ فلما اردت ان افارقہ اتیتہ بکتابہ فقرئتہ علیہ و قلت لہ ھذا ما سمعت منک قال نعم۔

حضرت بشیر بن نہیک سے روایت ہے انھوں نے کہا کہ ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے جو حدیثیں میں سنا کرتا تھا انھیں لکھ لیا کرتا تھا جب میرا ارادہ ان سے الگ ہونے کا ہوا، تو ان کی حدیثوں کی جو کتاب تھی اسے لے کر ان کی خدمت میں حاضر ہوا، پھر ان حدیثوں کو ان کے سامنے پڑھ گیا، اور آخر میں کہا کہ یہ وہ حدیثیں ہیں، جو آپ سے میں نے سنی ہیں، بولے ہاں۔

ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دوسرے شاگرد ہمام بن منبہ ہیں جو یمن کے امراء میں تھے، ایک زمانہ تک انکی خدمت میں رہے اور انکی حدیثوں کو جمع کیا، جو صحیفہ ہمام کے نام سے مشہور ہے[1] امام احمد بن حنبل نے اس کتاب کا ایک بہت بڑا حصہ اپنی مسند میں داخل کر دیا ہے، گویا اس کے معنی یہ ہوئے کہ اسی زمانہ میں حضرت ابو ہریرہ کی حدیثوں کے یہ تین نسخے تیار ہو چکے تھے، اور ان کا تو پتہ چلا ہے، ورنہ ابو ہریرہ جن کے شاگردوں کی تعداد، امام بخاری نے آٹھ سو کے قریب بتائی ہے، کون کہہ سکتا ہے کہ کتنوں نے اس کام کو کیا ہوگا خود حضرت ابو ہریرہ نے اپنے لئے جب نسخہ تیار کیا تھا، تو کیا وجہ ہو سکتی تھی کہ ان کے شاگرد ایسا نہ کرتے، اور اس سے بھی میں اور آگے بڑھتا ہوں، صحیح بخاری میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ، کا ایک یہ بیان درج ہے، کہ وہ فرمایا کرتے تھے۔

مامن اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم احد اکثر حدیثا عنہ منی الا ماکان من عبد اللہ بن عمرو

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابیوں میں حضور کی حدیثوں کا بیان کرنے والا مجھ سے زیادہ کوئی نہیں ہے، البتہ عبد اللہ بن عمرو بن العاص اس سے مستثنیٰ ہیں، (یعنی ان کی حدیثوں کی تعداد مجھ سے بھی زیادہ ہے)

جس کے یہ معنی ہوئے کہ عبد اللہ بن عمرو کی مرویات کی تعداد خود حضرت ابو ہریرہ کے ذاتی اعتراف کی بنیاد پر، ان کی حدیثوں سے زیادہ تھی جب ان کی حدیثیں پانچ ہزار سے زائد ہیں، تو اس کا کھلا ہوا نتیجہ یہ پیدا ہوتا ہے کہ عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے روایات کی تعداد پانچ ہزار تین سو چوہتر سے یقیناً زائد ہونی چاہئے، بخاری کے صریح الفاظ کا یہ تقاضا ہے اب سنئے کہ عبد اللہ بن عمرو بن العاص کی حدیثوں کا کیا حال ہے، بخاری کی اسی حدیث میں ابو ہریرہ ہی کا یہ بیان درج ہے، کہ وہ لکھا کرتے تھے، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ، کے مجموعہ کے متعلق تو صحیح طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں انھوں نے اسے جمع کیا تھا یا وفات کے بعد، لیکن عبد اللہ بن عمرو بن العاص جن کی حدیثوں کی تعداد حضرت ابو ہریرہ ہی کے بیان کے مطابق ان کی حدیثوں سے زیادہ اور کثیر ہے، ان کے متعلق تو سب کو معلوم ہے کہ خود براہ راست آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے وہ آپ کی حدیثیں لکھا کرتے تھے، ان کا اپنا بیان ہے جس کا حافظ ابن عبد البر، ابن سعد بلکہ ابو داؤد وغیرہ سب نے ذکر کیا ہے، میں حافظ ابن عبد البر کی روایت درج کرتا ہوں، خود حضرت عبد اللہ بن عمرو فرماتے ہیں

[1] اس کا ایک قلمی نسخہ ڈاکٹر حمید اللہ صاحب نے برلن کے کتب خانہ میں ڈھونڈھ نکالا ہے ۱۲

قلت یا رسول اللہ اکتب کل ما اسمع منک؟ قال نعم قلت فی الرضاء والغضب؟ قال نعم فانی لا اقول فی ذلک کلہ الا حقاً۔

میں نے عرض کیا یا رسول اللہ کیا "وہ سب کچھ" جو آپ سے سنتا ہوں لکھ لیا کروں؟ حضور نے فرمایا ہاں میں نے عرض کیا کہ خوشی اور غصہ دونوں حالتوں کی باتوں کو لکھ سکتا ہوں، آپ نے فرمایا ہاں کیونکہ ان سب حالات میں میں نہیں کہتا لیکن صرف "حق"۔

اس روایت میں "اکتب کل ما اسمع" وہ سب کچھ جو آپ سے سنتا ہوں لکھ لیا کروں قابل غور ہے، جس کے یہی معنی ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عمرو، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہر بات خواہ رضا یا غضب کے حال کی ہو، لکھ لیا کرتے تھے محدثین میں ان کی یہ کتاب "صحیفہ صادقہ" کے نام سے مشہور ہے اور اکثر کتابوں میں اس کا تذکرہ موجود ہے، وہ خود بھی اپنی اس کتاب کو اسی نام سے یاد کرتے تھے، مجھے اس وقت حوالہ محفوظ نہیں ہے، لیکن خیال آتا ہے کہ کسی کتاب میں میں نے یہ بھی پڑھا ہے کہ یہ نام خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا تجویز کیا ہوا تھا، واللہ اعلم بالصواب

ابھی مجھے بہت کچھ کہنا ہے، لیکن صرف اسی حد تک میں ٹھہر جاؤں، تو گذشتہ بالا وثائق کے بنیاد پر کہہ سکتا ہوں کہ اول درجہ کی صحیح روایتوں کی جو تعداد حاکم نے بیان کی ہے، یعنی انھوں نے یہ نہیں لکھا ہے کہ صحیح حدیثوں کی تعداد دس ہزار ہے، بلکہ ان کے الفاظ یہ ہیں۔

الاحادیث التی فی الدرجۃ الاولیٰ لاتبلغ عشرۃ آلاف توجیہ النظر ص ۹۳

اعلیٰ درجہ کی حدیثوں کی تعداد دس ہزار تک نہیں پہونچ پاتی،

جس کا یہی مطلب ہوا کہ دس ہزار سے کم ہی ہیں، اور معلوم ہو چکا کہ عہد نبوت ہی میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے جو مجموعہ جمع ہوا، اس کی روایتوں کو پانچ ہزار تین سو چوہتر سے تو یقیناً زیادہ ہونا چاہیئے اور ایسے موقع پر ہمیں اس کا بھی خیال کرنا چاہیئے، کہ عام محاوروں میں "اکثر" کا لفظ جب استعمال کیا جاتا ہے، تو اس سے محض ریاضیاتی زیادتی مراد نہیں ہوتی، یعنی صرف دو تین عدد کی زیادتی کبھی مقصود نہیں ہوسکتی بلکہ اکثریت معقول تعداد کی زیادتی کو چاہتی ہے، گویا حاکم نے صحیح حدیثوں کی جو تعداد بیان کی ہے، قریب قریب یہ باور کرنا چاہیئے کہ عہد نبوت ہی میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں کی اتنی مقدار خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے حضرت عبداللہ بن عمرو قلم بند کر چکے تھے، اور ان کے لکھنے پڑھنے کا جو حال تھا اس کے حساب سے ان کے لئے یہ کام کچھ دشوار بھی نہ تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد بھی جب شام و مصر میں ان کو عیسائیوں اور یہودیوں وغیرہ کی کتابیں ملیں تو ان سے منتخب کر کے انھوں نے ایک بڑا دفتر تیار کیا تھا اور اس کا نام انھوں نے صحیفہ یرموکیہ رکھا تھا، کسی موقعہ پر ان کی اس کتاب کا ذکر آئے گا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ تالیف و تصنیف سے انھیں فطری لگاؤ تھا بہر حال پھر بھی ابھی تک میرے نتیجہ کی حیثیت فی الجملہ قیاسی نتیجہ کی ہے، لیکن اب آگے

سنئے، جن صحابیوں کا شمار ان لوگوں میں ہے، جن سے بکثرت حدیثیں مروی ہیں، اس فہرست میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خادم خاص اور صحابہ میں معمر ترین بزرگ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی ہیں۔ ان کی حدیثوں کی تعداد، ایک ہزار دو سو چھیاسی ہے۔ دارمی میں ان سے یہ روایت منقول ہے کہ اپنی اولاد جن کی ایک بڑی تعداد تھی فرمایا کرتے:۔

یا بنی قید وا ھذا العلم۔ میرے بچو! اس علم (حدیث) کو قلم بند کر لیا کرو۔

اسی سے ثابت ہوتا ہے کہ ان کی حدیثوں کا مجموعہ یقیناً لکھا جا چکا ہوگا، صرف اسی قدر نہیں دارمی ہی میں منقول ہے کہ:۔

رأیت ابان یکتب عند انس | میں نے ابان کو دیکھا کہ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس بیٹھے لکھ رہے ہیں۔

اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز روایت مستدرک میں سعید بن ہلال کا بیان ہے:۔

کنا اذا اکثرنا علی انس بن مالک رضی اللہ تعالی عنہ فاخرج الینا مجال عندہ فقال ھذہ سمعتھا من النبی صلی اللہ علیہ وسلم فکتبتھا وعرضتھا علیہ (مستدرک حاکم)

ہم جب حضرت انس سے زیادہ پوچھ گچھ لگاتے، تو وہ اپنے پاس سے ایک چونگہ نکالتے، اور فرماتے یہ ہیں وہ حدیثیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے میں نے سنی ہیں، اور ان کو لکھا لکھ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر پیش کر چکا ہوں۔

تھوڑے رد و بدل سے یہ الفاظ حدیث کی دوسری کتابوں میں بھی پائے جاتے ہیں، اگر یہ روایت صحیح ہے، اور حضرت انس کے متعلق کتابت حدیث کی جن دلچسپیوں کا تذکرہ دارمی سے میں نے پہلے نقل کیا ہے ان کو دیکھتے ہوئے صحت میں شبہہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے تو عہد نبوت میں علاوہ صادقہ کے حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیثوں کے قلم بند ہونے کا بھی ثبوت ملتا ہے۔ بلکہ اس سے بھی بڑھ کر یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر پیش کر کے انھوں نے ان روایتوں کی توثیق بھی کرا لی تھی۔ کیا اب بھی صحیح حدیثوں کی جو تعداد ہے، عہد صحابہ میں بلکہ عہد نبوت ہی میں ان کے قلم بند ہو جانے پر کوئی شک کر سکتا ہے؟ مگر یہ داستان اسی پر ختم نہیں ہو جاتی ہے۔ حضرت انس ہی کی طرح دوسرے مکثر صحابی حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں۔ ان کی تعداد جیسا کہ ابن جوزی نے تلقیح میں لکھا ہے، ایک ہزار پانسو چھ ہے۔ یہ تو پہلے گذر چکا کہ حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا مسجد نبوی میں درس کا ایک حلقہ تھا۔ اب ان کی روایتوں کے بھی قلم بند ہونے کا حال سنئے۔

صحیح مسلم میں ان کے متعلق یہ روایت درج ہے، کہ حج کے متعلق انھوں نے ایک کتاب جمع کی تھی، اور حافظ ابن حجر نے تہذیب میں یہ روایت نقل کی ہے کہ ان کے شاگرد وہب بن منبہ جو حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے شاگرد ہمام (جن کے صحیفہ ہمام کا ذکر گذر چکا) کے بھائی تھے، اپنے استاذ حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ، جن سے وہ براہ راست حدیث روایت کرتے ہیں، انھوں نے بھی ان کی حدیثوں کو قلم بند کیا تھا۔ اسی طرح سلمان بن قیس یشکری نے بھی حضرت جابر کی حدیثوں کا ایک مجموعہ تیار کیا تھا اور بڑے بڑے بزرگوں مثلاً شعبی، سفیان وغیرہ نے قیس سے اس کو سنا بھی تھا۔ خود استاذ نے کتاب لکھی تھی، تو شاگرد اس کی اتباع کیوں نہ کرتے۔

عورتوں میں سب سے بڑی تعداد حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی حدیثوں کی ہے، محدثین نے ان کی حدیثوں کی تعداد دو ہزار دس بتائی ہے، خود حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے متعلق تو ثابت نہیں کہ انھوں نے اپنی حدیث جمع کی تھی، اگرچہ ان کے علم وفضل کا یہ حال تھا کہ فرائض جن کے مسائل کا حل بغیر حسابی قاعدوں کے ناممکن ہے بآسانی حل کر لیتی تھیں، بڑے بڑے صحابہ ان سے فرائض کے پیچیدہ مسائل پوچھوا بھیجتے تھے۔ ایک ایک دفعہ میں کسی شاعر کے قصیدہ کے ساٹھ ساٹھ بلکہ سو سو شعر برجستہ سنا دیتی تھیں۔ حدیث کی اشاعت کا شوق ان کا بے نظیر ہے، مگر خود اپنی حدیثوں کے جمع کرنے کا حال معلوم نہیں ہوا۔ لیکن ان کے براہ راست شاگرد، اور حقیقی بہن کے لڑکے عروہ بن زبیر جن کا شمار ان لوگوں میں ہے جو حضرت عائشہ صدیقہ کی روایتوں کے سب سے زیادہ جاننے والے تھے، ان کے متعلق عام طور سے مشہور ہے کہ شروع میں انھوں نے بھی اپنے علم کو ایک کتاب میں قلم بند کیا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس میں حضرت عائشہ کی حدیثوں کا ہونا بھی ضرور ہے کہ سب سے بڑا سرمایہ ان کا یہی تھا، لیکن افسوس ہے کہ واقعہ حرہ جس میں مدینہ لوٹا اور برباد کیا گیا تھا، غلط فہمی کی وجہ سے انھوں نے قصداً اپنی کتاب ضائع کر دی، بعد کو پچھتاتے تھے اور کہتے تھے:۔

لوددت انی کنت فدیتھا باھلی ومالی تہذیب (۱۸۳) ج ۷	میری تمنا ہے کہ اپنے اہل و عیال اور اپنے مال کو اسی کتاب پر فدا کر دیتا

بہر حال اس سے اتنا تو معلوم ہوا کہ عہد صحابہ ہی میں حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا مجموعہ بھی جمع ہو گیا تھا، گرچہ عروہ کی راہ سے یہ مجموعہ ضائع ہو گیا۔ لیکن حضرت عائشہ کی دوسری مشہور خاتون شاگرد، جن کا نام عمرہ بنت عبدالرحمن ہے، جنھوں نے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے گود میں پرورش پائی تھی اور حدیث عائشہ کے باب میں ان کا شمار عروہ کے برابر برابر تھا، ان ہی عمرہ بنت عبدالرحمن کے علم کو ان کی بہن کے لڑکے ابوبکر بن محمد بن عمرو بن حزم نے حضرت عمر بن عبدالعزیز کے مشہور فرمان کی بنیاد پر جس کا ذکر بخاری وغیرہ میں بھی ہے جمع کر لیا تھا۔ حافظ ابن حجر لکھتے ہیں کہ ابوبکر کے نام حضرت کا فرمان آیا تھا:۔

ان یکتب لہ من العلم من عند عمرۃ بنت عبدالرحمن والقاسم بن محمد	عمرہ بنت عبدالرحمن اور قاسم بن محمد کے علم (حدیثوں) کو وہ ان کے لئے لکھ کر تیار کریں۔

اور قاسم کے پاس بھی وہی حضرت صدیقہ ہی کی حدیثوں کا زیادہ سرمایہ تھا کہ آپ کے والد محمد بن ابی بکر ان کی ایام طفلی ہی میں مشہور فتنہ میں شہید ہو چکے تھے، اس لئے یتیم بھتیجہ کی پرورش حضرت عائشہ ہی نے فرمائی۔ ان ہی کے تربیت یافتہ تھے، سب کچھ انہی سے سیکھا تھا۔ بہر حال حضرت عائشہ کی حدیثیں ان ہی دونوں کے ذریعہ سے ابوبکر بن محمد نے جمع کیں، اور حضرت عمر بن عبدالعزیز خلیفہ نے ان کی نقلیں تمام ممالک اسلامیہ کے مرکزی شہروں میں بھیجیں جس کے معنی یہ ہوئے کہ گو حضرت عروہ کی کتاب جل گئی، لیکن عمرہ بنت عبدالرحمن کی راہ سے حضرت عائشہ کا جو علم قلم بند ہوا تھا وہ باقی رہا۔

مکثرین (یعنی جنکی حدیثوں کی تعداد ہزار سے اوپر ہے) ان میں اکثروں کے حدیثی سرمایہ کے متعلق عہد نبوت وصحابہ ہی میں قلم بند ہونے کا حال معلوم ہو چکا، اب صرف دو تین اور رہ جاتے ہیں، جن میں سب سے زیادہ نمبر حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی روایتوں کا ہے، یعنی دو ہزار چھ سو ساٹھ حدیثیں ان کی طرف منسوب ہیں۔ پہلے تو خود ان کے متعلق ابن سعد میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے غلام رافع سے یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کارنامے لکھا کرتے تھے۔ ان کے مشہور آزاد کردہ غلام عکرمہ سے امام ترمذی نے اپنی کتاب العلل میں یہ روایت نقل کی ہے:۔

ان نفرا قدموا علی ابن عباس من اھل الطائف بکتب من کتبه فجعل یقرء علیھم	حضرت ابن عباس کے پاس طائف کے کچھ لوگ ان کی کتابوں کو لے کر حاضر ہوئے، اور ان کے سامنے ان کی کتابیں پڑھنے لگے

جس سے ثابت ہوتا ہے کہ ان کی زندگی ہی میں ان کی حدیثوں کا مجموعہ قلم بند ہو چکا تھا۔ لفظ "کتب" جو جمع کا صیغہ ہے، قابل غور ہے، ایک کتاب نہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے چند کتابیں تیار کی تھیں، اور ان کے متعلق تو صحیح تک میں یہ روایت موجود ہے کہ حضرت علی کے فیصلوں اور فتاوی کا ایک بڑا حصہ لکھا ہوا ان کے پاس لایا گیا۔ ابن سعد ہی کی روایت یہ بھی ہے کہ ابن عباس کی وفات کے بعد جو علم انھوں نے چھوڑا وہ ایک بار شتر تھا کوئی وجہ نہیں ہو سکتی کہ اِس "بار شتر" کے کتابی مجموعہ میں ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی حدیثوں کا ذخیرہ نہ تھا۔ خود ابن عباس کے ممتاز ترین رشید شاگرد سعید بن جبیر سے دارمی، طبقات ابن سعد وغیرہ میں یہ بیان منقول ہے کہ وہ ان کی حدیثوں کو لکھا کرتے تھے، کاغذ ختم ہو جاتا تو جو چیز ملتی حتی کہ ہاتھ پر تک لکھ لیتے، بعد کو گھر جا کر کاغذ پر اتارتے، سعید بن جبیر جو ان کے علم کے سب سے بڑے راوی ہیں، جب وہ لکھا کرتے تھے تو اس کے بھی یہی معنی ہیں کہ ابن عباس کی شاید ہی کوئی حدیث لکھنے سے رہ گئی ہو۔

اِن کے بعد حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیثوں کا نمبر ہے ان کی حدیثوں کی تعداد ایک ہزار چھ سو تیس ہے۔ اب تک مجھے کوئی تحریری ثبوت اس کا تو نہیں ملا کہ خود ابن عمر نے اپنی حدیثوں کا مجموعہ تیار کیا تھا، لیکن دارمی ہی کی یہ روایت ہے، بلکہ طبقات ابن سعد میں بھی یہ روایت موجود ہے، کہ سلمان بن موسیٰ کا یہ بیان ہے:۔

انه رای نافعا مولی ابن عمر علی علمه ویکتب بین یدیه	کہ ابن عمر کے مولیٰ نافع کو دیکھا کہ لوگ ان کے سامنے بیٹھ کر لکھ رہے تھے۔

نافع کے متعلق سب جانتے ہیں کہ یہ حضرت ابن عمر کے چھیتے آزاد کردہ غلام تھے تیس ۳۰ سال تک ان کی خدمت میں رہے، امام مالک کی ان ہی روایتوں کو جو نافع ابن عمر کے ذریعہ سے وہ روایت کرتے ہیں بعض لوگ سلسلۃ الذہب (سنہری زنجیر) قرار دیتے ہیں اِس سے سمجھا جا سکتا ہے کہ ابن عمر کا علم خود ان کے براہ راست شاگرد کے ذریعہ سے یقیناً قلم بند ہو چکا تھا اور واقعہ یہ ہے کہ ابن عباس و ابن عمر کے زمانہ تک بنی امیہ کی حکومت قائم ہو چکی تھی، جس میں تصنیف و تالیف بلکہ ترجمہ تک کا چرچا مسلمانوں میں عام طور پر ہو چکا تھا۔ ان بزرگوں کی حدیثوں کا نہ قلم بند ہونا البتہ محل تعجب ہے پھر جب دلائل موجود ہیں تو انکار کی

کیا وجہ ہو سکتی ہے۔

اور یہ حال تو ان بزرگوں کی حدیثوں کا ہے، جو مکثرین کے طبقہ میں شمار کئے جاتے ہیں ان کے سوا دوسرے اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جن کا شمار اس طبقہ میں نہیں ہے، ان میں ایک نہیں متعدد صحابیوں کے متعلق ثابت ہے کہ صرف ایک دو حدیث نہیں بلکہ ان کے بھی اچھے خاصے مجموعے لکھے ہوئے موجود تھے، جن میں بعض تو خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لکھوائے ہوئے تھے، مثلاً وائل بن حجر صحابی جو حضرموت کے شاہزادوں میں تھے، مدینہ آکر مسلمان ہوئے، اور کچھ دن قیام فرما کر جب واپس جانے لگے تو طبرانی صغیر میں مروی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک صحیفہ لکھوا کر ان کے حوالے کیا جس میں نماز روزہ شراب سود وغیرہ کے احکام تھے۔

دوسری طویل چیز جو خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ہی لکھوائی ہوئی ہے اس کا تو ذکر بخاری تک میں ہے۔ آپ میں کون نہیں جانتا کہ حجۃ الوداع میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جو خطبہ دیا تھا، اس میں ہر فقرہ بجائے خود اسلام کا ایک اصول تھا۔ اور اچھا خاصہ طویل ہے، ابوشاہ یمنی صحابی کی درخواست پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ خطبہ ان کو خود لکھوا کر دیا۔ بخاری کی روایت سے شائد شبہہ ہو سکتا ہے کہ پورے خطبہ کی نقل کا شاید حکم نہیں دیا گیا تھا۔ امام اوزاعی جو سیر کے امام ہیں ان سے یہ پوچھا گیا کہ کیا پورا خطبہ لکھوایا گیا تھا، بولے ہاں!

هذه الخطبة التي سمعها من النبي صلى الله عليه وسلم۔ (عینی ص۷۲ ج)	یعنی وہی خطبہ جسے انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا تھا (لکھوا کر دیا گیا)

دارمی ہی کی ایک اور روایت ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے، کہ یمن والوں کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف قسم کے احکام ایک رسالہ کی شکل میں لکھوا کر بھیجے تھے دارمی کے الفاظ یہ ہیں:-

ان رسول الله صلى الله عليه وسلم كتب الى اهل اليمن ان لا يمس القرآن الا طاهر ولا طلاق قبل املاك ولا عتاق حتى يبتاع ص۲۹۳	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یمن والوں کو یہ لکھوا کر بھیجا، کہ قرآن کو پاک آدمی کے سوا کوئی نہ چھوئے، اور قبل مالک ہونے (یعنی نکاح کے) طلاق نہیں ہے، اور جب تک غلام خریدا نہ جائے اس کے آزاد کرنے کے کوئی معنی نہیں۔

۔ اس کتاب میں جب اتنے تفصیلی مسائل تھے تو اسلام کے عام فرائض وواجبات کا ہونا تو زیادہ اغلب ہے اسی طرح کنز العمال میں ایک روایت ہے، کہ عمرو بن حزم کو جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یمن کا حاکم بنا کر بھیجا تو ایک تحریر بھی لکھوا کر ان کے حوالہ فرمائی گئی جس میں فرائض صدقات دیات (یعنی قتل کے خون بہا کا قانون) وغیرہ کے متعلق بہت سی ہدایتیں تھیں اسی طرح حافظ ابن حجر نے تہذیب میں حضرت سمرہ بن جندب مشہور صحابی کے بیٹے سلیمان بن سمرہ کے متعلق لکھا ہے کہ:-

روى عن ابيه نسخة كبيرة (تہذیب ص۱۹۸ ج۴)	اپنے والد سے وہ ایک بڑا نسخہ روایت کیا کرتے تھے۔

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت سمرہ کی حدیثیں بھی جمع ہو چکی تھیں، خصوصاً "کبیرۃ" کے لفظ سے اس کی زیادہ تائید ہوتی ہے، ورنہ چند حدیثوں کے متعلق ظاہر ہے کہ "نسخہ کبیرہ" کا اطلاق صحیح نہیں ہو سکتا۔ ترمذی نے کتاب الاحکام میں ایک روایت "باب الیمین مع الشاہد" کے سلسلہ میں جو درج کی ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قبیلہ خزرج کے مشہور سردار حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس بھی ایک صحیفہ تھا، جس کے حوالہ سے ان کے صاحبزادے بعض روایتیں بیان کیا کرتے تھے، اور اس میں کوئی تعجب بھی نہیں ہے، اس لئے کہ قبل الاسلام "کتابت" یعنی لکھنے میں جن لوگوں کو مہارت حاصل تھی ان میں ایک حضرت سعد بن عبادہ بھی تھے۔ بخاری کی ایک روایت سے جو کتاب الجہاد باب الصبر علی القتال میں مروی ہے، اس سے بھی معلوم ہوتا ہے حضرت عبد اللہ بن ابی اوفی صحابی رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی اپنی حدیث لکھا کرتے تھے۔ اسی طرح بخاری ترمذی اور صحاح کی دوسری کتابوں میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے ایک صحیفہ کا ذکر پایا جاتا ہے، جسے وہ اپنی تلوار کے نیام میں رکھا کرتے تھے، روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس صحیفہ میں "شریعت" کے بعض اہم مسائل تھے، جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے بیان فرمائے تھے۔ تلاش اور تتبع سے اگر اور کام لیا جائے تو اس قسم کے کتابی ذخیروں میں اور اضافہ ہو سکتا ہے، لیکن بالفعل اپنے بیان کی پہلی قسط کو اسی پر ختم کرتا ہوں، اور مقالہ کے دوسرے مباحث کا تذکرہ انشاء اللہ تعالیٰ آئندہ قسطوں میں کیا جائے گا، جس میں سب سے پہلے یہ بیان کیا جائے گا کہ جب حدیث کے کتابی ذخیروں کا اتنا بڑا سرمایہ عہد نبوت و صحابہ میں جمع ہو چکا تھا، اور حدیث کی عام کتابوں میں اس کا ذکر موجود تھا، پھر باوجود اس کے لوگوں کو یہ مغالطہ کس بنیاد پر ہوا کہ سب سے پہلے حدیث کی کتابی تدوین ابن شہاب زہری نے پہلی صدی کے اختتام میں عمر بن عبد العزیز خلیفہ کے فرمان سے شروع کی؟ اس مغالطہ کے ازالہ کے بعد جن حقائق کا انکشاف ہوگا، ان کے نتائج پر بحث کرنے کے بعد "تدوین حدیث" کے دوسرے مباحث کا تذکرہ کیا جائے گا،

وما توفیقی الا باللہ علیہ توکلت والیہ انیب،

کتابیات

۱ - ۶ - صحاح ستّہ
۷ - جمع الفوائد
۸ - فتح الباری لابن حجر العسقلانی
۹ - الاصابہ 〃
۱۰ - تہذیب التہذیب 〃
۱۱ - مختصر جامع بیان العلم لابن عبدالبر
۱۲ - طبقات ابن سعد
۱۳ - عقدالفرید لابن عبدربہ
۱۴ - توجیہ النظر للدمشقی
۱۵ - المستدرک للحاکم
۱۶ - المدخل 〃
۱۷ - تلقیح الفہوم لابن الجوزی
۱۸ - مقدمہ شرح مسلم للعثمانی
۱۹ - خطبات مدارس از للندوی
۲۰ - مقام حدیث از محمد علی لاہوری
۲۱ - لائف آف محمد از باسورتھ اسمتھ
۲۲ - مقدمۂ اصابہ از اشپرنگر
۲۳ - سنن دارمی عبدالرحمن الدارمی
۲۴ - عمدۃ القاری عینی
۲۵ - کنزالعمال علی متقی

کنڑی شاعری کے جدید رجحانات

از

ڈی۔ کے بھیم سین راؤ صاحب ام۔ اے

صدر شعبۂ کنڑی۔ جامعہ عثمانیہ

ہندوستان میں جب سے کہ انگریزی حکومت قائم ہوئی ہے یہاں کے باشندوں کی زندگی کے مختلف شعبوں میں کافی تبدیلیاں وقوع پذیر ہوئی ہیں۔ ہندوستان کے مختلف حصوں میں نئی تعلیم کی اشاعت اور پھیلاؤ نے ایک نئی روح پھونک دی جس کا نتیجہ یہی ہوا کہ مختلف جامعات قائم ہوئیں۔ اور علم کا معیار بلند ہوا۔ یوربین تمدن و تہذیب کے ارتباط سے ہندوستانی تمدن و تہذیب پر جو قدرتی اثر ہوا اس کا عکس ادب میں نمایاں طور پر نمودار ہوا۔ یہ مسلمہ امر ہے کہ ادب قوم کی زندگی کا آئینہ ہے۔ یوروپی تمدن کے اثرات ہندوستانی قوم کی رگ و ریشہ میں سرایت کر گئے اور اس کا لازمی نتیجہ جو برآمد ہوا وہ ہندوستان کے ادبیات کے حق میں بہت سودمند ثابت ہوا۔ قدیم رسم و رواج اور اندھا دھند طرز عمل نے نئے خیالات و رسوم کے لئے جگہ خالی کر دی سائینس کے اختراعات و ایجادات کے سامنے ادبی و مذہبی عقائد و ایقانات کھسکنے لگے۔ اس تمدن سے ایک نئی باطنی بینائی حاصل ہوئی جس کے ذریعہ سے زمانہ حال کا تعلیم یافتہ دنیا کو اصلی صورت اور سچے رنگ و روپ میں دیکھنے لگا۔ زندگی کے متعلق وسیع النظری سماجی ماحول سے قریبی ربط، اور خیالات کی آزادی، یہ وہ نعمتیں ہیں جو مغربی تعلیم سے حاصل ہوئیں۔ نتیجتاً ہندوستان کی زندگی کے ہر شعبہ میں پرانے نظام کے خلاف ایک زبردست انقلاب برپا ہوا۔ اور لازمی طور پر ادب بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہا۔ آج کل کے ہندوستان کی یہ عام حالت ہے۔ چونکہ ملک کرناٹک ہندوستان کا ایک بڑا جزو ہے اس لئے یہاں بھی وہ تمام تبدیلیاں واقع ہوئیں جو اوپر بیان کی گئی ہیں۔ ذیل میں انہی تبدیلیوں کے متعلق چند نکات پیش کئے جاتے ہیں۔

یہاں مغربی تہذیب کے اثر سے پہلے کنڑی نظم کی حالت کے متعلق چند امور کا بیان کرنا باعث دلچسپی ہوگا جس طرح کہ سنسکرت میں سینکڑوں مہابھارت[1] کا

---

[1] مہابھارت وہ طویل نظم ہے جس میں (۱۸) امور کا تذکرہ کرنا لازمی ہے اور جس کی تفصیل آگے چل کر کی گئی ہے۔ دیکھئے صفحہ ۱۰۹۔

نظم کی گئی ہیں کنڑی میں بھی ایسی مہا کاویہ لکھی گئی ہیں۔ جدید عصر کے پیشتر کنڑی ادب میں بہت کم ناٹک (تمثیل) لکھے گئے ہیں۔ جو کتابیں نثر میں تصنیف کی گئی ہیں ان کی تعداد بہت قلیل ہے۔ ہر بات جو کہی گئی ہے صرف نظم میں کہی گئی ہے۔ فلسفہ، طب، افسانے، ریاضی، صرف و نحو، غرض سب ہی علوم نظم کے موضوع بن گئے۔ اس لئے ان سب نظموں میں جو مختلف علوم پر لکھی گئیں ہیں شاعری کے عنصر کا فقدان ہے۔ لیکن یہ بات مان لینی چاہیئے کہ پرانی کنڑی شاعری کا منبع و موضوع مذہب ہے۔ شاعر کے لئے مذہب گویا موجب القائے شاعری ہے اور وہی اس کا موضوع بھی ہے۔ چند ایسے بھی شاعر ہیں جو صاف طور پر اس بات کو واضح کرچکے ہیں کہ جس شخص کو شاعری کی نعمت عطا کی گئی ہو اس کو چاہیئے کہ وہ اس کو خدا کی ثنا اور حمد میں استعمال کرے۔ اگر وہ اس کا استعمال اور طریقہ پر کرتا تو وہ حقارت سے دیکھا جاتا۔[۱]

مؤرخین کنڑی ادب کو عموماً تین حصوں میں تقسیم کرتے ہیں اور یہ تقسیم کرناٹک میں مذہبی انقلابی تحریک پر مبنی ہے۔ کنڑی ادب کی ابتدا پانچویں صدی عیسوی سے شمار کی جاتی ہے۔ اور یہ زمانہ کرناٹک میں جین مذہب کے عروج کا عہد ہے جو ۱۱۶۰ء تک جاری رہا۔ اس زمانہ کی اکثر کتابیں جین مذہب کے شاعروں کی لکھی ہوئی ہیں۔ اس لئے اس زمانہ کے ادب کو جین ادب سے موسوم کیا گیا ہے۔ جو شعرا اس زمانہ میں گزرے ہیں ان کے اشعار اکثر جین مذہب سے وابستہ ہیں۔ ان اشعار کا موضوع مذہبی پیغمبروں کے سوانح ہیں۔ پمپا، پونا، جنا، ناگ چندر وغیرہ جن کو قدیم کنڑی ادب کے چوٹی کے شعرا ہونے کی عزت حاصل ہے، وہ اپنی تصانیف کے ساتھ ساتھ مذہبی پیغمبروں کے سوانحِ عمری لکھے بغیر نہیں رہ سکے۔ ۱۱۶۰ء کے بعد ملک کرناٹک میں پھر مذہبی انقلاب شروع ہوا یہاں تک کہ اس کا اثر اس کے اطراف و اکناف کے ممالک جیسے تلنگانہ میں بھی پھیل گیا۔ اس زمانہ کی نامور ہستی، لنگایت مذہب کے بشویشور نے جن کو لنگایت مذہب کے بانی مبانی ہونے کی شہرت حاصل ہے کرناٹک میں سماجی، مذہبی اور ادبی انقلاب برپا کر دیا۔ بشویشور اور ان کے حامی اور پیرو اس زمانہ کے ادب و شاعری کا موضوع بن گئے۔ یعنی اکثر کتابیں ان کے سوانح کی شکل میں لکھی گئیں۔ مگر ان سب میں مذہب کا عنصر نمایاں ہے۔ اس لئے ان کو ویر یشو پُران کہا جاتا ہے۔ اس کے بعد اور ایک نیا دور چودھویں صدی کے اواخر سے شروع ہوتا ہے۔ برہمن مذہب کے شعرا برہمنی ادب کے موجد ہیں۔ پندرہویں صدی اور اس کے بعد چونکہ برہمن شعرا کی اکثریت تھی اس لئے اس صدی سے جو ادب کا سلسلہ قائم ہوا ہے اس کو برہمنی ادب سے موسوم کیا جاتا ہے۔ ان شعرا نے رامائن مہابھارت بھاگوت وغیرہ کا جو سنسکرت کی مشہور رزمیہ نظمیں ہیں، ترجمہ کنڑی میں کیا۔ یہ سب مذہبی کتابیں ہیں لیکن ان میں شعرا نے اپنی اپنی شاعری کے بہترین نمونے چھوڑے ہیں اور انھیں کے باعث کنڑی ادب دنیا کے ادبوں میں شمار ہونے کے قابل ہوا۔ اس کے علاوہ برہمن شعرا نے سنسکرت کے کادنبری اور دش کمار چرت وغیرہ کا بھی ترجمہ کنڑی میں کیا۔ سولھویں صدی میں برہمن مذہب میں ایک اور فرقہ کو تقویت پہونچی اس فرقہ کو وشنو پنتھ کہا جاتا ہے۔ اس فرقہ کے شعرا کی نظمیں اکثر وشنو بھکتی کے متعلق ہیں۔ یہ وشنو کے حمد میں لکھی گئی ہیں۔ اس طرح سے جین دھرم سے

۱۔ راج سکھر ولاس۔ باب اول۔ بند ۱۹ تا ۲۱

لیکر وشنو دھرم تک شاعری کی تمام استعداد و قوتِ متخیلہ مذہبی ایقان کے انکشاف میں صرف ہوئی۔کبھی کبھی یہ شعراء مخالف مذہبوں پر بھی نکتہ چینی کرتے یا ان کو معرضِ بحث میں لاتے تھے جس سے شاعری کے مقصد کو صدمہ پہونچتا تھا۔پُران جو سینکڑوں کی تعداد میں لکھے گئے ہیں کنڑی ادب کے اہم جز کی حیثیت رکھتے ہیں۔ان ہی پُرانوں کو مہا کاویہ سے موسوم کیا جاتا ہے۔چونکہ اکثر شعراء نے اپنی تصانیف کے تمہیدی حصہ میں اس کو بالکل واضح کر دیا ہے' اس لئے یہ ضروری تصور کیا گیا کہ ہر مہا کاویہ میں اٹھارہ امور کا بیان کرنا لازمی ہے۔ان کا بیان خواہ موزوں ہو یا نہ ہو' لازمی قرار دیا گیا۔کسی موضوع کے طویل بیان کے دوران میں ابتدا ہی سے سمندر' چودہ عالم (Worlds)' میرو پربت' جزیرہ جنبو اور بھرت کھنڈ (ہندوستان) کا ذکر آنا لازمی ہے۔اس کے بعد ملک کے کسی ایک خاص حصہ کے بیان کا سلسلہ شروع ہوتا ہے اور یہ بیان موسموں' باغوں' سورج' چاند' سمندر' برات' دارالسلطنت' پہاڑ' اولاد' پانی' بہار' عشق' معشوق کے وصل و فراق' حاکم کے فتوحات' سفر' اور سیاست پر مشتمل ہوتا ہے۔ممکن ہے کہ ان کا بیان ایک سے زائد مرتبہ آئے۔اس فہرست میں سے کسی ایک جز کا کم ہونا ماہرین کی نظروں میں باعث تنقید ہوتا ہے۔اور ایسی نظموں کا جن میں مندرجہ بالا بیانات میں سے کسی کی کمی پائی جائے معیار سے گر جانے کا اندیشہ ہے۔گویا بستر کی وسعت' بدن کی جسامت کی مطابقت میں ہے۔اس فہرست کا تانا اس طرح طویل ہوتا ہے کہ ہر ایک بیان کا حصہ مختلف اجزا سے مرکب ہوتا ہے اور یہ پہلے ہی سے طے شدہ ہوتے ہیں۔یعنی سمندر کے بیان میں حباب (بلبلہ)' بھنور' پانی' عمق' سمندر کا شور' پہاڑ' لکشمی کی پیدائش' ہیرے' تہ آب آگ' سمندری جانور' گھوڑا' کچھوا' ندی' بادل وغیرہ کا شمار ہونا لوازمات سے ہے۔سمندر کا بیان اس وقت تکمیل پاتا تھا جبکہ یہ تمام نقاط اپنی جگہ پر رہیں۔اس فہرست میں کمی و بیشی کرنا گویا شاعری کے اصول کی خلاف ورزی کرنا تھا۔ایک مشہور شاعر نے سمندر کے بیان میں مچھلی کا تذکرہ کرتے ہوئے حد کر دی ہے وہ کہتا ہے:۔

> "ایک مچھلی چکر مار کر دوسری مچھلی کو نگل گئی۔وہ مچھلی دوسری مچھلی کی خوراک بن گئی۔
> یہ مچھلی بھی ایک اور مچھلی کی غذا بن گئی۔مگر اس مچھلی کو دوسری مچھلی ہڑپ کر گئی۔اس طرح سے ایک
> مچھلی دوسری مچھلی کی غذا بن گئی حتیٰ کہ تیمنگل نامی مچھلی ان سب مچھلیوں کو ہپ کر گئی"۔

اس سے یہ لطیف مفہوم اخذ کیا جاسکتا ہے کہ کس طرح سے ایک ظالم ملک فتح کرتا اور یکے بعد دیگرے شہروں پر قبضہ کرتا جاتا ہے۔ہر ایک مہا کاویہ میں ان تمام امور کا ذکر ہوگا جو اوپر بیان کئے گئے ہیں۔اس میں شک نہیں کہ شعرا نے ان نظموں میں اپنی قابلیت' علمی فراست اور النکاروں (صنائع و بدائع) پر قدرت کو پوری طور پر ظاہر کیا ہے۔ساتھ ہی ساتھ اس کا بھی پتہ چلتا ہے کہ یہ شعرا لغت اور صرف و نحو کی باریکیوں کے استعمال میں غیر معمولی مہارت رکھتے تھے۔یہ شعرا صرف و نحو کے قواعد کے سخت پابند تھے اور ان کو ان قواعد کی پابندی بھی کرنی ہوتی تھی جو النکاروں کے متعلق مرتب کئے گئے تھے۔اس لئے ان شاعروں کو معینہ حدود کے اندر رہنا پڑتا تھا۔طرز بیان میں شروط و قیود سے بالاتر ہونا شعراء کا فطری حق ہے۔ان کے تخیل کو پابندی کی زنجیروں سے جکڑ بند نہیں کیا جاسکتا ورنہ شاعر کا قول کسی چیز سے مجبور ہو کر خیال کا اظہار کرنے کے مساوی ہوگا۔

چونکہ قدیم شاعروں کو ان تمام پابندیوں کا خیال تھا اس لئے ان کو مندرجہ بالا قیود سے باہر کسی شئے کے بارے میں خیالات کا ظاہر کرنا ممکن نہ تھا۔ دنیا جس کا تعلق انسان سے لابدی اور ابدی ہے، ایک وسیع خطہ ہے۔ زندگی کا سلسلہ غیر منتہی ہے فطرت تمام دنیاوی خوبیوں، دلچسپیوں اور حسن و جمال سے معمور ہے اور شاعر کا تخیل آزاد و غیر محدود ہے۔ دنیا میں خوشی و نشاط کے ساتھ ساتھ حسرت، رنج و الم بھی ہیں۔ زندگی میں ان سب سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ افلاس، غلامی، سماجی و اقتصادی ماحول اور زندگی کے مختلف حالات شاعری کا موضوع بن سکتے ہیں۔ قدیم اشعار میں ان کا وجود سوائے چند نظموں کے بہت کم ہے۔ یہ شعرا اپنا کلام عروضانہ انداز میں بیان کرنے کے بڑے شایق بلکہ عاشق تھے۔ اس لئے ان کا خیال اکثر شعر کی بحر کی طرف ہوتا تھا نہ کہ مطلب کی طرف۔ وقفہ (یتی) جو شاعری میں ان مختلف شرائط میں سے ہے جن کے شعرا نہایت پابند تھے، مگر یہ وقفہ خیال کے توازن کے لحاظ سے نہیں بلکہ ایک لازمی شرط کی حیثیت سے استعمال ہوتا تھا۔ اس لئے وقفہ کا کسی لفظ کے درمیان بھی آنا ممکن تھا جس سے مطلب میں فرق آنے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ قافیہ بھی ایک شرط تھی۔ اس طرح شاعری کے موضوع اور وضع دونوں پر یک رنگی متسلط تھی۔ اور شعرا اسی کی گرفت میں تھے۔

یہ وہ حالات ہیں جن کے حدود کے اندر جدید عصر کے شاعر نے اپنے آپ کو پایا۔ اس کا تخیل بالکل نیا تھا۔ اس نے مغربی تعلیم سے ایک نئی روشنی حاصل کی تھی اور اس کے ذریعہ سے اس کو خیالات کی آزادی نصیب ہوئی تھی اس کی حالت اس کچھوے کی سی نہیں تھی جو ہمیشہ کنوئیں کے بند پانی میں مقید رہا ہو۔ اس کا تخیل ایک نئی دنیا کی تلاش میں تھا اور بالآخر اس نے اس کو پالیا۔ جین مذہب کے پیشواؤں، لنگایت مذہب کے شرنوں (بزرگوں) وغیرہ کے سوانح زندگی کے مطالعہ سے اس کو طمانیت حاصل نہیں ہوتی۔ وہ عروض و بلاغت کے ان تمام شرائط سے آزاد ہو کر اپنے موضوع اور رجحان کے موافق نظم کو ایک نئی شکل میں ڈھالتا۔ اولاً شعر میں اس نے قافیہ کو ترک کر دیا۔ کنڑی زبان میں قافیہ ہمیشہ ہر مصرع کا دوسرا حرف ہونا لازمی تھا جس کو پراس یعنی درمیانی قافیہ کہا جاتا ہے اس میں غایت درجہ کی بناوٹ پائی جاتی ہے۔ یہانتک کہ اس کے استعمال میں مشہور و بلند پایہ شاعر بھی جب کبھی ان کی طبیعت میں شاعری کی جودت و موزونیت کا فقدان ہو اور ان کا تخیل پرواز نہ کرتا ہو اور خیالات میں خشک پن اور تشنگی ہو، قافیہ کی تلاش میں کوشاں رہتے ہیں اور ان کی یہ کیفیت ان کی نظموں میں نمایاں ہے۔ ایسی حالت میں درمیانی قافیہ کا استعمال بے معنی اور فضول ہوتا ہے۔ اور قافیہ کی غرض و غایت بالکل فوت ہو جاتی ہے۔ اس طرح سے درمیانی قافیہ کو غایت درجہ کی پابندی کے ساتھ استعمال کرنے میں کوئی مفید مطلب حاصل نہیں ہوتا۔ درمیانی قافیہ کے بغیر شاعری ممکن ہے۔ دوسری زبانوں کی شاعری میں ایسی کوئی شرط نہیں ہے۔ پھر بھی ان میں شاعری پھلتی پھولتی ہے۔ پھر کنڑی میں بھی ایسا کیوں نہ ہو؟ اس لئے آجکل کے شاعر نے سب سے پہلے اس درمیانی قافیہ کو رد کر دیا۔ یتی شعر میں وقفہ یا رک جانے کو کہتے ہیں۔ اصل میں یہ ایسی جگہ ہوتا تھا جہاں خیال کے ساتھ رک کر کہنا مقصود ہوتا تھا مگر رفتہ رفتہ اس کا استعمال بالکل غیر موزوں اور رواجی بن گیا۔ حتیٰ کہ اس کا استعمال لفظ کے درمیان ہونے لگا جس سے لفظ کو

دو حصوں میں ٹکڑے کرنے کی نوبت آنے لگی اور جس سے اصل مطلب فوت ہونے کا اندیشہ ہونے لگا۔ کنڑی میں شعرا اس یتی کی شرط کی پابندی سے نویں صدی عیسوی سے ہی آزاد ہو گئے۔ نوپ تُنگ نے نویں صدی میں، ناگ ورم نے بارھویں صدی میں اور کیشی راج نے تیرھویں صدی میں اس بات کو علانیہ طور پر ظاہر کر دیا کہ کنڑی زبان کی خوبی کو یتی کی شرط سے آزاد ہونے سے معلوم کیا جا سکتا ہے۔ گویا یتی کی شرط کا پابند نہ ہونا ہی کنڑی زبان کی خصوصیت ہے۔ زمانہ حال کے شاعر نے بھی اسی کا تتبع کیا۔ اس کا استعمال اب اسی جگہ ہوتا ہے جہاں مطلب یا خیال کے ادا کرنے میں وقفہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ محض قدیم رواج کی پابندی سے نہیں۔

جدید شاعری ماتروں[1] کی بحر پر مبنی ہے۔ ماترا گن (تفاعیل) تین طرح کے ہوتے ہیں۔ قدیم شاعری میں شعر کی نوعیت کے لحاظ سے ان گنوں کی تعداد کو مخصوص قرار دیا گیا تھا اور ان گنوں کے لحاظ سے قدیم اشعار میں مختلف قسم کے بحر ہوتے تھے۔ جن کو اکر، تری پدی[2] دوی پدی (مثنوی) رگلے، شٹ پدی (مسدس) کند، چو پدی (رباعیات) وغیرہ کہتے ہیں۔ نئے رجحان کا شاعر ان بحروں میں شعر کہنا پسند نہیں کرتا بلکہ وہ نئی قسم کے بحر استعمال کرتا ہے لیکن وہ سب ماترا گنوں پر ہی مشتمل ہوتے ہیں۔ ان گنوں کو وہ موضوع کی موزونیت کے لحاظ سے استعمال کرتا ہے۔ آجکل کی اکثر تمثیلیں (ناٹک) انگریزی ادب کے ''بلانک ورس'' کی طرح غیر مقفا لکھی جاتی ہیں۔ اس کو کنڑی میں سرل رگلے کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ یہی عام طور پر استعمال میں آتی ہے اور اکثر اسی کو پسند کیا جاتا ہے۔ پروفیسر بی۔ ایم سری کنٹیا اور کے۔ وی۔ پٹیا ان دونوں نے پہلے پہل اس کو رواج دیا اس بحر کو عام مقبولیت عطا کرنے کی عزت کے۔ وی پٹیا کو دی جانی چاہئے۔ اسوتھامن، مین سولو، رکتا کشی۔ ناگرک جیسی شہرہ آفاق تمثیلیں اسی بحر میں لکھی گئی ہیں۔

جدید شاعری کی زبان

آجکل کی شاعری میں جو زبان استعمال کی جاتی ہے وہ بہت سلیس اور عوام کی زبان ہوتی ہے۔ صرف ونحو کے قواعد کی سختی سے پابندی نہیں کی جاتی۔ کنڑی الفاظ کے ساتھ سنسکرت کے الفاظ کو خلط ملط کر کے استعمال کرنا قدیم اصول کے تحت سخت منع تھا۔ لیکن آجکل اس کا استعمال عام ہو گیا ہے۔ سنسکرت الفاظ کے عوض کنڑی الفاظ کا استعمال پسند کیا جاتا ہے اور اس امر کی کوشش کی جاتی ہے کہ قدیم اور از کار رفتہ کنڑی لفظوں کو بھی رواج دیا جائے تاکہ زبان کو الفاظ کے ذخیرہ سے تقویت حاصل ہو اور نئے نئے خیالات کا اظہار کرنے میں آسانی پیدا ہو۔ چونکہ شاعری کی زبان عالمانہ نہیں ہوتی اس لئے مطلب کے سمجھنے میں زیادہ وقت نہیں ہوتی اور شاعری کا

---

[1] ۔ ماترا۔ (حروف علت و اعراب) کی تعریف یہ ہے کہ کسی حرف کے بولنے میں بہت کم وقت درکار ہو اس طرح کوئی لفظ ایک ماترا یا دو ماترے کا ہوتا ہے۔ اور ان کی ایک معین تعداد کو گن، کہتے ہیں۔ یہ گن، تین چار یا پانچ ماتروں کا ہوتا ہے۔ گن عربی عروض کے تفاعیل کے مترادف ہے۔

[2] ۔ ان میں برہم۔ وشنو، رُدر گن استعمال ہوتے تھے۔

اثر دل پر براہ راست ہوتا ہے۔ عالمانہ طرز کے الفاظ کا استعمال اب بالکل بند ہوگیا ہے۔ مگر چند شعرا نے اپنی نظموں[1] میں قدیم زبان کو استعمال کیا ہے گو طرز بیان اور موضوع جدید قسم کا ہے۔ دوسرے ایسے شاعر بھی ہیں جو اپنی کتابوں میں زبان کو اسی حالت میں استعمال کرتے ہیں جس حالت میں کہ وہ بولی جاتی ہے۔ اس میں کسی طرح کا بھی تغیر و تبدل نہیں کیا جاتا[2]۔

صنائع و بدائع

متقدمین کی شاعری میں گو الفاظ کی صنعت کاری بہت کم پائی جاتی ہے لیکن زمانہ کی رفتار کے مطابق متاخرین اپنے کلام میں صنعت کو بکثرت استعمال کرنے لگے۔ متاخرین سے وہ شعرا مراد ہیں جو گیارہویں صدی کے بعد سے کنڑی زبان میں شعر کہنے لگے۔ ان شاعروں کے کلام میں لفظ کو معنی کی بہ نسبت زیادہ اہمیت دی جاتی ہے۔ یہ شعرا اپنی تمام قوت بیان واستعداد صنائع کے استعمال میں صرف کرتے ہیں۔ اور اسی کو اپنا ہنر اور کمال سمجھتے ہیں۔ صنائع پر وہ ایسے فریفتہ ہوگئے کہ ان کی تعداد بتیس سے بڑھا کر ایک سو پچاس تک کردی ہے۔ کنڑی کے شعرا ان کے استعمال کرنے میں ہرگز پس و پیش یا کوتاہی نہیں کرتے۔ سمندر، شہر، نہر، دریا، مجلس، گلشن وغیرہ کے بیان میں ان صنعتوں کے استعمال میں حد سے بڑھ گئے۔ کنول پھول کا ذکر صنائع میں اکثر آتا ہے۔ چہرہ، آنکھ، ہاتھ، پاؤں، حتیٰ کہ پیٹ کی تعریف میں بھی کنول کو تشبیہ میں لایا جاتا ہے۔ یہی کنول ہے جو لکشمی کا مسکن ہے، یہی برہم کا مسند اور سورج کا معشوق ہے۔ آجکل کا شاعر کنول کو ان خیالات کے اظہار کے لئے استعمال نہیں کرتا۔ اس نے تقریباً اس قسم کی تمام صنائع کو ترک کردیا ہے۔ اور حقیقت کو موزوں الفاظ میں بیان کرتا ہے اور اس کا تاثر بہ نسبت صنائع لفظی کے بہتر ہوتا ہے۔ آجکل کے شعرا کے کلام میں صنائع لفظی تقریباً معدوم ہیں۔ شاعری میں صنائع کا ہونا کوئی لابدی امر نہیں ہے۔ بغیر صنائع کے بھی شاعری ہوسکتی بلکہ عمدہ ہوسکتی ہے۔ شاعری کی اصل خوبی دلربا، تسکین دہ اور فرحت بخش ہونا ہے جس طرح کسی حسین عورت کی خوبصورتی مصنوعی زیورات سے لدے بغیر دلکش ہوا کرتی ہے اسی طرح شاعری بھی بغیر صنائع کے اپنے حسن کا جلوہ دکھاتی ہے۔ کسی موضوع کو بغیر صنعت کاری کے اس کے اصل روپ و رنگ میں شاعرانہ انداز میں بیان کرنا ہی شاعری کا اصل مقصد ہے۔ آجکل کے بہت سے شعرا کنائے کی طرز پر کلام کہنے میں بڑا کمال رکھتے ہیں۔ بیندرے کی اکثر نظمیں اسی قسم کی ہوتی ہیں[3]۔ تصوفانہ پیرایہ میں نظم کہنا بھی آجکل کی شاعری کی ایک خصوصیت ہے۔

موضوع کی بنا پر آجکل کی نظموں کی دو قسمیں ہوسکتی ہیں۔ جن کو مختصر اور طویل کے نام سے موسوم کیا جاسکتا ہے مختصر نظمیں غزلیہ یا غنائیہ اسلوب کی ہوتی ہیں۔ یہ گویا شاعر کے دلی تجربہ اور احساسات پر مبنی ہوتی ہیں۔ قدیم شاعری میں اس وضع کے اشعار بہت کم پائے جاتے ہیں۔ وہ شعرا جن کو خدا کے بندے ہونے کی فوقیت حاصل ہے ان کے کلام میں اس طرح کی شاعری

---

[1] ۔ اسو لقامن ۔ اننی گونے وغیرہ

[2] ۔ کیلاسم ۔ راج رتنم کی اکثر تصانیف ۔

[3] ۔ پرندہ اڑتا ہے اور آؤ رقص کریں وغیرہ اس کی عمدہ مثالیں ہیں ۔

موجود ہے لیکن ان کی شاعری میں اکثر مذہبی باتیں پائی جاتی ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ چند اشعار ایسے بھی ہیں جن میں غزلیہ یا غنائیہ پیرایہ کی خاصیت موجود ہے۔ غنائیہ شاعری کو شاعر کے جذبہ سے خاص تعلق ہوتا ہے۔ یہ گویا شاعر کے جذبات کا ایک مجسمہ ہوتی ہے جو شاعری کے دوسرے خصوصیات سے پاک ہوتی ہے اس لئے یہ ایک خالص اور نرالی شاعری ہوتی ہے جس کا اثر بنی نوع انسان کے دلوں پر فی الفور ہونا لازمی ہے۔ اس لئے جیسا کہ کہا گیا ہے، شاعری میں اس قسم کے اشعار کو فوقیت حاصل ہے۔ اس نوع کا شعر کہنا نہایت دشوار امر ہے۔ زمانہ حال کے شاعر کا رجحان اسی قسم کے اشعار کے کہنے کی طرف زیادہ ہے۔ یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ چونکہ یہ خفیف شاعری ہے اس لئے اس کے لکھنے میں ایسی کوئی دشواری یا دقت پیش نہ آئیگی اور ہر ایک شاعر کے لئے یہ ممکن ہے کہ مختصر نظمیں لکھنے کی کوشش کرے۔ مگر جب شعر کہنے بیٹھیں تو معلوم ہوگا کہ یہ کتنا مشکل امر ہے۔ وہ جذبے اور ولولے جو شاعر کے دل میں موجزن ہوں خود بخود نکل کر شاعر کی زبان تک پہونچ جائیں۔ اور محل و موقع و موضوع کی مناسبت سے الفاظ بے ساختہ زبان سے نکل پڑیں یہی حقیقی شاعری ہے۔ جدید شاعر نے انگریزی ادب کی بہترین غنائیہ نظموں کے مطالعہ سے متاثر ہوکر اپنی زبان میں بھی اسی قسم کی شاعری کو رواج دینے کی کوشش کی ہے۔ ابتداء میں اس کو دشواری محسوس ہونے لگی کہ غنائیہ پیرایہ میں بیان کرنے کے لئے وزن و بحر کی مناسبت کو کس طرح قائم رکھا جائے۔ چند شعرا قافیہ کے بغیر اشعار لکھ چکے تھے لیکن ان کی مقبولیت عام نہیں تھی۔ پروفیسر بی۔ ایم سری کنٹیا نے جب انگریزی ادب کے بہترین اشعار کو ترجمہ کرنے کے بعد ان کو مجموعہ کی شکل میں شائع کیا تو یہ نوجوان شاعر کے لئے مشعل راہ بن گیا۔ اس کو شاعری کا ایک دفینہ یک بیک ہاتھ لگ گیا اور یہی وہ کنجی تھی جس کی بدولت شاعر نے اپنے دل کا مقفل خزانہ کھول دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شاعری کا سرچشمہ پھوٹ پڑا اور اس سے تشنہ دل و دماغ سیراب ہوئے۔

شاعری کے موضوع غیر محدود ہیں۔ اس کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ کوئی خاص شئے ہی اس کا موضوع بن سکے۔ صرف وہی اٹھارہ اشیا جو اوپر بیان میں آچکی ہیں شاعری کے موضوع بننے کے لئے مخصوص نہیں کی گئی ہیں انسان کے دل میں جذبہ کو حرکت دینے والی ہر چیز شاعری کا موضوع ہونے کے قابل ہے۔ دل میں جوش و امنگ پیدا کرنے والا انسانی تجربہ شاعری کا موضوع ہوسکتا ہے۔ مثلاً فنون لطیفہ کی کوئی شئے، گانا، تصویر، مورت، فطری عجائبات، مظاھر قدرت (Natural Phenomena) جیسا کہ ہوا، نسیم، بارش، طلوع آفتاب، موسم، یا حیوانات جیسے چرندے پرندے غرض ہر چیز زمین سے لیکر آسمان تک شاعری کا موضوع بن سکتی ہے۔ اشعار کے مجموعوں کی فہرستِ مضامین کے مطالعہ سے اس بات کا انکشاف ہوگا کہ موضوع شاعری ایک وسیع کائنات ہے جس میں ہر چیز شامل ہے۔ کنڑی کی جدید شاعری میں ایسے بہترین اشعار کی کوئی کمی نہیں جو ہر ایسی شئے پر لکھے گئے ہوں۔ ذیل میں ایک مشہور شاعر کی ایک نظم کا خلاصہ دیا گیا ہے۔ اس سے موجودہ شاعری کے خیالات کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے:۔

چاند کو دیکھ کر ایک بچہ اپنی ماں سے مخاطب ہوکر سوال کرتا ہے "اے ماں یہ تو بتا، کیا یہ فرشتوں کا پیپر منٹ ہے؟ چوسنے پر بھی وہ گھٹتا ہی نہیں۔ میں ہر روز اس کو دیکھتا ہوں۔ پندرہ دن تک وہ حجم میں کم ہوتا ہے اور پندرہ

دن میں پھر مکمل ہوتا ہے۔ کیا میں اس پیپر منٹ کو پاسکتا ہوں؟ ماں جواب دیتی ہے۔" اے بیٹا اگر تو فرشتوں کا بچہ ہوگا تو تجھ کو بیشک یہ پیپر منٹ نصیب ہوگا۔" بچہ اپنے کو فرشتوں کا بچہ ہونے کے ذکر کو سنتے ہی فوراً اچھل کر کہتا ہے۔" اماں جان! فرشتوں کا بچہ بننا مجھے پسند نہیں ہے۔ تو مجھے ان فرشتوں سے بڑھ کر ہے۔ مجھے ایسے پیپر منٹ کی ضرورت نہیں جو مجھ کو اپنی اماں سے الگ کرتا ہو۔"[1]

یہ ایک مختصر نظم ہے جس میں بچے کی زبانی ماں کی فوقیت وعظمت کو دلپذیر اسلوب میں بیان کیا گیا ہے۔ بچے کو ماں خدا سے بڑھ کر پیاری ہے۔ یہ خیال ہرگز نہ کیا جائے کہ اس میں خدائی کا انکار پایا جاتا ہے۔ اس شعر میں وہ تمام خوبیاں اور خصوصیات جو غنائیہ شاعری کے لئے ضروری قرار دی گئی ہیں، موجود ہیں۔ شعر کے پہلے حصہ میں جو محرک جذبہ ہے اس کی تصویر کو نہایت عمدگی سے آنکھ کے سامنے پیش کیا گیا ہے۔ نظم کے دوسرے حصہ (وسط) میں محرک جذبہ کا فعل یا کرشمہ موجود ہے جس میں خیالات کے اتار چڑھاؤ کو محسوس کیا جاسکتا ہے جوش کا جزر ومد اس میں پایا جاتا ہے۔ اس لئے اس منطقی بحث کا سب سے آخری حصہ نتیجہ خیز ہے جہاں ارادہ کی استقامت واستواری کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ اور جوش قطعی طور پر اتر چکا ہے۔ میں نے اس پر اس لئے کسی قدر طویل بحث کی ہے تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ انگریزی غنائیہ شاعری کے تمام اوصاف سے کنڑی شاعر نے پوری طور سے استفادہ کیا ہے۔ اور اس کی بھی کوشش کی ہے کہ اپنی زبان کی شاعری کو انگریزی کی شاعری کے خصوصیات سے منور کرے۔

عورت پر اچھے اشعار لکھے گئے ہیں اور ایسے اشعار کی ایک بڑی تعداد پائی جاتی ہے۔ ہمارے قدما کی نظروں میں عورت خوبصورتی کا ایک مجسمہ ہے مگر اس خوبصورتی کے بیان میں اکثر اوقات عورت کو زندگی کی دلچسپی اور محبت کا ایک آلہ تصور کیا گیا ہے۔ اس میں کوئی کلام نہیں کہ پاکدامن عورتوں کے افسانے اور کہانیوں سے پر ان پڑے ہیں، مثال کے طور پر سیتاجی، ساوتری، انوسویا وغیرہ عورتوں کی عصمت کے افسانے زبان زد خاص وعام ہیں۔ ہر بچہ بوڑھا ان کے ناموں سے واقف ومانوس ہے لیکن ان کے اعضا کے بیان میں چند باتیں ایسی کہی گئی ہیں جن کو اعتراض کے قابل خیال کیا جاسکتا ہے۔ عورت کے بیان میں سراپا طوالت وصراحت کے ساتھ لکھا جاتا ہے۔ وہ اعضا جو ہمیشہ پوشیدہ رکھنے کے قابل ہیں ناظرین کی آنکھوں کے سامنے برہنہ حالت میں منکشف کروئے گئے ہیں۔ خوبی وحسن ان کے پوشیدہ رکھنے میں مضمر ہے نہ کہ افشا کرنے میں۔ عورت کی تصویر اس طرح کھینچی جاتی ہے کہ اس کے بدن کا ہر عضو زیور سے لدا ہوا ہوتا ہے گویا عورت کو اس قابل ہونا چاہیئے کہ وہ ان تمام زیورات کے بوجھ کو برداشت کر سکے۔ عورت کی صنف کے بیان میں شاعر اپنے تمام ذوق وکمال اور استعداد کو صرف کرتا ہے خواہ اس کا تعلق محل وموضوع سے ہو یا نہ ہو۔ شاعر اپنے ان تمام معلومات کو جو اس نے کوک شاستر کے مطالعہ سے حاصل کئے ہیں بیان کر دیتا ہے۔ اس سے

---

[1] کرایہ کاسیکے کی نظم چندر (چاند)۔

اصل مضمون کا تسلسل منقطع ہوجاتا اور بیان کی روانی اور شگفتگی میں خلل واقع ہوجاتا ہے اس طرح عورت کو تین یا چار مرتبہ ناظرین کے سامنے پیش کیا جاتا ہے ۔ اہم مواقع یہ ہوتے ہیں ۔ اولاً وہ ہمارے سامنے اس وقت آتی ہے جب وہ سن شعور و بلوغ کو پہنچتی ہے ۔ یہ ایک ایسا موقع ہے کہ شاعر اس سے خوب فائدہ اٹھا کر بدن میں جو ردوبدل واقع ہوئے ہیں ان سب کا تفصیل وصراحت کے ساتھ ذکر کرتا ہے ۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ کوئی باحیا عورت اس حصہ کو پڑھنا پسند نہ کریگی ۔ عورت کو ایسے موقع پر پیش کیا جاتا ہے جبکہ وہ دلہن بنتی ہے ۔ یہ وہ موقع ہے جب کہ شاعر عورت کو تمام زیورات سے سجانے میں اپنی ساری قابلیت مذاق فن اور علم کو صرف کر دیتا ہے ۔ اس کے بعد اس عورت کو ہم حاملہ کی حالت میں دیکھتے ہیں یہاں بھی شاعر ان تمام تبدیلیوں کو جو بدن میں رونما ہوئی ہوں بیان کرکے عورت کی ننگ و ناموس کو بالائے طاق رکھ کر اپنوں اور پرایوں سے تعارف کرا دیتا ہے ۔ عورت کی یہ وہ تصویر ہے جس کو ہم متاخرین کی شاعری میں دیکھتے ہیں ۔ اس میں کوئی کلام نہیں کہ ان میں صنف نازک کے حسن و سیرت کے متعلق بہترین اشعار پائے جاتے ہیں لیکن یہ اکثر متقدمین کے کلام میں موجود ہیں ۔ متاخرین صرف صنعت لفظی پر فریفتہ ہو کر شاعری کے اصل مقصد کو ذہول کر چکے ہیں ۔ اس کا نتیجہ معنیٰ کا خون ۔ اس کے علاوہ عورت کے بارے میں ان حالات کا بھی ذکر آتا ہے جو عاشق و معشوق کی جدائی اور وصال سے پیدا ہوتے ہیں ۔ جدائی کی حالت میں معشوقہ بیتاب ہو کر بخار سے تڑپتی رہتی ہے ۔ اس کی تیمارداری کی خاطر تمام سہلیاں دنیا بھر کے اہتمام و سربراہی میں مشغول ہوجاتی ہیں ۔ کوئی کنول کے پتول اور درخت کی کونپلوں سے بستر تیار کرتی ہے تو کوئی صندل کو بدن پر ملتی ہے تاکہ اس سے تپش کی شدت میں کچھ کمی ہو ۔ کوئی پنکھے سے ہوا کرتی ہے تو کوئی پنیروان سے ٹھنڈے پانی کی بوندوں کو ٹپکاتی ہے ۔ مگر یہ سب چیزیں بے سود ثابت ہو کر اس کی حالت زار کے اضافہ میں ممد و معاون ہوتی ہیں ۔ اس طرح کا بیان تمام تر قدیم شعراء کی ہر ایک تحریر میں موجود ہے ۔ عورت کے حقیقی احساسات کو بیان کرنے میں زمانہ حال کا شاعر زیادہ کامیاب ثابت ہوا ہے ۔ سماجی زندگی میں عورت کا جو درجہ ہے اس کا آج کل کے شاعر نے اچھی طرح مطالعہ کیا ہے، عورت کی طرز زندگی اور دوسرے حالات کا بخوبی مطالعہ کیا اور اس بارے میں کافی تجربہ رکھتا ہے ۔ اس کی خوشی، غم، مصیبت، بدبختی وغیرہ سے وہ بخوبی واقف ہے اور یہی وہ چیزیں ہیں جو اس کی شاعری کو جوش میں لاتی ہیں ۔ ذیل میں ایک نظم کا خلاصہ دیا گیا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ عورت کو کیا کیا تکلیفیں اور مصیبتیں جھیلنی پڑتی ہیں ۔ اس نظم کا عنوان ہے "بیوہ عورت"۔

"دیور نے یہ کہکر اس کو گھر سے باہر نکال دیا کہ تو اب سے مجھے اپنی صورت نہ دکھا ۔ وہ بے چاری آہ و زاری کرتی ہوئی گھر سے باہر نکلی ۔ اس کا باپ بچپن میں اس کو کھیلتے اور تماشا کرتے دیکھ کر محظوظ ہوتا تھا مگر اس وقت اس نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا ۔ اب وہ رنج و الم کی گھڑیاں کاٹ رہی ہے ۔ پیٹ بھرنے کے لئے وہ غیروں کے سامنے نہایت تکلیف اور شرمندگی سے ہاتھ بڑھاتی اور گلی گلی پھرتی ہے ۔ عزیز و اقارب اس کو نفرت و کج خلقی سے مخاطب کرتے ہیں ۔ وہ اپنے سر کو جھکاتی اور اپنی برباد زندگی پر ملامت کرتی اور یاس و حسرت کے ٹھنڈے سانس بھرتی ہے۔

گو ماں زندہ ہے لیکن یہ یتیم ہے۔
اس کا گھر موجود ہے پر یہ بے گھری ہے۔
اس کے عزیز موجود ہیں مگر وہ لاچار و بے سہارا ہے۔
وہ قلب بے روح ہے۔ زندہ ہے پر مردہ ہے۔"

اصل اشعار میں جو لطف اور خوبی اور زور کلام ہے اس کو ترجمہ میں پوری طور پر ادا کرنا محال ہے۔ پھر بھی اس بات کی کوشش کی گئی ہے کہ مفہوم ادا کیا جائے۔ یہ نظم دل کو ہلا دینے والی ہے۔ اس کے پڑھنے سے سنگدل بھی نرم پڑ جاتا ہے اس نظم میں عورت کی ایک نہایت المناک تصویر کھینچی گئی ہے۔ سوسائٹی میں جو سلوک اور برتاؤ ایسی عورت کے ساتھ کیا جاتا ہے اس کا حقیقی نقشہ یہاں کھینچا گیا ہے۔ جذبہ میں ایسی شدت و زور اور تیزی پائی جاتی ہے کہ شاعر عورت کے مصائب کو دیکھ کر برداشت نہیں کر سکتا اور احساسات اس کی زبان سے بے ساختہ الفاظ کی شکل میں نکل آتے ہیں۔ اب آنسوؤں کو قابو میں رکھنا دشوار ہو جاتا ہے۔

اس نظم میں مرد عورت کے ساتھ جس بے دردی اور وحشیانہ طریقہ سے برتاؤ کرتا ہے اس کو موثر طریقے اور موزوں الفاظ میں بیان کیا گیا ہے اس میں کوئی بات ایسی نہیں ہے جو مبالغہ آمیز ہو۔ سوسائٹی میں بیوہ حقارت کی نظر سے دیکھی جاتی ہے اس کی زندگی کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ شادی و برات جیسے نیک رسوم کی ادائی کے وقت بیوہ کی موجودگی کو بدشگونی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ کوئی کسی کام پر باہر نکلتا ہے اور اتفاق سے بیوہ عورت اس کے سامنے آتی ہے تو وہ خیال کرتا ہے کہ اس پر کوئی آفت نازل ہونے والی ہے۔ بیوہ اپنی باقیماندہ زندگی کو ایک گوشہ میں تنہا بسر کرتی ہے۔ سوسائٹی کے دل میں بیوہ کے لئے کوئی رحم و کرم نہیں پایا جاتا۔ اس ظالمانہ اور غضبناک سلوک کا نتیجہ یہ نظم ہے جس کو شاعر نے نہایت خوبی کے ساتھ ادا کیا ہے۔

بہتیرے اشعار حب الوطنی پر لکھے گئے ہیں۔ متقدمین کے کلام میں وطن کی محبت بالراست شاذونادر ہی شاعری کا موضوع بنی ہے بلکہ وہ اپنے احساسات و خیالات کو اوروں کی زبانی ظاہر کرتے تھے۔ ملک کرناٹک کا تذکرہ کہیں کہیں آتا ہے۔ پمپا، آنڈیا، جیسے شہرہ آفاق اور اولوالعزم شعرا کی تصانیف میں کرناٹک کو حب وطن کا مرکز قرار دیا گیا ہے۔ اس کے وصف میں شعرا نے اپنے جان نثارانہ احساسات کا اظہار کیا ہے۔ کرناٹک کے دلربا فطرتی مناظر، وہاں کے رنگ برنگ کے پرندے، جگہ جگہ دلکش گلستاں، رسیلے پھل، دھان کے کھیت، نسیم سحری، زندگی بسر کرنے کے لئے تمام آسائش و رہائش کی اشیاء وغیرہ کا تذکرہ تفصیل کے ساتھ آتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ملک کرناٹک میں یہ نعمتیں خداداد ہوتی ہیں اور شاعر ملک کرناٹک میں پیدا ہونا پسند کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قدیم کنڑی زبان میں متعدد شعرا وجود میں آئے اور اپنے کلام کا ایک بڑا ذخیرہ چھوڑ گئے۔ یہاں شاعری کا ایک بڑا خزانہ ہے جس سے شاعر فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ جو شاعر فطرت کی گود میں پلا ہوا

ہوتا ہے اس کی شاعری میں جدت پائی جاتی ہے اور وہ اپنے وطن کو اپنی جان سے بڑھ کر عزیز رکھتا ہے۔ اور اس کی زبان سے جو کچھ نکلتا ہے وہ اپنے وطن کی تعریف میں نکلتا ہے۔ آج کل کے شعرا کبھی حب الوطنی کے احساسات کے ظاہر کرنے میں کسی شاعر سے پیچھے نہیں ہیں۔ ان میں سچی محبت پائی جاتی ہے۔ ان کے کلام میں ایسا زور پایا جاتا ہے کہ پڑھنے والوں کے دل میں ولولہ اور جوش کا دریا امنڈ آتا ہے۔ ان کا کلام ہمیشہ کے لئے دل و دماغ میں گھر کر جاتا ہے۔ ایسی نظموں میں "اودیا واگلی چلو واکنٹرناڈو" مقبول عام بن چکی ہے۔

قدیم شاعری میں عظمت، شان و شوکت، برتری اور دلربائی، پائی جاتی ہے۔ جدید شاعری میں سادگی، خیالات کی سنجیدگی، نزاکت و باریکی موجود ہے۔ قدیم شاعری کو ایک پہاڑ سے تشبیہ دی جا سکتی ہے، جو دور سے دیکھنے والے کو بڑا دلکش معلوم ہوتا ہے اور جس میں چھوٹے بڑے درخت، خار، پھول، چٹان، چشمے اور جواہر پائے جاتے ہیں۔ جدید شاعری ایک دریا ہے جو زمین کو سیراب کرتا ہوا بہتا ہے اور جس سے بہت سی نہریں نکلتی ہیں جس کے کنارے رنگ برنگ کے پھول مہکتے ہیں اور بھانت بھانت کے پرند چہچہاتے ہیں، اور جس کی رفتار کبھی تیز کبھی دھیمی ہوتی ہے مگر ہر حالت میں خوش نما اور دل موہ لینے والی ہوتی ہے۔

جدید شاعری میں صنعت لفظی و اغلاق بہت کم ہے۔ کوئی لفظ ایسا نہیں ہے جس کے لئے لغت کا حوالہ درکار ہو۔ تاہم شاعری کی تمام خوبیاں موجود ہیں یہ رس سے بھری ہوتی ہے یہ بجا طور پر کہا جاتا ہے کہ ایک کلمہ یا جملہ جو رس دار ہو اس کو شعر کہا جا سکتا ہے محض صنائع و بدائع کا نام شاعری نہیں ہے گو صنائع و بدائع شاعری کے حسن و لطف کو دوبالا کرتے ہیں مگر جدید شاعر کا رجحان صنائع لفظی کی طرف نہیں ہے بلکہ خیالات کو دلپذیر پیرایہ میں ادا کرنے کی طرف ہے۔

جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے شاعری کا مضمون نہایت وسیع ہے جو تمام کائنات اور انسانی جذبات پر حاوی ہے۔ اس کے ہر پہلو پر تفصیلی بحث کرنا تقریباً محال ہے۔ مگر اس موقع پر ایک امر کے متعلق کچھ کہنا ضروری ہے۔

ان بے شمار موضوعوں میں سے جو شعر میں بیان کئے جاتے ہیں جانوروں سے محبت کرنا بھی شاعری کا ایک موضوع خیال کیا جاتا ہے۔ بلی، چوہے، ہرن، کتے، چرندے پرندے، درندے غرض کہ سبھی حیوانات شاعری کا موضوع بننے کے قابل سمجھے گئے ہیں، گو کہ برہمن کو شاستر میں کتے کو چھونے سے منع کیا گیا ہے (شاید یہ اس کے گوشت یا ہڈی کے کھانے پر مبنی ہو)۔ قدیم ادب میں کتے کا بیان اکثر شکار کے موقع پر آتا ہے۔ کتا صیاد کے شکاری ساز و سامان کا ایک جز ہے اور اس کا بیان اسی حیثیت سے کیا گیا ہے۔ کتے کی ایمانداری اپنے مالک کے ساتھ گو مانی ہوئی بات ہے لیکن یہ بدنصیبی ہے کہ قدیم ادب میں اس خیال کو کوئی جگہ نہیں دی گئی۔ مذہبی لوگ کتے کو چھونا تو کجا اس کے سایہ سے دور بھاگتے ہیں۔ ان کے سینہ میں اس جانور کے لئے کوئی رحم نہیں ہے۔ جدید عصر کا شاعر اس سختی سے جو کتے کے ساتھ برتی جاتی ہے بہت متاثر ہوا ہے اور اس کو موضوع شاعری بنا کر مختلف اسلوبوں میں بیان کیا ہے تا کہ اس برے رواج کی جو صدہا سال سے چلا آرہا ہے بیخ کنی کی جائے۔

کُتّے کے متعلق بہتیرے واقعات سے مضمون اخذ کیا گیا ہے۔ یہاں صرف ایک واقعہ کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔ ایک دن موسلا دھار بارش ہو رہی تھی ایک کتا بھاگتا ہوا برسات میں جا رہا تھا کہ کہیں پناہ لے۔ کسی نے اس کے پاؤں کو مارا تھا جس سے وہ لنگڑا رہا تھا۔ ایک مکان کا دروازہ کھلا پاکر اس نے اس طرف کا رخ کیا۔ ایک عمر رسیدہ مذہبی شخص دروازہ پر کھڑا ہوا یہ تماشہ دیکھ رہا تھا۔ کتے کو دروازہ کے اندر داخل ہوتے ہوئے دیکھ کر اس نے فوراً زور سے دروازہ بند کر لیا۔ اور کھڑکی میں سے دیکھنے لگا کہ کتے کا کیا حشر ہوا۔ کتا موری میں گر پڑا۔ پانی کا زور اس قدر تھا کہ کتا پانی کی رو میں آ اور بہہ گیا۔ اور اس کو پھر دوبارہ نظر نہیں آیا۔ یہ شخص ہنستے ہوئے یہ کہہ پڑا "کہ جو کرتا ہے سو بھگتا ہے۔ چونکہ کتا اس مکان کو ناپاک کرنا چاہتا تھا اس لئے اس کا یہ حشر ہوا۔ یہ واقعہ جدید شاعری کے لئے ایک عمدہ موضوع بنا ہوا ہے۔

بہتیرے اشعار عشق کے متعلق لکھے گئے ہیں۔ چونکہ یہ مضمون بہت وسیع ہے اس لئے اس مختصر مقالہ میں اس کے متعلق زیادہ تفصیل کے ساتھ بحث نہیں کی جا سکتی۔

اب طویل نظموں کے بارے میں چند باتیں کہہ دینی کافی ہیں۔ طویل نظموں کے مضامین اکثر قصے، کہانیوں اور داستانوں پر مشتمل ہیں۔ غنائیہ شاعری کو نفسی شاعری سے اور طولانی شاعری کو خارجی یا موضوعی شاعری سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ اول الذکر شاعر کے نفسی جذبات و ذاتی احساسات تک محدود ہے لیکن موخر الذکر کے لئے یہ شرط نہیں ہے کہ وہ شاعر کے خاص نفس تک ہی محدود رہے بلکہ ہو سکتا ہے کہ شاعر اپنی داخلی دنیا سے عبور کر کے خارجی دنیا کی سیر کرے اور وہاں کے واقعات کو اپنی شاعری کا موضوع قرار دے۔ طویل نظموں کو دو حصوں میں منقسم کیا جا سکتا ہے۔ (۱) جن میں پرانوں کی داستانوں سے مضامین اخذ کئے جاتے ہیں اور ان کو نئے سانچے میں ڈھالا جاتا ہے یعنی ان کا طرز بیان بالکل جدید وضع کا ہوتا ہے۔ اس میں شاعر مکمل آزادی سے قصہ میں موقع کی نوعیت کے لحاظ سے رد و بدل کر دیتے ہیں۔ (۲) جن کا ماخذ سماجی زندگی کے واقعات کی کہانیاں ہیں عموماً یہ کہانیاں خیالی نہیں بلکہ واقعات پر مبنی ہوتی ہیں۔ ممکن ہے کہ چند خیالی بھی ہوں جن کو اصلیت کے سانچہ میں ڈھالا گیا ہو۔ ان کے مطالعہ سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ یہ خیالی اور فرضی ہیں اس لئے کہ ان میں روزمرہ زندگی کے عام حالات بیان کئے جاتے ہیں۔ انگریزی ادب سے بھی چند طویل نظموں کے ترجمے کئے گئے ہیں جو اس میں داخل ہیں۔ ان اشعار میں جو خصوصیت نمایاں طور پر نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ ان میں کسی ایک یا ایک سے زیادہ اشخاص کے کردار کے بیان کو اہمیت دی جاتی ہے۔ مثلاً پرانوں کی داستانوں میں ایک داستان راجہ پانڈو، جو پانڈوں کا باپ تھا، اور اس کی بیوی مادری کو ایک طویل نظم کا موضوع قرار دیا گیا ہے۔ اس میں مادری کے کیرکٹر (کردار) کو نہایت خوبی سے بلند درجہ تک پہنچایا گیا ہے۔ مادری پانڈو راجہ کی چہیتی بیوی تھی جس کے بطن سے نکل وسہادیو نامی دو لڑکے تولد ہوئے۔ کنتی پانڈو کی بڑی بیوی یعنی مہارانی تھی۔ جب پانڈو کا انتقال ہوتا ہے تو اس کی چہیتی بیوی مادری ستی ہو جانے کے لئے تیار ہو جاتی اور اپنی سوکن سے یہ کہہ دیتی ہے کہ تو اپنے بچوں کے ساتھ میرے بچوں کو بھی پرورش کر۔ اس طرح اپنے بچوں کو کنتی کے حوالہ کر کے مادری ستی

ہو جاتی ہے۔اس قصہ کے بیان میں مادری کے کردار کو اس دانشمندی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے کہ اس کی عصمت کو چار چاند لگ جاتے ہیں۔چترانگدا نامی اور ایک طویل نظم ہے۔یہ نظم تمام نظموں سے لمبی ہے۔اس کی کہانی کو بھی مہابھارت سے اخذ کیا گیا ہے اس میں دو ہزار پانچ سو کے قریب مصرعے ہیں۔غیر مُقفّا نظم (بلینک ورس) میں اکثر تمثیلیں لکھی گئی ہیں۔یمن سولو' ناگرک' تپسونی وغیرہ مقبول خاص وعام ہو چکی ہیں۔اسوتھامن مہابھارت کا ایک بہادر ہے جو اپنی بہادری اور شہ زوری میں یکتا ہے مگر وہ بدبختی کا شکار ہوتا اور خودکشی سے اپنی جان دیتا ہے۔اس تمثیل میں مصنف پوری آزادی سے کام لیتا اور اس قدیم داستان میں اہم تبدیلیاں کرتا ہے۔چونکہ یہ قدیم زبان میں لکھی گئی ہے اس لئے ایک مستند کتاب مانی جاتی ہے اور اکثر کنٹری ایم۔اے کے نصاب میں درسی کتاب کی حیثیت سے شامل کی جاتی ہے۔اس کے مصنف پروفیسر بی ام سری کنٹیا ہیں۔

رامائن سے بھی کہانیاں اخذ کی جاکر جدید پیرایہ میں لکھی گئی ہیں[1]

زندگی کے روزمرہ واقعات کو بھی موضوع شاعری قرار دیا گیا ہے۔ذیل میں ایک کہانی اختصار کے ساتھ درج کی جاتی ہے تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ موجودہ زمانہ کا شاعر کس طرح عوام کی زندگی سے ارتباط رکھتا ہے۔

ہُنّی کی شادی[2]

ہُنّی ایک گاؤں کے پٹیل کی اکلوتی لڑکی تھی۔اس کی ماں کا انتقال اس کی طفولیت میں ہی ہو چکا تھا جس کا علم اس کو نہ تھا۔اپنی بیوی کے مرنے کے بعد پٹیل نے دوسری شادی کرنی پسند نہیں کی۔ پٹیل کا خیال تھا کہ دوسری شادی کرنی اپنی پہلی بیوی کی محبت میں غداری کرنی ہے اس لئے عمر بھر اس نے دوسری شادی کا خیال نہیں کیا۔وہ اپنی بیٹی سے بہت محبت کرتا تھا اور اس کی نہایت ناز و نعمت سے پرورش کی تھی۔ہُنّی بھی باپ سے اپنی جان سے بڑھ کر پیار کرتی تھی۔ہُنّی سن بلوغ کو پہونچی تو اس کے باپ نے اس سے شادی کا تذکرہ کیا۔لیکن شادی کرنے سے وہ اپنے باپ سے جدا ہو جائے گی۔یہ خیال کر کے ہُنّی شادی کرنے سے انکار کرتی ہے۔زمانہ گزرتا گیا۔ہُنّی نے دیہات کے فطرتی مناظر میں پرورش پائی تھی۔وہ جنگل کی دیوی تھی۔ہر روز کھیت کو جاتی۔مغرب تک کام کرتی۔کبھی کبھی اپنی سریلی آواز سے دل کھول کر گانا گاتی۔ایک روز کا واقعہ ہے کہ وہ حسب معمول گانا گا رہی تھی تو اسی گانے کو اس نے کسی اور شخص کو دہراتے سنا۔ وہ متحیر ہو کر ادھر دیکھنے لگی یکایک ایک کشادہ سینہ والا نوجوان اس کے سامنے گاتے ہوئے آکھڑا ہو۔اس نوجوان کی روشن آنکھیں اور کشادہ پیشانی کو دیکھ کر ہُنّی یکلخت اس کی محبت میں گرفتار ہو جاتی ہے۔نوجوان اس سے مخاطب ہو کر کہنے لگا کہ میں ایک عرصہ سے تجھ پر فریفتہ ہوں مگر چونکہ نیچ جات سے ہوں اس لئے اس کا انکشاف نہیں کیا۔تو مجھ سے شادی کر اور میری جان بچالے۔ہُنّی کی آنکھوں میں محبت کے آنسو ڈبڈبائے۔وہ بھی عشق میں مبتلا ہو چکی تھی۔مگر بے چاری کچھ

---

[1] تپسونی وغیرہ

[2] ہُنّی مدوے مصنفۂ کے شنکر بھٹ۔

نہیں سکتی تھی اس لئے کہ سماج ایسی رشتہ داری کو قبول نہیں کرتا تھا اپنی مجبوری ظاہر کرکے وہ وہاں سے چنپت ہوگئی۔ گانوں والے
یل کو مجبور کرنے لگے کہ وہ اپنی بیٹی کی شادی کا انتظام کرے کیونکہ وہ عمر کو پہونچ چکی ہے اس کو زیادہ دن تک بغیر شادی
یں رکھا جاسکتا۔ اس گاؤں کے ایک متمول شخص سے اس کی شادی قرار پائی لیکن ہُنی کو یہ شادی پسند نہیں تھی۔ اس نے
ینا دل دوسرے کے حوالہ کردیا تھا۔ مگر اس نے ایک حرف بھی اپنی زبان سے نہ نکالا۔ دوسرے دن شادی کے لئے
ام اہل و اقارب نہایت دھوم دھام کے ساتھ جمع ہونے لگے۔ شادی کے تمام انتظامات تکمیل کو پہونچ چکے تھے جب
تاب طلوع ہوا، دلہن کو سجانے کے لئے عورتیں آموجود ہوئیں۔ مگر کیا دیکھتے ہیں کہ دلہن غائب ہے۔ پورا منظر تبدیل ہوگیا
ٹی کی محفل ماتم کدہ بن گئی شادی کے لئے جو رشتہ دار آئے تھے وہ ہُنی کی تلاش میں منتشر ہوگئے۔ پٹیل نے حکم دیا کہ ہُنی
ا پتہ لگانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی جائے۔ ہزار کوشش کی لیکن ہُنی کا پتہ نہ چل سکا۔ آخر کار ایک کشتی ران نے آکر
یفیت دی کہ گذشتہ رات ایک عورت ایک مرد کی ہمراہی میں سمندر کے کنارے آئی اور دونوں کچھ دیر وہاں
ٹرے رہے بعد میں دونوں ایک دوسرے سے بغلگیر ہوکر سمندر میں داخل ہوئے اور پھر دکھائی نہیں دئے۔ یہ خبر سنتے ہی
یل حیران و پریشان ہوکر سمندر کی طرف دوڑا مگر وہاں جاکر کیا دیکھتا ہے کہ دو لاشیں ایک دوسرے سے بغلگیر تھیں اور
وش لہریں کھیل رہی تھیں اور سمندر کی موجیں اُن پر لوٹ رہی تھیں۔ یہ ایک معمولی قصہ ہے جو ایک بڑی طویل نظم کا
ترین موضوع قرار دیا گیا۔ اس قصہ کے بیان کرنے میں شاعر نے اپنے تمام شاعرانہ کمال کو صرف کردیا ہے۔ دوران
یان میں شاعر نے سماج کی خامیوں اور برائیوں کو ایک نہایت موثر طریقہ سے بیان کیا ہے کرناٹک کی بارش کے
ماں کا نہایت خوبی کے ساتھ نقشہ کھینچا ہے۔ اور کہیں کہیں کرناٹک کے دلکش مناظر کا بیان بھی آیا ہے۔ شاعر نے بین الفرق
ادی بیاہ کے مسئلہ کو بھی چھیڑا ہے۔

جدید شاعری کے ایک آخری لیکن نہایت اہم حصہ کی طرف اشارہ کرنا لازمی ہے۔ یہ وہ نظمیں ہیں جو بچوں
ے لئے لکھی گئی ہیں۔ قدیم ادب میں اس قسم کی شاعری نہیں پائی جاتی۔ وہ صرف عالموں فاضلوں کے لئے مخصوص تھی۔
ب یہ بتانا دشوار ہے کہ اگلے زمانے کے لوگ اپنے بچوں کو ابتداء میں کس طرح اور کن اشعار کی تعلیم دیتے تھے۔ معلوم
ا ہوتا ہے کہ پہلے پہل بچوں کو قواعد و صرف و نحو کی تعلیم دی جاتی تھی اس میں تھوڑی بہت مہارت حاصل کرنے کے
عد ان کو مستند کتابیں پڑھائی جاتی تھیں لیکن موجودہ زمانہ کی شاعری میں بچوں کے فائدے کے لئے عمدہ نظمیں لکھی گئی
ں چھوٹے بچے ان نظموں کو پڑھ کر بے حد محظوظ ہوتے ہیں پنجے منگیش راؤ، آنند کند، راج رتنم، پٹیا وغیرہ کے اشعار
وں کی تعلیم میں نہایت مفید و سودمند ثابت ہوئے ہیں۔ بچے ان کو پڑھ کر خوشی کے مارے پھولے نہیں سماتے۔ ان کی زبان
یس اور بچوں کی مناسبت سے ہوتی ہے۔ دقیق و پیچیدہ خیالات اُن اشعار میں بالکل نہیں پائے جاتے۔
ن کا طرز بیان اور موضوع دونوں دلکش اور دماغ کو تسخیر کرنے والے ہوتے ہیں۔ یہی خصوصیات ہیں
ا سے جدید شعرا ہر دلعزیز ہوگئے ہیں۔ کنڑی ادب کی اس شاخ میں روز افزوں ترقی ہوتی جارہی ہے۔

کتابیات

مصنف	نام کتاب
آر نرسمہا چار۔	کرناٹک کوی چرِی تے۔
ناگ ورم۔	(۱) کرناٹک چھندوم بُدھی (۲) کادنبری
نرپ تُنگ۔	کوی راج مارگ
پمپا ۔	بھارت، آدی پُران
رنّا ۔	گدا یُدّھا۔ اَجیتا پُران
پونّا ۔	شانتی پُران۔
جنّا ۔	یشودھر چرِی تے۔
ناگ چندر ۔	رام چندر پُران۔
ناگ ورم ثانی ۔	کاویہ اولوکن۔
بھیم کوی ۔	بسوا پُران۔
چاونڈراج ۔	وِش کمار چریتے۔
لکشمیش ۔	جے مِنی بھارت۔
رتملاریہ ۔	آپ رتناویہ چریتے۔
کیشی راج۔	شبدمنی درپن۔
بی۔ایم۔سری کنٹیا۔	اَسوتھامَن
کے۔وی۔پُٹپّا۔	یمن سولو۔ بِروگالی۔ رکتاکشی۔ چترانگدا وغیرہ۔
ایم۔سرینواس مورتی۔	ناگ رِگ۔
راج رتنم ۔	گنڈوگوڈلی، کدٹےپُری۔ تنوری وغیرہ۔
کیلاشم ۔	ٹولوگٹّی وغیرہ۔
بیندرے ۔	گری وغیرہ۔
آنند کند ۔	مُدّنا ماتو وغیرہ۔
مختلف اشخاص۔	کربا کانیکے۔ کنڑ واباوٹا۔
کے۔شنکر بھٹ۔	نلے وغیرہ۔

ان کے علاوہ حسب ذیل رسائل سے بھی اس مضمون کی تیاری میں مدد لی گئی ہے :-

۱ - بجے کرناٹک -	دھارواڑ -
۲ - پربدھ کرناٹک -	میسور
۳ - جینتی -	دھارواڑ -
۴ - رنگ بھومی -	بنگلور

خلاصۂ مضامین حصۂ انگریزی

(۱)

قیمتوں کو قابو میں رکھنا

از

ڈاکٹر انور اقبال قریشی، ام اے، ام ایس سی اکنامکس (لنڈن)
پی اچ ڈی، صدر شعبۂ معاشیات جامعۂ عثمانیہ

اس مضمون میں ڈاکٹر انور اقبال قریشی نے تفصیل سے یہ بتایا ہے کہ جنگ کے چھڑ جانے سے مختلف اشیاء کی قیمتوں میں اضافہ ہو گیا ہے۔

جنگ کے چھڑتے ہی تاجروں نے من مانی قیمتیں وصول کرنی شروع کر دیں ادویہ کی قیمتوں میں تو ناقابل برداشت اضافہ ہو گیا۔ اجناس خورد و نوش بھی بہت متاثر ہوئیں پہلے چند دنوں میں تو یہ حال تھا کہ قیمتیں دن بدن ہی نہیں بلکہ لمحہ بہ لمحہ بڑھتی رہیں۔ قیمتوں کے اس بڑھتے ہوئے سیلاب کا مقابلہ کرنے کے اکثر لوگ قابل نہ تھے۔ چنانچہ لوگوں کی طرف سے اس امر کا شدّت سے تقاضا ہوا کہ حکومت کو اس وبا کی روک تھام کرنی چاہئے۔ اس کے جواب میں حکومت ہند نے ایک قانون منظور کیا جس کی رو سے صوبجاتی حکومتوں کو اس بات کا اختیار دیا گیا کہ وہ ضروریات زندگی اجناس خورد و نوش، معمولی کپڑے، مٹی کے تیل، اور ادویہ کی قیمتوں کو قابو میں رکھنے کی کوشش کریں اور ان کو بڑھنے سے روکیں۔ چنانچہ جنگ چھڑنے کے دو ہفتے کے بعد تقریباً ہندوستان کے ہر صوبے میں قیمتوں کو قابو میں رکھنے کے لئے کچھ نہ کچھ انتظامات کئے گئے۔ اسی سلسلہ میں ہر صوبہ میں جو انتظام ہوا ہے اس پر اس مضمون میں بحث کی گئی ہے لیکن اس مضمون کا سب سے اہم حصہ وہ ہے جس میں حکومت سرکار عالی کی مقرر کردہ کمیٹی کی ان کوششوں کا تفصیلی ذکر ہے جو اس نے بلدہ حیدرآباد میں قیمتوں کو قابو میں رکھنے کے لئے کیں۔ اس سلسلہ میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ کسی طرح حیدرآباد کا طریقۂ عمل بہ مقابلہ برطانوی ہند کے صوبوں کے زیادہ بہتر ہے۔

(۲)

ہندوستانی اصطلاحات علمیہ

از
ڈاکٹر سید سجاد صدر شعبہ اردو جامعہ عثمانیہ

اس مضمون میں ڈاکٹر سید سجاد نے یہ بتایا ہے کہ حکومت بہار نے ہندوستانی اصطلاحات علمیہ، ہندوستانی قواعد اور درسی کتب مرتب کرنے کے لئے ایک کمیٹی "ہندوستانی کمیٹی" کے نام سے قائم کی ہے، جو چھ ماہرین پر مشتمل ہے۔ اس کمیٹی نے جغرافیہ، حساب، جبر و مقابلہ اور ہندسہ کی سینکڑوں اصطلاحات وضع کی ہیں اور انھیں ہندوستان کے مختلف ادارات وعلمائے کے پاس بغرض تبصرہ بھیجا ہے۔ اصولِ اصطلاحات کے سلسلہ میں کمیٹی کا

ادعا

یہ ہے کہ

(۱) حتی الامکان اصطلاحات کو ہندوستان کے مروجہ الفاظ سے اخذ کیا گیا ہے، نہ کہ راست سنسکرت، عربی، فارسی وغیرہ سے۔

(۲) "معین مفہوم" کی بجائے کمیٹی نے "جدید مفہوم" کے لئے ایک قدیم اور مروّج لفظ کو بدل دیا ہے۔

(۳) اس بات کی کوشش کی ہے کہ تعصب و تنگ نظری سے محفوظ رہیں۔

(۴) جہاں کوئی لفظ نہیں ملا یا موزوں تر نہیں ملا کمیٹی نے مجبوری کے سبب مغربی السنہ کی اصطلاحات اختیار کرلیں۔

(۵) اس بات کا لحاظ رکھا گیا ہے کہ وضع اصطلاحات کے لئے بڑے غور و خوض، صحیح شعریت، اعلیٰ جمالیاتی ذوق وغیرہ کی ضرورت ہوتی ہے، اور پھر کسی اصطلاح کا ساخت میں سادہ، تلفظ میں آسان، مشاہدہ میں نفیس، اور اصطلاحی رنگ لئے ہوئے ہونا ضروری ہے . . . . لیکن کمیٹی کا

عمل

یہ ہے کہ

(۱) وضع اصطلاحات میں کوئی خاص اصول ہی مقرر نہیں کیا،

(۲) علمی اور غیر علمی اصطلاحات کی صحیح شناخت نہیں کی،

(۳) علمی اور غیر علمی زبان کے فرق و معیار کو بھی نہیں سمجھا،

(۴) زبان کی قواعد کا لحاظ نہیں رکھا،

(۵) فارسی یا عربی سے کوئی موزوں لفظ اخذ کرنے کی کوشش نہیں کی،

(۶) اکثر فارسی و عربی الفاظ ہندوستانی میں عام و قدیم ہونے کے باوجود ترک کر دئے،

(۷) اصطلاحات میں عامیانہ رنگ بھر دیا،

(۸) بلا ضرورت غیر زبان کے الفاظ اخذ کر لئے

. . . .

توجیہ

کے لئے اس کمیٹی کی وضع کردہ اصطلاحات میں سے چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں :

چٹان کی بجائے		"ڈھیم"
کھم، ستون قطب وغیرہ کی بجائے		پول Pole
ناپ	" "	اسکیل Scale
خاکنائے	" "	"زمین جوڑ"
آبنائے	" "	"پن جوڑ"
Inadmissible	کے لئے	"نہ ماننے لائق"
Zigzag curve	" "	"ٹیڑھا میڑھا بانک"
Rationalization	" "	"بولیتی بنانا"
Extension of Theorem		"ثبوتی کو کام میں لانا"
Reductio indeterminate		"الٹا مان ثبوت"
Miscellaneous	" "	"پھٹ کر"
Superposition	" "	"اوپر تلے رکھنا"
Respectively		"اسی سلسلہ سے"
Prefix		"سرلاگو"
Artifice	" "	"چٹکلا"
Common	" "	"ساجھی"

وغیرہ۔

بظاہر کمیٹی کا

مقصدِ واحد

یہ معلوم ہوتا ہے کہ اب تک جو ہندوستانی رائج ہے، اس کے قدیم اور مقبول عام ہونے کے باوجود اُسے کالعدم کرکے "ہندوستانی" ہی کے نام سے ایک غیر مانوس زبان "ہندی" کو رائج کیا جائے۔

نتیجہ

جس کا یہ ہوگا کہ

(۱) زبان سے علمی رنگ مفقود ہو جائے گا،

(۲) اعلیٰ مفاہیم و تخیلات کے اظہار کے لئے زبان بہت محدود ہو جائے گی۔

(۳) تعصب و تنگ نظری بڑھتی جائے گی۔

(۴) بلاضرورت غیر زبان کے الفاظ داخل ہونگے۔

انھیں "مشتے نمونہ از خروارے" مقدمات کے مدنظر بہار کمیٹی کے تجاویز کا تفصیلی جواب دیا گیا جس کا خلاصہ وہ ہے جو اوپر درج کیا گیا ہے۔

---

through the medium of western education was one of the main causes. There were some restrictions in the old system of Kanarese Poetry both in form and subject that hindered the freedom of poets' imagination. The Kavyas ought to have contained only 18 items and each item was defined and certain restrictions were imposed and the poet had not the freedom of expression. The back-ground was religion. Jaina poets excepting a few, wrote the lives of Thirthankaras, or stories relating to the preaching of doctrines of Jainism. The Veerasaiva poets wrote all about their religious personages and Brahman poets translated the Sanskrit Epics. Even the Vaishnavadasas who may be regarded as the first writers of the lyrical poems in Kanarese language strictly adhered to religious devotion to God and in their poetry the ethical atmosphere predominates. In Champu kavyas, the Sanskrit Vrittas and Kanarese Kandas have been freely used and there are very few instances where the pure Kanarese metre is adopted. Thus *Tripadis, Ragales, Akkaras,* purely belonging to Kanarese metre have been rarely used. Strict adherence to *prasa* was one of the restrictions. The number of Alankaras increased from 32 to 150.

The modern poet discarded *Prasa*. He has modified the old Shatpadi metre and without the restriction of lines he is using the same ganas, consisting of 3,4 and 5 matras. Blank verse has been introduced in Kanarese poetry. Many dramas are being written in this metre. The language is simple and homely and the poet is not so keen about the correctness of grammar. There are short and long poems. Short poems are mainly of lyrical nature; they are the embodiment of the poet's own experience, feelings and thoughts. Metre has been so nicely adapted so as to suit the lyrical nature of poetry. In this direction Prof. B. M. Srikantia's translation of English lyrics was a great help to the modern poet. The subject of poetry is unlimited; it may be any thing in human experience that inspires the poets' emotion; it may be an object of art or natural phenomena or a living being—including anything from earthen ware to the crest of sky. Thus music, fine picture, painting, sculpture, rain, wind, seasons, the Sun and the Moon, seasons birds, dogs, rats, and various human experiences such as sorrows, joys, patriotism etc., form the subject of lyrical poetry. There are some good poems written on woman. There are long poems also, which are mostly of a narrative nature. There are Pouranic stories or stories taken from the happenings in society or human life. There is poetry for children also. The old Kanarese poetry is destitute of this important branch of literature. The modern poets have produced the best kinds of poems for the use and benefit of children.

The article has been copiously illustrated by translations of the poems from the works of the modern poets, and reference is made to the works of Prof. B. M. Srikantia, K. V. Puttappa, Rajaratnam, D. V. Gundappa, V. Seetaramayya, M. Venkatesa Iyengar, D. R. Bendre, K. Betgeri, K. Shankarbhat and others.

Cases after cases have been multiplied to prove the contention.

Fourthly, at the time of the first informants, the minds of the Companions of the Prophet were not encumbered with any other literary activities. The only mental luxury of the previous age, poetry, was directly discouraged and was circumscribed to the point of vanishing. And they concentrated on the Quran and the *hadith*; and hence the reserved energy acted intensively rather than extensively, for the benefit of science.

Fifthly, the Companions of the Prophet had acquired means to get rid of the worries of earning the daily bread, and the horded treasures of the Byzantine and Persian empires relieved them for devoting themselves, soon after the conquests and even during them, wholly and solely to their pet subjects; and their wealth enabled them to collect data thoroughly and exhaustively, to the envy of modern researcher.

Sixthly, not only is the subject of the *hadith* the life and work of one sole person but also its eye witnesses exceed one hundred thousand. And the accumulated wealth from all these witnesses, regarding public life, regarding private and even conjugal life, regarding in fact every act of the life of the Prophet is a unique case in world history and unequalled by any other biography of any other nation.

Seventhly, the Arabs had specially cultivated their memorising talent to the extent unknown in other nations, this even at the expense of many other arts and sciences. Yet this fact has so much the more been useful from the point of view of accuracy required in our subject.

Eighthly, the Prophet himself took personal and keen interest in the transmission and diffusion of his commands, and he supervised and guided his Companions in this matter in multifarious ways.

Apart from the circumstances which provided for the preservation of correct data on the life of the Prophet, two more facts are not to be neglected. Firstly, the fact that the Companions tried their best to become models of the teaching of their Master. And secondly that they took special care to write down the facts regarding the life of the Master and Prophet. As to this last point, the author has proved conclusively and at length, with a wealth of data that at least ten thousand traditions were set down in writing by the very Companions of the Prophet.

The story of the generations of the transmitters of the hadith after the Companions will be dealt with in a later article.

---

4. *The Modern Tendencies in Kanarese Poetry, by D. K. Bhimsen Rao, M.A., Head of the Department of Kanarese, Osmania University.*

Various causes have been indicated which led to change in the modern living and thinking of people all over India. The influence of western culture,

The fate of every individual is his essential nature (عين ثابتة) as it exists from eternity in the Mind of God (i.e. Divine knowledge). Men receive of good and evil what the necessity of their natures demands.

Human actions are *self-determined,* because they are strictly in accordance with their essential nature (i.e. essences, which are uncreated and perfect, being the ideas of God). That is why we are *responsible* for our actions, and being responsible we are rewarded or punished.

It is also true that God creates our actions, because it is He who manifests externally what is contained in the 'essence'—the "essences" being ideas, and ideas being accidents, depend for their being on God. (Determinism).

That is how Islam reconciles Determinism and Indeterminism in a Doctrine of Self-Determination. Dr. Iqbal seems quite willing to embrace this doctrine as is shown by the citations given in this paper from his only philosophical prose work the "Reconstruction".

---

3. *The Compilation of the Hadith by Mawlana Manazir Ahsan, Head of the Department of Theology.*

For long it was believed by European science, that the first attempts to compile the *hadith* in written form from the mass of oral traditions were made two hundred years after the Prophet. In this article, the author has studied the question from the point of view of internal evidence.

First he emphasises the fact that the *hadith* constitutes in fact the history of one of the epoch-making periods of human history. Again, its bearings on the whole world were not merely political but social, economic, religious, spiritual, etc. as well, meaning the life of Muhammad, the Prophet of Islam with followers numbering by hundreds of millions in all parts of the world.

As regards histories of other peoples and other epochs, the ultimate sources of information are generally constituted by street gossips, stories, oral traditions compiled from hearsay evidence and the like. There is scarcely anything based on the authority of eye witnesses. Even what little is of this kind, no data is available as to the character, trustworthiness, memory, and intelligence of the first transmitters. Not so regarding the history of the life and time of the Prophet which has been fortunate in more than one respect.

Firstly, the first informants of the *hadith* were all eye witnesses and participants in the acts narrated.

Secondly, the *hadith* is a concentrated and compact history: not of one people or one country or one epoch but of one and only one person. Such enormous data revolving on one sole point is unparallelled.

Thirdly, the first informants of the *hadith* were devotes of their subjects and not antipathists to distort facts. Further, they were imbibed with the greatest scruples regarding accuracy and abstention from even exaggeration.

SYNOPSES OF URDU ARTICLES

(PUBLIHED IN THIS VOLUME)

---

1. *Battlefields in the Time of the Prophet, by Dr. M. Hamidullah, Department of Law, Osmania University.*

In this article, illustrated with maps and a number of photographs specially taken for the purpose, Dr. Hamidullah describes in detail the tactical and strategical aspects of the battles of Badr, Uhud, Khandaq, Mecca, Hunain and Ta'if, together with a special note on the wars with the Jews of Madinah.

The author had the special privilege of twice visiting Hijaz before writing on the subject. The article was first delivered as an extension lecture, illustrated with slides, at the Sorbonne and was forthwith published in the *Revue des Etudes Islamiuues* (vol. 1939, cahier 1) of the University of Paris under the heading "Les Champs de bataille au temps du Prophete". The present is not a mere translation: the matter has almost been trebled, with several corrections. especially regarding the location of Hunain.

Dr. Hamidullah gives in brief the background of the wars under review, and then presents all the relevent data on them from original sources, MSS. as well as prints; and analysing these data, he also locates the several geographical names mentioned in this connexion as well as positions taken by the opposing forces.

---

2. *Iqbal and the Doctrine of Free Will and Determinism by Dr. Mir Validuddin, Department of Philosophy, Osmania University.*

Dr. Iqbal seems to maintain the doctrine of Determinism with as much force as he maintains the position of Indeterminism. In all his poetical work we find this glaring contradiction quite evident. In the present paper an attempt is made to reconcile Determinism and Indeterminism in a doctrine of Self-Determinism which may be easily accepted by those who find themselves in sympathy with Dr. Iqbal. This doctrine may be succinctly stated thus:

God, the knower together with His knowledge and the objects of knowledge or ideas exist eternally. The ideas are the essence of things. The essence of things (اعیان ثابتة) are eternally known to God—being His ideas. God's creative word (کن , "Be!") actualises their existence, but properly they bring themselves into existence because He only wills what they have it in them to become.

According to this plan the new language which will thus be evolved will be *Hindi plus English plus Sanskrit* and named, Hindustani, which will never be "commonly understood" in Hindustan and defeat the very end of the "Instructions" discussed at length above. The current Hindustani, which enjoyed for centuries the reputation of being the Lingua Franca of India, is *Hindi plus Hindicised Sanskrit plus Indianised Persian plus Persianised Arabic* will disappear from its habitat. The Hindustani which began its career with at least Chand Bardai, the bard of Raja Prithvi Raj, and was developed by Sur Dass and even by Tulsi Dass and others and then cultivated by great writers of the Deccan, Delhi and Lucknow and other centres seems to have been called upon in its advanced age to start its life anew by killing its old allies and making new alliances".

(16) In the word concurrent (-hambindi, hambindoo) the prefix is "con" and not "co" for which the Persian "ham" has been adopted in the list. The Sanskrit prefix "sam" is the same word as the English "same" and is also probably the original form of the Persian "ham", (s changing into h which is very frequent so far as the words of these two languages are concerned), but I have satisfied myself that "sam" was never employed in Hindustani. I have, however, no objection to it. It is a useful word and may be used. I have used it as employed in the famous compound *tatsam* تتسم (-that same,) the Sanskrit class of words in Hindustani.

(17) The Sanskrit "ut" (ات) is the same as "ut" in *ut*most with "utter" as comparative but it is very unfamiliar.

(18) Bindoo (for point) is no word. Kindly refer to Fallon again.

(19) New Sanskrit words have been introduced into the Hindustani vocabulary, for instance,

Base ارهاد	extreme ات	Projection پراس
equi سم	negative گھٹ	rock ڈھیم
general سادھارن		

(20) No attempt has been made to find out a new suitable Persian word or an Arabic one from the Persian vocabulary.

(21) Many words from Persian and from Arabic used in Persian which are common in Hindustani have been omitted.

(22) Hindustani Persian words, retained, are probably those for which no equivalents of other languages were forthcoming.

(23) Non-scientific terms do not need separate rules. What is true of one class of terms is also true of all other classes.

In conclusion I feel irresistably inclined to observe that the "Instructions" issued to the Sub-Committee are calculated to suppress the existing Persian and Persianised Arabic elements and to entirely stop their future natural infiltration into the Hindustani language. It is manifest from the list of terms that the attempt has been started with Hindi and ended with Hindi, adopting some new English terms and a few Sanskrit ones.

(8) Certain words are made with the help of Sanskrit suffixes which Hindi itself never incorporated and which are extremely repulsive to Hindustani:—

Divisor بھاگن (ن؟) of the agent
Multiplier گونك (ك) of the agent
Multiplicant گونت (ت) of the object

(9) Certain words have been translated by expressions and not by terms which method should be discouraged:—

Miscellaneous پھٹ کر — respectively اسی سلسلہ سے
super-position اوپر تلے رکھنا

(10) Dialectic words have been indiscriminately employed for dignified scientific terms:—

Recapitulation دھرانا — Variable بدلو
Hypothesis مان — Problem بناؤنی

(11) Original terms have been adopted instead of accepting long existing terms in Hindustani (probably because they are Persian or Arabic):—

Square-root (جذر) — Centre (مرکز)

(12) Persian "izafat" in living currency in Hindustani has been entirely thrown out of the language. "Izafat" is a power and some-times removes difficulties of compounds of a serious nature. It is like the Latin connecting vowels.

(13) گنیا (gunya) is a good word for set-square. In Delhi it is a common word in masonry and means a big wooden triangle used to find out whether a wall, etc., is straight or not and also to determine triangular positions of certain parts of a building.

(14) Ka'b and cube, as stated in the list, are not of the same origin. The original Greek word is a sort of corruption of the Semetic word Ka'b from which the famous ancient "Kaba", the sacred building at Mecca, derived its name. Besides, "Kab" is an old geometrical term in Hindustani.

(15) Pyramid should not be retained. Haram and Ahram are well known Hindustani words. They are known to us as much as to the Egyptians. We might retain these words even when they are dropped in the country of the pyramids.

(2) Certain words are incorrectly translated:—

Reduction بدلنا
Sign نشان
Operation کاج
Squared paper چار خانہ کاغذ
Rationalisation بوتی بنانا
Alternative دوسرا
Application کام میں لانا
Alphabet حرف یا حرفی
Arrange سجانا

Experimental کرتی
Practical کرتی
Ambigous دوبہاؤحالت
clockwise direction گھڑی چال
Data دی بات
Intercept بچ ٹوک.
Infinity بے حد
Extension of theorem ثبوتی کو کام میں لانا
standard. پکا

(3) There are cases of incorrect use of existing words:—

Artifice چٹکا
Common ساجھی

(4) Certain words are too Sanskritic to be Hindustani:—

Lowest ات چھوٹا
Base ادھار

Alternado اکانترانوپات
General سادھارن

(5) Unrefined combinations of words:—

General Enunciation } سادھارن بیان

Radius ادھ قطر
Point of contact هم بندی هم بندو

(6) Certain words are wrong:—

ناپت It must be نچلی - پنت (denominator). There can be no such word from نیچا The letter ا in it is wrong.

Identity ایکسائی . There is no such word, nor can there be any such word. The correct word is yaksan from which we can derive yaksani or yaksaniat. Construction بنوٹ, drought سکھاڑ, problem بناؤنی, are all wrong.

(7) There are cases of bad grammar:—

Problem بناؤنی
Inadmissible نہ ماننے لایق
Reductio Indeterminate الٹا مان ثبوت
Ex-centre. باھر سنٹر

Admissible ماننے لایق
Exponental بل بتائی
Duplicate ratio دوھرا انوپات
Divisor بھاگن (ن ?)

Consideration No. 6. Words may be very freely coined by combinations but the rules of compounds must always be kept in view. Zaminjor is not grammatically incorrect but the two members zamin and jor are not congenial neighbours and are not representative of good class compounds.

As for the rest of the words quoted here, that is, planet, eliptic, equinox, equator, isthmus and strait there already exist words in the language, called, Hindustani.

Consideration N. 7. states that words have been selected which have "not only affinity in sense but also some resemblence in sound with the English Terms". I am against all such devices. In a serious work like the present we should avoid being attracted by the mere exterior of a word or else due to this mechanical tendency we are likely to allow the sense of a word to suffer. If by chance we happen to strike on a word of outer resemblence we may gladly take it, but to make it a guiding consideration is unscholarly. Basan (باسن) is a good general term for any earthen or brass vessel but to recommend it for the sake of sound for the English "basin" which has a variety of meanings, is not advisable. Similarly legan (لگن) a flat basin, is unfit to take the place of the English "lagoon" signifying a sheet of water, somewhat like a lake. The Zuider Zee in Holland and the shallow water on which Venice has been built and by which it is surrounded are called lagoons. Lagan looks rediculous for such things.

TERMS.

As regards some of the coined terms I wish to state my conclusions briefly without entering upon a detailed criticism of any of them.

(1) The Committee has coined new terms for those which already exist in Hindustani and are to be found in standard dictionaries of the language, *e.g.*:—

Axiom,	آپ سچ	Conclusion,	پھل
Postulate,	مان سچ	Synthesis,	ملاؤ
Definition,	پہچان	Analysis,	بلگاؤ
Negative,	گھٹ	Lowest common multiple, etc.	
Positive,	جٹ	etc.	اتچھوٹاساجھی گونا پھل

All these have equivalents in our language and have been in use at least since 1840 when voluminous books on mathematics were produced by master Ram Chander of European fame and many of his pupils at the Literary Society of the Delhi College.

One or more experts must always co-operate with the Committee. Perfect elucidation of the import of a term is an inseparable factor of the work and dictionaries alone can never fully serve such a purpose.

CONSIDERATIONS.

Towards the end of its introductory remarks the Sub-Committee enumerates about 9 considerations as guiding their work. In consideration, No.. 3, there has been raised the question of the "General Sense" and the "Exact Scientific Sense" of a term and in view of the supposed difference between these two senses the word "chatan" given in a dictionary for "rock" has been rejected as containing general sense and the so-called *simple* word "dheem" chosen to "indicate the exact sense". In my opinion this is unscientific. Because there is no such thing as "general sense" or "exact scientific sense". All words, scientific, literary or of general use have exactly the same life and observe the same rules. Their imports are fixed by us and they are called into service for those very imports. There is nothing in the nature of a word to spontaneously yield a certain exact sense. The whole language is arbitrary and artificial. The only difference between a scientific and non-scientific term is that the former is current in a limited circle of scientists and the latter in a wider circle of society. The sense in a word is neither exact nor loose. It always has in both cases the same dimensions of meaning. "Chatan", however, has the sense of a rock, as the "rock" has only the sense of chatan. "Dheem" is a dumb word and never has the power of directly indicating the requisite "exact sense" as claimed. If we employ "dheem" for rock we simply do so arbitrarily and attach to it only in our imagination some scientific "exact sense". Beyond the imagination there is no such phenomenon. *Chatan* is a famous equivalent for rock with a complete fixture of the sense of a rock. Besides, if in English the old word rock has been retained for the scientific idea of a rock why not retain chatan for the same scientific idea (if any) of a rock. One of the attributes of "dheem", as pointed out in the consideration, is its alleged simplicity probably against the heaviness of the word chatan. This is very doubtful. We shall do well if we do not take simplicity into consideration at all, otherwise we shall be losing many good words and our language will be poorer for that.

As for consideration No. 4, Arabic and Sanskrit words should be used, provided they are of value but not because they are, as stated in this para, "simple" and "convey exact sense". To me none of the words proposed under this item conveys any sense at all, For "oasis" "naklistan" a word of frequent occurence in our literature and not "wah" and so forth.

Consideration N. 5. English words may be adopted in very rare cases and with very great reserve. But it is inconceiveable to adopt "pole" or "scale" for want of a better Hindustani term. We have words for every sense of these words.

REMARKS.

I also regret my inability to indentify myself with the initial remark (of the introductory remarks by the technical Terms Committee) "that the work requires, on the part of those engaged on it,

great imagination,
true poetic inspiration,
fine aesthetic sense,
subtle analytic power, etc."

The remark is rather pedantic and unnecessary and probably misleading. *The whole problem is one of Translation* with its inherent disadvantages and requires a thorough knowledge of the existing vocabulary of our language, a thorough knowledge of its grammar, particularly of the compounding system of Sanskrit, Hindi, Persian and Arabic and a complete mastery over all the numerous prefixes and suffixes of these languages which are incorporated in our language and occur in words of our daily use. To a certain extent we must also know the philological and phonetic career of our language and its history in order to be able to coin a new word according to its current and living and not obsolete and dead specimens both in grammar and vocabulary. We must also cultivate a correct sense of translation which will enable us to see how best to proceed with our task in each particular case, whether the translation of the root-meaning of an original term will suffice or the whole inner content or a prominent part of it will do and so on, or whether an old word of our language with mild cannotative modification or slightly altered application can serve the purpose and so forth. Last, but not least, we must have a true sense of the genius of our language which will give us a balance of mind, preventing us from leaning to and exaggerating one element of the language at the expense of the other elements. This sense will also tell us that a word which has long been the citizen of the realm of our language must not be discarded on the basis of a feeling or prejudice. Instances of the breach of these observations abound in the list.

Further on, the Sub-Committee remarks that new terms should be simple in form, easy of pronounciation, elegant in appearance, etc. I may be pardoned if I state that these are the layman's laws. Apparently they appeal but linguistically they are superficial, and, if seriously taken notice of, they are apt to hinder the progress of work by narrowing down the scope of our choice. It is in most cases very useful to lose sight of the outer form of a word and think of the serviceability and utility of a word for a certain meaning. The English language ceases to be English in its stage of nomenclature and becomes either Latin or Greek and absorbs words of monstrous structure. All lexicons of scientific terms are full of such words and to us or to an Englishman they never appear disagreeable, unpleasant or harsh.

Section (b) under the same heading, Scientific Terms, says, "Failing (Current Indian Terms), terms usually employed in scientific terminology in the *West* should be *adapted to our requirements.* So far as the word "West" is concerned I take strong exception to it. This is also too vague and almost meaningless. Do we mean that we can borrow terms direct from all the dead and living continental languages of Latin, Teutonic and Slavic groups, etc. That is not possible. Apparently we mean Continental terms as *incorporated* in the English language. If so, we must delete the word "West" and replace it by the word "English". Experience shows that in so doing we will be saved a lot of trouble of spelling, pronounciation and of grammar. We will then follow in such respects the one way of English through which usually we know the Western terms.

The words "adapted to our requirements" in the foregoing section are equally indefinite and are not clear to me. And since no explanation is forthcoming in the instructions I am left to mere guessing, and, if I am not mistaken, *Adaptation* was once a practice for making foreign words muarrab or mufarras. Some think it can be allowed even now. My idea is that the necessity for adapting words does not exist any longer. Adaptation consists in changing certain vowels and consonants or in changing sound-quantities of consonants. In the Patna list the word *trapezium* has been mutilated to "tirpezi" تَرپیزی "Antarctic drift" انتارک تک رو instead of اینٹارک ٹک رو. Such changes are only perplexing. We learn such words during the course of our education and know them in their entirety. If we choose to adopt them we must lift them bodily and not "adapt" them which is but conscious corruption and is not permissable particularly in the circle of the educated.

Again I cannot appreciate the attitude revealed in the instructions where preference or priority is given to English terms over the Persian, Arabic and Sanskrit ones. This is plainly speaking putting the cart before the horse. We may have loanwords from English but only when we fail to find a word from Persian, Arabic or Sanskrit and not otherwise. The reason is not far to seek. Hindustani can be more naturally and conveniently international with our languages than with any of the Europeon languages. In our tongue grammatical particles, prefixes and suffixes from these languages are indiscriminately mixed up and commonly recognised by our grammar which fact is of vital importance in deriving a series of words from a substantive, etc., whereas such linguistic units from English and through it from Latin and Greek have not has yet even touched the surface of our language and do not stand any such chance in future either. Hence, we are entitled to borrow from English vocabulary only only when every source of our own has failed to help.

monly understood. In the second place, the common knowledge of Hindustani is, for various reasons which I need not detail here, so meagre even among the educated classes that we can never trust our judges. In my opinion, however, all those words must be accepted as "commonly understood" or more exactly, "understood" which have been registered in well known lexicons of Hindustani. As the question of Urdu and Hindi has for sometime past been highly controversial and as I have good grounds to believe that Urdu lexicons such as, the "Farhang-i-Asafia", the "Nurul Lughat", the Jamiul Lughat" and others, are not treated by a certain section of our society as representing the true vocabulary of the Hindustani language so I would like to mention only such dictionaries as have been compiled wholly by Englishmen and are entitled, "Hindustani" (not *Urdu*) dictionaries by their authors. The first of these was prepared by Dr. Gilchrist as long ago as 1785, who for the first time gave our language, the name of "Hindustani". The second about 30 years later by John Shakespeare, the third by Platt and the fourth by Duncan Forbes before 1850. These do not contain all words, thousands, specially used by artisans, being still unwritten, but whatever they record really constitutes the great heritage of our language, developed and refined by all communities during the course of centuries, and this long before the Urdu-Hindi dispute came into being. The contents of these dictionaries were the common property of all those who spoke and wrote in Hindustani. Hence, I would emphatically submit to the Behar Committee to delete the words "Commonly Understood" from their instructions No. (a) and put *"Hindustani Sources as understood and embodied in standard* Hindustani Dictionaries". Should this argument of mine be acceptable to the Committee it would strengthen their hands and supply hundreds of words already in usage in our language.

I may also remark in passing that the phrase, "commonly understood" should not be emphasised. There is no point in it. The stratum of a language "commonly understood" is one which in its nature is not scientific and not capable of being specially understood. We learn the stratum, commonly understood, as children and the scientific stratum when we grow and study science. Scientific ideas are abstract, intricate, special and so subtly combined that in order to grasp them we have to devote special thought. Common or rather commonplace ideas are conveyed by a stratum of language "commonly understood" and do not demand special attention to assimilate them. If we insist on making use of "commonly understood" vocabulary for ideas of science it will be against all logic of the language and we will have to admit that in so doing we meet the *"specially understood"* ideas through the medium of "commonly understood" language. Here in the list in seeking to confine ourselves to the "element commonly understood" we have actually entered into the linguistic sphere of the illiterate to the exclusion of all provision for the educated.

Geometrical terms,

آپسیچ	,,	,,	axioms,
مان سیچ	,,	,,	postulate,
ناپت	,,	,,	dimension,
گھٹ	,,	,,	negative,
مان	,,	,,	hypothesis,
ملاؤ	,,	,,	synthesis,
دھرا	,,	,,	axis..

These terms, (some of which are grammatically wrong and others entirely wrong as members of our vocabulary), belong to the *colloquial* stratum of our language and are absolutely devoid of scientific tinge, scientific import and scientific life, and, when placed by the side of the English terms they appear nothing short of rags, and fail to impress us about their future. Moreover, if all the Hindi vocabulary is thus, as in the list, handed over to science we are bound to face a complex situation when we need it for general purposes; we will be connotatively bi-stratal, for example:—

(circumference)	گھیر	originally means sorrounding size of a dress, robe or anything,
(sphere)	گولا	originally means a cannon ball.
(hemisphere)	ادھ گولا	originally means a half cannon ball.
(revolution)	گھماؤ	originally means turn or as much land as can be ploughed in a day by a single pair of bullocks,
(hypothesis)	مان	originally means dignity, obey, admit,
(synthesis)	ملاؤ	originally means adulteration.

If, however, in our scheme, we intend to make terms for the Hindustani language and for all those sections of our Society who use Hindustani as their vehicle of thought, we should explore the total language, called Hindustani, employing the entire grammar of that language and not only Hindi and its grammar.

In the same section (a) under reference, the words "Commonly Understood", qualifying "Current Indian sources" is also vague and misleading. For, in the first place, there can be no standard by which we can judge whether a word is com-

modern Indian languages of Aryan, Dravidian and other families. But in making the terms, the Committee has not understood it in that sense, as in its list of terms we do not come across any word from Bengali or Marathi or Telugu. This expression, therefore, as is abundantly proved by the terms themselves, is equivalent to "Current Hindi Sources". If it is so, and I think it is so, we must definitely and frankly state that our first and foremost source is "Hindi". If we do not do so the word "Indian" used above would look like a cloak for the word Hindi, and it creates suspicion as to our motive.

'Hindi", however, is the indisputable background of the Hindustani language and, as a matter of principle, we ought to utilise this source of our tongue whenever conveniently possible. But, at the same time, it must be borne in mind that our Hindi element is too dialectic to be freely employed for intricate, full-bodied and dignified ideas of science. Hindi element is most wonderful for simple ideas and for things of daily use but it has been so deep-set for such purposes that it resists being applied to strange new scientific ideas. My whole sense of vocabulary of various types was disturbed when I found that in this list under discussion long existing Hindi words with long careers in their fixed inner contents were roughly dragged into an unwilling service for new sets of ideas. For instance,

Geographical Terms

گھیر	is used for		circumference,
نکل	,,	,,	source,
گولا	,,	,,	sphere,
ادھ گولا	,,	,,	hemisphere,
پہلا روپ	,,	,,	primary feature.
کھنگال	,,	,,	denudation,
اونچائی	,,	,,	altitude.
گھماؤ	,,	,,	revolution.
ھوا گولا	,,	,,	atmosphere,

Algebraical terms,

جٹانوپات	,,	,,	componendo,
بدلانوپات	,,	,,	convertendo,
نچلی	,,	,,	denomination,
بے ناپ	,,	,,	incommensurable,
پھٹ کر	,,	,,	miscellaneous,
اوپری	,,	,,	numerator,
گھٹن	,,	,,	subtrahend,

HINDUSTANI TECHNICAL TERMS

BY

SAYYAD SAJJAD

The Government of Behar have established a Committee called, The Hindustani Committee, consisting of six experts, for the purpose of preparing a Hindustani Dictionary, a Hindustani Grammar, Hindustani Technical Terms and Text Books in the Hindustani language. The Committee has coined hundreds of words in Geography, Arithmetic, Algebra and Geometry and sent them to various institutions and scholars in India for expression of opinions and suggestions and it will finally approve them in the light of criticism received.

The Sub-Committee of Technical Terms was given certain instructions to be followed in preparing new Hindustani words and in view of the fact that the instructions are responsible for the type of terms made by the Sub-Committee they are of vital importance.

In addition to these instructions the Sub-Committee has placed on record its own observations which it made during the course of its active effort in the direction of making new terms and has also circula.ed them together with the Hindustani Terminology under the heading "Introductory Remarks by the Technical Terms Committee" and as they form part of the instructions referred to above and have considerably influenced the nature and structure of new words they are equally interesting and important.

The above mentioned material was forwarded to me in full for opinion and the reply which I wrote runs as follows:

"The questions involved in this connection are manifold and can fully be discussed personally rather than by means of *long range* correspondence. I am, however, making below some attempt to set forth, briefly my views on certain points. As I am interested in the whole problem of Hindustani Technical Terms I have examined, besides the terms, the instructions, remarks and considerations also.

INSTRUCTIONS.

Under the heading Scientific Terms, Section (a) recommends that "Scientific Terms should, as far as possible, be drawn from *Current Indian Sources* and not directly from Sanskrit, Arabic, Persian or any other language." In my opinion the expression "Current Indian Sources" is too vague. It obviously implies all the

money on cheap grain shops for which a very large amount may be necessary, the Government are practically becoming patrons of and are advertising the shops of reliable dealers in commodities essential to the life of the community without spending money. We have opened 16 shops and are watching the experiment carefully. The public are notified that they should take receipts for commodities purchased at these shops to the value of Re. 1|- and more. The control over chemists and druggists is being exercised through the Chemists and Druggists' Association with increasing strictness it being found that some chemists buy from the Bombay markets a few drugs and medicines at a higher price and large consignments of the same drugs and medicines from the manufacturer's agents in Bombay at lower prices and ask the Association to notify the higher price in order to benefit themselves. The Price Control Committee has taken up the subject and has asked the Secretary of the Association to report weekly the lowest prices at which various drugs and medicines can be imported from Bombay and to notify those prices only plus the sanctioned rate of profits so that the public may purchase drugs and medicines at the lowest possible prices in Hyderabad.

The trend of prices in all agricultural commodities does not show any extraordinary rise at present.

Some Concluding Remarks.

I have described at some considerable length the system of price control in Hyderabad and I believe that ours is the most rational and scientific system. If we have not been able to check the rising tide of prices of imported articles we are hardly to be blamed, as we have no control over the prices of such articles. Even then I have made personal inquiries and taking into consideration all costs the retail prices of several products that we are controlling are cheaper in Hyderabad than in Bombay. If the Government of India takes immediate steps to control the Price of imported articles with the co-operation of the port towns, on the same lines as we are doing in Hyderabad, I am convinced that the profiteering could be considerably controlled, and the present situation fairly eased.

Coarse rice rose by 6 per cent. in July 1939 and in August by 8 per cent., as compared with its price in July 1938. With a slight improvement in the monsoon conditions in the later half of August, the price fell a little, but from the 1st week of September, owing to the combined causes, viz., shortage of rain and the declaration of war, the price shot up again—gradually to 121 as against 106 in August 1939 and 100 in August 1938 which is taken as the basis index number. Even in normal years a large quantity of jawar is imported from Bijapur and other districts of the Bombay Presidency and much rice is imported into the Dominions from the Madras Presidency.

This year rice is being imported at increasing prices as is seen from the invoices (bijaks). The Committee is investigating the invoice prices of all food-grains (including rice) and after adding thereto the normal rates of profit of wholesale and retail dealers, is comparing the prices thus arrived at with the prevailing wholesale and retail prices in the bazaar. The latter will be published weekly. If, after making allowance for daily fluctuations in the market, the bazaar price is found to exceed the invoice price plus normal profit of wholesale and retail dealers, the Committee, which is watching the daily bazaar prices, will notify maximum retail price for information of the public.

The price of refined sugar rose in 1938 because a syndicate was formed in Upper India on account of the smaller production in 1938 and the preceding year. Between August 1938 and July 1939, the price went up by 22 per cent., and again by 3 per cent. more as soon as war broke out in September. Since then, the price has been slowly going down and is now 18 per cent. more than in August 1938 and 7 per cent. less than in August 1939.

There being complaints that in spite of weekly bazaar prices of commodities being broad-cast through the radio and being published in local papers retail dealers, in commodities essential to the life of the community, are charging more than the 9 per cent. profit sanctioned by the Price Control Committee. After making careful inquiries and after being satisfied that profiteering is going on by retail shopkeepers, the Price Control Committee decided to open a few model shops in different localities of the city in charge of reliable traders. These are not cheap grain shops but are shops wehere commodities will be sold at prevalent bazaar prices notified by the committee. The inducement to these certified shops will be that their names and addresses will also be notified in papers, so that public can buy their stuffs at these shops if ordinary retail dealers charge more. The result will be that customers at these Government shops will increase and profiteering will be checked and curbed to some extent. Instead of spending Public-

is imported or local. After adding wholesalers' profit, the wholesale price on the basis of Bezwada prices given above, will be Rs. 16-5-0 per palla of 120 seers. The Retailer's net cost at gunj comes to 7 seers, 6 chatacks per rupee. Retailer's transport and other expenses are reported to be annas 4|- per palla. The net cost for the retailer at his shop is therefore Rs. 16-9-0, that is to say, net 7¼ seers per rupee. If they sell the rice at the rate of 6¾ seers per rupee, their profit would be about 6 per cent.

The merchants agreed that even if there are two wholesale dealers at the gunj in the same transaction the wholesalers' profit would not exceed 3 per cent. as the second wholesale dealer would buy only if it pays him to do so at Hyderabad gunj which practically means that if a wholesale dealer at gunj has got large stock purchased at lower price and the market price is higher, he may be able to clear his stock at a lower price than the actual proforma price on the basis of Bezwada rate. It appears that the practice of two wholesale dealers coming in the same transaction is very rare.

The price of Bezwada rice, Warangal and Mahbubnagar rice, and the rice which is auctioned at Hyderabad gunj move practically in the same direction and have mutual influences on each other. It is therefore desirable that the auction prices should be collected regularly.

The above analysis clearly proves that our idea of fair price unlike most other provinces is not a vague one. We determine fair prices by a most scientific procedure which always remains the same. We also try to keep the public informed of the developments that take place. With this end in view a third press note was issued.

Communique No. 3.

It was stated in the press Communique of 26th September 1939 that except in case of medicines, drugs, coarse rice and other food grains, prices are either stationary or show a downward tendency since the declaration of war. This shows that any rise in the prices before 1st December 1939 was not due to profiteering owing to the war. The rainfall this year has been scanty in some parts of the Dominions and scarcity conditions prevail in some districts. For instance, jawar which is with rice, the staple crop of the Dominions, had gone up in price by 31 per cent. in July 1939, as compared with July 1938 because the yield of the kharif crop in many districts was estimated to be low on account of deficient rainfall. Since the declaration of war the price of jawar which had risen from 31 per cent. in July to 37 per cent. in August 1939, fell to 27 per cent. in the first week of September. It stands now at 33 per cent. higher than the 1938 level and 4 per cent. lower than in August 1939. Similarly, the deficiency of rainfall, and the consequent low estimate of the 'abi' crop must naturally affect the prices of rice.

The Fair Price of Rice.

The rice that arrives in Hyderabad by rail either from Bezwada or from Warangal, Mahbubnagar, Nizamabad is mostly on Hyderabad wholesalers account. They purchase rice at the place of origin and sell it here on the basis of their net cost. The rice from Bezwada, Warangal and other places is generally auctioned in the gunj. It was reported that one or two per cent. of the arrivals may be auctioned on rare occasions. Rice which is brought from the districts round about Hyderabad is ouctioned in the gunj.

Ramsagar, konamani, gorkal from Bezwada and palasannal burmal from Warangal are the kinds of rices which are generally consumed by the poor and lower middle class.

Proforma from Bezwada rice is as follows:

Price of rice at Bezwada	B.G.	Rs.	11	4	0	for 246 lbs.
Freight	,,	,,	1	3	9	
Bezwada expenses	,,	,,	0	4	0	
Total ..	,,	,,	12	11	9	
Exchange at Rs. 16|8|- ..	,,	,,	2	2	6	
	O.S.	Rs.	14	14	3	
Customs on price of rice	,,	,,	0	9	0	
Customs on freight..	,,	,,	0	1	3	
F.O.R. Hyderabad ..	,,	,,	15	8	6	
Cartage & Hundarkari	,,	,,	0	2	0	
Loss in weight	,,	,,	0	5	0	
	,,	,,	15	15	6	

Loss on weight has been allowed at annas 5|- on 246 lbs for two reasons, that is to say, there is some difference in the net weight of 246 lbs in Bezwada and a palla of 120 seers at Hyderabad and for other losses in transit.

The wholesale dealers are agreeable to restrict on the whole their net profit to 3 per cent. and retailers also agreed to a net profit of 6 per cent. whether the rice

Retailer's Account.

Retailer's account is as follows:

Price of salt	O.S. Rs.	12	12	0	
Gunny bag	„ „	0	6	0	(Secunderabad Merchants charge annas 8|-).
Cooly	„ „	0	4	0	
Total ..	„ „	13	6	0	per palla.

The average cost to the retail seller is 9 seers per rupee and it was reported that the retailer usually sells at $8\frac{1}{2}$ seers per rupee on cash basis and about $8\frac{1}{4}$ for credit. The retailers' estimated profit works out to about 5 per cent. In this account the profit seems to be very low. If it is correct, the retailers must be making good deal by giving less in weight.

The price of salt in Bombay in the month of June is reported to have been B.G. Rs. 1-12-9 per maund. Since then it has gone up to about B.G. Rs. 1-13-3. This rise is seasonal and not due to war.

Recent rise in the price in Hyderabad of about annas 4|- per palla is reported to be mainly seasonal.

Before the war was declared, the price of gunny bags was B.G. Rs. 21-4 0 per 100 bags and it is now reported to be B.G. Rs. 31-4-0. The merchants informed me that the price of gunny bags is likely to go up still further. The rise in the price of gunny bags should not affect the price of salt at Hyderabad as there is sufficient margin left in the Secunderabad and Hyderabad charges of gunny bags, that is, the importers in Hyderabad charge annas 6|- per gunny bag which comes to about O.S. Rs. 37-8-0 per 100 bags and in Secunderabad the charges of annas 8|- comes to O.S. Rs. 50 per 100 bags.

The merchants have agreed not to raise the margin of profit and to keep the Government informed of the fluctuations of prices in Bombay and Madras. Mr. Dawood Abdulla of Begum Bazar, Ali Mohd. Hashim of Osman Gunj and Moosa Mohd. of Secunderabad have promised to supply information regularly. These names may be given to the chief appraiser. They have also promised to impress upon the retail dealers not to raise the retail prices without a rise in the wholesale rates.

The Fair Price of Salt in Hyderabad

Salt comes to Hyderabad from Bombay and from Madras Presidency (China Ganjam, Guntur district, Talmanchi, Nellore district and Nellore are the chief places of origin.) The merchants informed me that during the current weeks the ruling price of salt at Bombay is B.G. Rs. 1-13-3 per maund of 40 seers. They also showed me a letter from Bombay informing them that prices are likely to go up to B.G. Rs. 1-15-0, and asking the merchants to order two or three wagons at B.G. Rs. 1-13-9 ps. per maund.

Proforma for salt is as follows:

Price of salt per maund of 40 seers ..	B.G.	Rs.	1	13	3
Gunny bag	”	”	0	2	0
Railway freight	”	”	0	15	6
Total F.O.R. Hyderabad ..	”	”	2	14	9
Exchange at 17 per cent. (approximately) ..			0	8	0
Customs duty	O.S.	Rs.	0	10	8
Cartage and other charges	”	”	0	3	0
Total per maund ..	”	”	4	4	5

The calculation is based on the rate of O.S. Rs. 4-4-0 per maund of 40 seers.

Per palla	O.S.	Rs.	12	12	0
Deduct for barddana for wholesale ..	”	”	0	6	0
	”	”	12	6	0
Loss in weight—add Net cost	”	”	0	2	0
Net wholesale cost per palla	”	”	12	8	0
Sale price per palla	”	”	12	12	0

The merchants said that the maximum profit they earn is about annas 4|- per palla. The price of Bezwada salt is approximately the same as in Bombay. But there is difference of about annas 5|- in the Railway freight from China Ganjam in the Guntur district to Hyderabad. The wholesale price of Madras salt at Hyderabad is reported to be O.S. Rs. 11-8-0. The merchants, however, informed me that the quality of Madras salt is not as good as that of Bombay. They also said that if a wholesale buyer brings cash, they may sell at about O.S. Rs. 12-11-0 per palla and the rate for credit may go up to Rs. 12-13-0.

normal rate of profits (for wholesale and retail trade) to invoice-prices from Bombay merchants. The local chemists and druggists have agreed to sell at these prices; a list of which is now exhibited at every chemists' shop. These prices will remain in force until such time as wholesale prices go up or down in Bombay, whence almost all drugs are imported into Hyderabad.

The Committee is also fixing the retail maximum price of sugar of two kinds; viz.: sugar with large and small crystals. These prices are being broadcost, as well as communicated to the press, and will remain in force—till altered by the Government. The price fixed is the maximum price, and wholesale as well as retail dealers are of course at liberty to sell below this maximum prices, but not to exceed them. Increase in price charged by retail sellers above the maximum authorised by the Government, should be brought to the notice of the Chairman of the Supply Committee, with the names of the retail dealer, and the complainant. The Committee is now examining the prices of salt, paper and all kinds of grain; and a further communique in regard to them will be issued.

The System of Triple Control.

Normally in Hyderabad town the chief appraiser of the Customs Department prepares a list of weekly wholesale and retail prices which is published by the Department of Statistics. Also the Superintendent of Municipal Markets prepares a list of retail prices prevailing in the municipal markets. The Committee felt that in order to keep itself in touch with the daily market prices, and to find out if the various trades associations were discharging their pledges faithfully, it was necessary to have some agency of its own. Consequently two well qualified graduate inspectors were appointed to prepare a list of daily retail prices and also to see that the various traders in the town carried the instructions given to them by the Committee.

Thus we have introduced a system of Triple Control of Prices in Hyderabad town. All rise or fall in prices is carefully studied by the Committee. For the information of the public, the prevalent market prices (which are indirectly controlled by us so far as profiteering is concerned) are weekly published in the press and are also broadcast from the local State Broadcasting Station. If we find that the prices are rising or falling due to natural market conditions we do not interfere and allow the traders to charge the enhanced prices. If, however, it is discovered that the rise in prices is due to any profiteering we actively intervene. To illustrate how thorough our own methods of investigation are in determining fair prices, I reproduce two notes describing the whole procedure of determining the fair price of the following commodities which were prepared by the Director of Industries at the request of the Committee.

be drastically controlled, especially those which could be produced within H.E.H. the Nizam's Dominions.

The plea for helping the poor man by supplying him foodstuffs at cheap prices is very reasonable, but what justification is there to deprive our farmers of better returns when others are benefitting? There might be a lot of justification, for instance in England, to prevent the farmer from benefiting by higher prices of foodstuffs, because during the time of depression when wheat was sold at 4 *s.* 6 *d.* per cwt., the British Government had guaranteed him a normal price of 10 sh. per cwt. In India he was entirely left to himself at the time of falling prices. Therefore there is no justification for depriving him now of better returns. Consequently we decided to leave the farmers alone. Our system is to control the profits and not to control the prices and I must say that our system is more scientific, rational and practical, than any other system of control in India.

From the very beginning we followed the more rational policy of allowing replacement costs in the determination of prices and profits. Our system in brief is as follows.—

The System of Price Control in Hyderabad.

We call the trades associations and make a thorough enquiry about their costs and profits. In each trade we allow the profit that was charged before the war. We check the invoice prices of imported articles and the mandi' prices of local produce, add all costs and a maximum profit allowed, and then calculate the price. This, in the opinion of the Committee, is a fair price. We keep these price calculations confidential and watch the market prices. Our confidential prices are arrived at in consultation with the traders and they are told not to charge prices higher than the calculated prices. If the market price does not exceed this calculated price, we take no action. But if we find the prices prevalant in the market exceed our prices we call the traders association and ask for explanation with threats to enforce our price. In practice it has worked fairly well. At the close of our second meeting, for the information of the public we issued a second press note.

Communique No. 2.

Since the issue of the last Communique, the Committee has been carefully watching the trend of retail prices. Except in case of medicine and drugs, coarse rice, wheat, Bengal gram, and sesamum oil, the prices have been either stationary or show a downward tendency during the last fortnight. The Committee first took up the retail prices of drugs and medicines with the help of the association of local chemists and druggists. The retail price of every drug has been fixed by adding the

In this connection it must be realised that if the Government takes control of the previous stocks, the public will not or ought not to be allowed to buy as much as they like to hoard for the future. The necessary corollary of control of stocks is the rationing of the supplies. This, I am sure, will not be liked much in this country even by those who so enthusiastically advocate control of stocks. Once the consumer has asked the State to interfere, he will have to forego the soveriegnity of his choices.

Again if we assume that such control has been successful, what will happen when those previous stocks are exhausted? Will or should the Government continue to do trading on its own account or will it leave it to traders? If the traders are left to themselves they may buy stocks in anticipation of further demand as is usually the custom. Now, suppose, that war suddenly terminates and they are left with new accumulated stocks in their hands which have been purchased at high war prices, and due to the termination of war, the channels of supply open up all of a sudden and there is a heavy fall in the prices. Who is going to bear this loss? Certainly not the traders, why? Because if the Government will not allow them to profit out of war then they certainly should not bear the losses which arise due to the termination of war.

Will the consumer be prepared to buy the previous stocks at war time prices becaus the traders have bought them at these prices? If the answer can be given in the affirmitive,then certainly I regard it as the duty of the Government to compel the traders to sell their pre-war stocks at the pre-war prices. But if the answer is in the negative and the consumer or the Government is not prepared to share in the losses, then most certainly they have no right to deprive the traders of their profits. The policy of controlling previous stocks amounts to 'head I win, tail you lose'. From the practical point of view such a policy has nothing to recommend itself. During the normal course of business, prices rise and fall due to various causes and traders have to share the fortunes and misfortunes.

Normally they have to sell their stocks at the prevalent prices irrespective of the fact whether they brought their stocks above those prices or below those prices. The rise in prices of all commodities is not entirely due to war. For instance the price of sugar even a month after the declaration of war was not so high as it was four or five months before the declaration of war. The index number of wholesale sugar price in April 1939 was 109, if we take the August 1939 price as 100. At the end of September 1939 it rose only to 103. On 1st October 1936 it was only 88.

Realising all the implications of the situation we decided that it is not advisable to take charge of the existing stocks. We also realised that we could not control the prices of imported articles. There was a demand that the prices of foodstuffs must

same time a state of war necessarily means a disturbance in the level of prices, and it will be well to practice economy and so conserve their resources.

The Formation of Trader's Associations.

After we had issued the first communique, we felt the necessity of putting into practice our main idea of forming associations of the dealers. As the prices of medical and pharmaceutical products were rising and we felt that these were essential necessaries of life, we decided that this should be our first work. We were successful in forming an association of the chemists. The next important question before us was to see how the rising tide of prices could be checked. The press was full of complaints of the consumers of which we were conscious. Although there was some exaggeration, on the whole there was much justification in the complaints of the consumers. The press was also pouring suggestions as to what the Government should do. To be frank, I admit that some people have been disappointed in what we have done. They wanted a thorough and a drastic action. For instance, it was said that the Government must take the control of entire existing stocks and sell these at the pre-war prices. In their opinion there was no justification in charging higher prices for those goods which the dealers had obtained at pre-war price. Before I develop this point, I want to make one thing clear, which most people have forgotten during the last few months. The Government is not only the representative of the consumers but it is also the representative of the producers and dealers also have equal rights to make themselves heard. For an impartial Government it is equally important to respect the wishes of this class(traders), and to defend their legitimate rights and interests.

The Implications of Stocks.

On grounds of social justice there could be no objection to the Government's taking control of stocks and compelling the dealers to sell at pre-war costs, and to prevent them from making any extra profits. But such stocks however big those may be are bound to get exhausted sooner or later and rather sooner than later. A vague misunderstanding exists in the minds of general public that big stores have huge stocks of articles which could last for several months at least. This is not correct. Big traders repeatedly renew their stocks and hardly a week passes when ordinarily fresh stocks are not bought to take place of the depleted stocks. If no fresh stocks were added every week, the staple articles would be exhausted even in big stores in a month's time. What will happen when these stocks are exhausted? Fresh stocks must be sold at prices consideably higher than the previous stocks owing to the rise in the price of imported articles, over which we can exercise but little control.

Communique No. 1.

As is being done elsewhere in India, Government has been giving close attention during the last few days to the question of the rise in prices which has followed on the outbreak of war. A Committee under the Chairmanship of Mr. S. M. Bharucha (Additional Revenue Secretary) has been sitting to study the problems arising out of the situation and to advise Government from time to time on the measures that may be necessary.

There is now in force in the Dominions a Regulations closely following the provisions of the Defence of India Ordinance. These provisions cover a wide field and give Government emergency power to deal with the public safety and interest during a state of war.

The Rules under this Regulation give, among many other things, power, so far as may appear expedient for maintaining supplies and services essential to the life of the community, to control prices and to regulate the storage and consumption of articles of any description. In other words power is provided to deal with profiteering on the one hand by dealers and with hoarding on the other hand by the public. For infringement of the Rules heavy penalties are provided.

Attention is invited to the Gazette Extraordinary of the Government of India dated the 8th September, which has appeared in the press, which, so far as provincial Governments are concerned, limits control to necessaries such as medical supplies, foodstuffs, salt, kerosene oil and the cheaper qualities of cotton cloth. While this limitation does not apply to this Government, it may be taken that the attention of the Committee will be directed to the same range of commodities.

Intervention by the Government in the operations of trade and of the laws of supply and demand is always attended by difficulties, and care must be taken that regulation of prices does not bring with it greater evils than it is sought to remedy. The Government confidently relies on the advice and cooperation of dealers, both wholesale and retail, who will be taken into the confidence of the Committee and will be welcome to approach it whenever they desire. It is in their power, at a moment when other means of helping in the prosecution of the war are not yet open, to do this service to the community, namely to assist in maintaining at a steady level the economic life of Hyderabad.

On the other hand it is the bounden duty of every loyal citizen to abstain from all forms of hoarding and not to store commodities beyond his normal limit of consumption. There is no occasion for alarm. There is nothing, as the Government of India have stated, in existing conditions to justify abnormal rise in prices. At the

ment to control the prices of imported articles. I think it will help a good deal to understand our limitations to control the prices of imported articles if we describe the system of control in England and then compare it with the conditions prevailing in India.

The System of Price Control in England.

In England trades have their own associations which control and regulate the conditions of trading of their own members through mutual good will. I shall illustrate this with an actual example of the book trade. There are about two dozen big book exporting firms in London. They have formed themselves into an association. All book exporters, in order to get the trade terms from the publishers must be members of this association. The association meets every Thursday to discuss their problems. If any of its members finds any difficulty in realising the proceeds of the sales of the books to importers in the other countries, the names of such booksellers are notified to this committee which keeps a list of such defaulting importers. In case of serious defaults the names of such importers are put on the black list and it becomes impossible for such defaulting firms to buy books from any exporter.

Similarly there are associations of importers of various articles. These associations are very powerful bodies and their internal discipline is very high. Along similar lines there exist associations of distributors and retailers. If any retailer does not observe the regulations of his association, the matter is reported to the distributor's association which stops all supplies to such retailers and a similar violation by a distributor results in the stopping of the supply by the importors' association.

In England if the Government want to control the retail price of any article, all that the Minister of Supply has to do is to summon the secretary of the importors' association and to communicate his wishes to him. The rest of the work is done by the various trades association. England is in a very powerful position to control the prices of several important imported articles as it is one of the biggest importors of foodstuffs and is almost in a monopolistic position to dictate her terms.

The Necessity of Trades Associations in India.

In India the types of associations we have described above hardly exist, and if they exist at all, they are merely on paper. Therefore from the very outset it was realised by us in Hyderabad that if a control was at all to be exercised properly it must be exercised through the trades associations. If such associations did not exist, efforts should be made to form such associations and we directed our efforts towards this end. After our first meeting we issued the following communique.—

The Notification issued on the 19th December 1939 further extended the above list so as to include (1) all requisites incidental to leather manufacturing industries; (ii) screen paper, (iii) silk ribbons and (iv) acids.

In a circular letter addressed to all District Officers, the Secretary to the Government of the Province, stated that District Officers should watch the movement of prices in their districts and institute prompt action to stop profiteering; but it was also stated that "price fluctuations of 10 to 20 per cent over the rates ruling on September 1 should not be regarded as coming within the meaning of profiteering". In a circular letter to District Officers dated the 8th December 1939, the Government of the United Provinces point out that "the price of any article ruling in any particular market depends on the price of that article in other markets. The unit of price control cannot, therefore, be the district and Government have therefore under contemplation the setting up of a provincial body to advise regarding the control of prices. This body has not, however, yet been set up and the present situation in many districts gives cause for anxiety". The same letter therefore advises District Officers to keep a watch over profiteering and to take such action as they think necessary. It is understood that the Government of the United Provinces has now appointed a Controller of Prices who is to be assisted by an Advisory Committee.

II.

The Difficulties of Price Control.

The perusal of the above summary clearly indicates the difficulties that beset the Controllers of Prices. These difficulties were emphasised by me three years ago in my State and Economic Life*.

Price Control Committee in Hyderabad.

H.E.H. the Nizam's Government soon after the declaration of war set up a Committee to control prices, and I was also made a member of this Committee.

This Committee has been tackling the Problem most realistically and it is a model for the other provinces to follow. How far this statement is correct, I will leave it to the readers to judge after they have studied our system.

At our very first meeting, we asked ourselves what we were going to do and how far we could do it effectively. The Committee from the very outset realised how difficult it was to control prices and to tamper with the forces of supply and demand and we also discussed our own limitations. In a country like India with 300 millions of small producers and millions of small shop-keepers, it is impossible to control prices or to fix a minimum price by a fiat of a committee. In India it has been often emphasised that England through its Supply Department is successfully controlling the prices of several imported articles and why should not the Government of India set up a similar depart-

* The State and Economic Life, New Book Co., 1938.

tory on every dealer in essential commodities to produce his books and furnish such statements regarding prices as the Inspectors of Prices may demand. The Controller or Inspector of Prices may also enter any premises in which trade in essential commodities is carried on with a view to compliance with this Order. The other Order is the Sind Control of Prices Order which authorises the Controllers of Prices to control prices in their respective areas in whatever manner they consider necessary.

The action of the Sind Government has so far been limited to the collection and communication of weekly statistics of prices in Karachi and in the districts and to inquiry, through Inspectors of Prices, accompanied with threat of action in cases where particular prices are not in accordance with Karachi or all-India prices.

The only commodity in the case of which definite price limit was fixed was Java Sugar and the control, as the Chief Controller of Prices observes (letter of the 30th December 1939), was not a success, partly owing to a combination of the merchants and commission agents concerned, and partly because Java Sugar was not controlled in any other market. The Order fixing the maximum price was, therefore, cancelled on the 23rd November.

Reporting on the working of the price control measures the Chief Controller of Prices points out that in view of the rise in prices of most commodities it is necessary to excercise a stricter control than has been possible so far; and that "a stage has been reached at which it will be necessary in the opinion of the Government of Sind to set up a machinery involving the engagement of a large staff, if the same control as has been exercised in the past is to be maintained".

The Government of Sind are also enquiring into the possibility of opening cheap grain shops in Karachi (letter dated the 30th December 1939).

THE UNITED PROVINCES.

The Notification issued on the 9th September 1939 by the United Provinces Government gave the following list of articles which would be treated as "essential commodities" under the Defence of India Rules:—

1. Medicinal and Pharmaceutical products;
2. Surgical instruments;
3. Salt;
4. Machine Manufactured cloth;
5. Vegetable and Mineral Oils; and
6. Dairy Produce.

down country markets and in the absence of control of prices of agricultural produce both in the Punjab and United Provinces the price of wheat and sugar showed a steep rise. So long as the latter refrain from controlling the price of agricultural produce no system of price control here will function well. The Provincial Government's policy is to allow prices to rise gradually as prices rise elsewhere".

ORISSA.

District Magistrates have been authorised to keep a careful watch on the movement of prices and to take action if and when cases of gross profiteering come to their notice. No attempt has been made to fix maximum prices and no Controller of Prices for the Province as a whole seems to have been appointed.

The Press Note issued on the 23rd December, however, stated that "careful investigation shows that though the rise in prices of some of the more important commodities like sugar and cloth was due to causes beyond the control of this Government there has been a deliberate attempt on the part of some traders to enhance prices to a level that can, in no circumstances, be justified". It warned the traders against profiteering and stated that unless profiteering was stopped, the Government may have to take drastic action.

PUNJAB.

District officers have been empowered to exercise all powers in respect of price control and the notification issued on the 9th September delegating these powers to District Officers stated that they should fix prices of certain articles on a 10 per cent increase basis. This notification also made it clear that "at present at any rate, except for gur, it is not intended to fix maximum prices for agricultural commodities including food-grains and cotton."

The circular letter addressed by the Joint Chief Secretary to the Government of the Punjab to Deputy Commissioners directed that small committees of non-officials should be appointed in each district to advise them on matters connected with price control.

SIND.

The Notification issued on the 12th September 1939 appointed the Revenue Commissioner for Sind to be the Chief Controller of Prices for Sind and the District Officers to be the Controllers of Prices for their respective districts.

The Government of Sind have also passed two Orders regulating the control of prices. The Sind Control of Prices (Production of Books) Order makes it obliga-

September that "all wholesale or retail dealers in the districts who obtain goods from outside are warned that if they import goods at a rate higher than the control rate in the district they will do so at their own risk. They are advised to report to the Deputy Commissioner all cases in which a down country dealer has quoted a rate above the controlled rate in the district. The Deputy Commissioner will then report the case to the Government, who will ask the Government of the Province concerned whether the rate quoted is within their controlled rate".

It was also noticed that the fixing of different prices in some districts of the North West Frontier Province and the Punjab resulted in large transfers of grain being made from the former to the latter province. The Government of the North West Frontier Province took notice of this tendency and informed Deputy Commissioners that Executive order forbidding the export of wheat, barley, gram, maize and gur should be issued and that no exports should be allowed except under permit (September 26th and 27th 1939).

Writing on the 13th October 1939, the Secretary to the Government of North West Frontier Province informed Deputy Commissioners that complaints had been received about the difficulty in carrying out the control of prices on the 10 per cent basis; and that it was advisable to have maximum wholesale and retail prices fixed. Such prices were fixed for Peshawar, and Deputy Commissioners were advised to fix similar prices in their districts taking the Peshawar prices as a base. In short, the previous method of fixing prices on a 10 per cent increase basis was abandoned and a new system of enforcing maximum prices was instituted on the 13th of October.

Reports of the Secretary to the Government of the North West Frontier Province express general satisfaction with the working of the price control measures in the Province and state that stocks of commodities are ample and that there is no panic in the market, though prices are gradually rising, mostly in sympathy with a rise in other Provinces.

Writing on the 15th December, 1939, the Secretary to the Government of the North West Frontier Province explains the difficulties of price control in the Province as follows:—

"Following the announcement of the Punjab Government early this month that it was not proposed to control the price of agricultural products in that Province the Price of wheat in local markets rose sharply and at the same time stocks in hand showed a growing tendency to leave the Province, where profits are subject to control, for areas where no such control exists. This Province is largely dependent on imports of both agricultural produce and other necessaries of life from

sort to the powers which they posses to fix maximum prices and use the provisions of the Defence of India Act to put down profiteering, the inevitable result will be dislocation of trade and considerable hardship will necessarily be caused to the mercantile community. In their own interests, therefore, merchants should be advised to see that the work of these committees is a success and to co-operate with them to that end.

The special problems facing the Government of Madras are the excessive fluctuations in the prices of sugar and dye stuffs. Since both of these commodities are generally imported into Madras from other provinces and from abroad, the Madras Government feel that it would be extremely difficult for them to take any effective action in steadying down their prices.

NORTHWEST FRONTIER PROVINCE.

The control of prices in the North West Frontier Province began to operate on the 19th September 1939, when by a Notification powers were conferred on the district authorities to fix the maximum prices of certain scheduled articles both for the wholesale and retail trades. Simultaneously a Provincial Price Control Committee was constituted to lay down general lines of action. With this Committee representatives of different trades were associated. District Advisory Committees were also established which helped the District authorities in the actual fixation of scheduled or essential commodities and day-to-day control of prices and allied matters.

The list of articles for which control of prices was made applicable was published on the 18th September, and included:—

(i) All food grains, meat of all description, etc.:

(ii) Sugar, gur, tea, milk, ghee, vegetable oils, salt, etc.:

(iii) Fuel, viz., charcoal, wood fuel, steam coal, keresene oil, etc.:

(iv) Soap, matches, cheaper qualities of cotton cloth, etc.

The Notification of the 19th September, 1939 added a list of medicinal supplies which was further enlarged by the Notification of the 21st and 22nd September.

The Notification of the 26 and 27th September further added Steel, Iron, Barseem seed to the list of essential articles.

According to earlier notifications an increase of 10 per cent over the 1st September prices was allowed in the case of all these articles. But it soon became apparent that the prices of some of the articles received from the Punjab had exceeded 10 per cent and orders were issued by the provincial Governments, on the 26th and 27th

MADRAS.

The Government of Madras issued a warning to the Commercial community against profiteering on the 6th September 1939 and this warning was repeated in several other press notes. But the Communique No. 96 issued on the 26th October stated that "the Government have examined the trend of prices of essential commodities and observe that although, the warning has had some effect on steadying prices, there are still indications in certain localities that prices remain unduly high".

The same communique authorised the District Magistrates of four districts to set up local committees with a view to obtaining their advice on matters connected with price control. According to the Communique, the committees "will confine themselves to determining and publishing what they consider to be a fair price for essential commodities, viz., rice, dry grain, pulses, salt, sugar, chillies, matches and cheaper varieties of cloth produced in the Province. The price so determined may be called a mean fair price. It will not be a maximum price which cannot be exceeded without infringing the low. The Government, however, trust that prices fixed in this manner will generally be adhered to and that there will be no necessity to make use of powers which they possess to fix prices by legal notification."

Local Advisory Committees for collecting and publishing a list of "fair mean prices" have now been established in about ten districts out of the 26 districts in the Province: and collectors of other districts have been empowered by the Government (reference G.O. No. Ms. 2237 of the 14th Dec. 1939), to form such committees wherever they think them necessary. But the Government point out that it is not intended that these committees should have any powers for fixing prices; and "the Government have some reason to fear that the functions of these Advisory Committees have been misunderstood even in certain cases by the members of the Committee themselves. The object of forming the Committees is to ascertain and publish a fair price for essential commodities in the light of local conditions, *e.g.*, transport facilities, distance of wholesale supplies, etc."

It will thus be seen that the Government of Madras have not adopted any control of prices in the strict sense of the term, since they believe that "if wide publicity is given to the committees' decisions it ought to be possible to prevent a higher price being charged to the poor and the illiterate than those who are better informed. The only sanction behind the committees' decision is that of public opinion and success will, to a large extent, depend on the local influence of the persons selected."

Merchants and traders have, however, been warned by the press note of the 14th December, 1939 which states that if in the end the Government are compelled to re-

meantime, the Government has appointed a Controller of prices and also set up a Consultative Committee of non-officials for the purposes mentioned below:—

(i) to advise the Controller as regards maximum prices, commodities to be controlled, etc;

(ii) to report to Government on arrangements for finance and as to the number and location of cost price shops;

(iii) to advise the Controller regarding the purchase and supply of commodities required for the cost price shops and generally regarding their organisation.

CENTRAL PROVINCES AND BERAR.

The Government of Central Provinces and Berar issued a press communique on the 8th of September 1939 warning traders and merchants against profiteering and issued the Central Provinces and Berar Control of Prices Order on the 26th September 1939. The principal features of the Order are that the Director of Industries will act as the Price Control Officer for the Province and that the officers primarily concerned with the control of prices will be the deputy Commissioners. The Deputy Commissioners will fix maximum prices for certain essential commodities for their district in consultation with the Advisory Committees consisting of merchant cinsumers and chairmen of local bodies in the district.

In the list of articles for which control of prices was applicable according to the Order issued on the 26th September, agricultural produce and grains were included. Amendments issued on the 1st of November omitted these articles from the operation of price control regulations; but the notification issued on the 11th December 1938, brought them again under the control.

The latest press note issued on the 22nd of December 1939 states that the Government have decided to appoint a Provincial Price Control Board at Nagpur. "The Board has been so constituted as to include representatives of agriculturists, dealers in grain, workers and employers of labour. The first meeting of the Board will be called as early as possible, when the action taken so far in regard to control of prices, the results achieved, the difficulties noticed will be explained. Government hopes that this step will further tend to reconcile the conflicting view points and to ensure arrangements satisfatory to all interests concerned."

Writing again on the 3rd January 1940, the Secretary to Government of Bombay expressed his considered opinion regarding the failure of price control on the basis of a fixed percentage increase in prices as follows:—

"The Government of Bombay desires to report that the fixing of maximum prices on a percentage basis has been found to be unworkable in actual practice for the reasons given below:—

"(1) The 1st September prices are now quite out of date and bear no relation to the prevailing prices.

"(2) It is difficult for an ordinary consumer to ascertain the 1st September selling prices of the retailer in each case.

"(3) It is difficult to ascertain and fix the increased cost of production or increased replacement costs in each case.

"(4) The Bombay Province being dependent chiefly on imports from other provinces or from overseas, the replacement costs of individual dealers vary from time to time and no price level can, therefore, be fixed for enforcement.

"(5) There is lack of information with regard to wholesale prices prevailing in the markets of the chief producing provinces.

"The Government of Bombay has, therefore, come to the inevitable conclusion that action by individual provinces will not avail and that a co-ordinating authority requires to be set up immediately which would see that simultaneous action on some uniform lines is taken by the Privincial Governments. The Government of Bombay considers that the Central Government should work as a co-ordinating authority also. Unless the chief grain-producing provinces undertake to control unwarranted increase in the prices of the chief agricultural commodities produced in their provinces, it would be difficult for the importing provinces to control the prices in their areas. Some machinery requires to be set up by which the provinces may be enabled to obtain regularly at least bi-weekly, the wholesale prices of some of the important articles of foodstuffs and other necessaries of life. This information will enable the local government to see whether the prices prevailing in their province are fair or not."

The Government of Bombay proposes to open about 20 cost price shops in Bombay City to check profiteering by retail dealers and hope to increase the number of these shops if their utility is established by the experience gained hereafter. In the

The commodities for which prices are controlled may be grouped as follows:—

(i) Spices and Vegetables;
(ii) Matches;
(iii) Kerosene Oil;
(iv) Dal;
(v) Sugar;
(vi) Flour and Ata;
(vii) Wheat;
(viii) Salt;
(ix) Cocoanut Oil and Mustard Oil;
(x) Certain patent medicines and medicinal supplies.

It should be recognised that the success of price control in Assam, Bihar and Orissa is intimately bound up with such success in Bengal, because the former receive a large bulk of their consumable commodities from Calcutta and the neighbouring Bengal markets. The reports from Assam, Bihar and Orissa indicate that the fluctuations of prices in Calcutta greatly affect prices in these Provinces also and that Assam, Bihar and Orissa have generally to base their prices on those ruling in Bengal.

BOMBAY.

The Bombay Regulation and Control of Prices Order was promulgated on the 9th September 1939, and orders were issued fixing the maximum prices of rice, sugar, jawar, beef, bajra, mutton, *til* oil, quinine and some other medicines above the prices prevalent on the 1st September 1939. Additions were made to the list of medicines and drugs on the 14th September 1939. Further orders were issued on the 22nd September 1939 allowing an "increase of 10 per cent over the 1st September prices in the case of certain articles of foodstuffs and an increase of 20 per cent in the case of imported medicines and drugs in additions to the increased cost of production or replacement costs."

The Secretary to the Government of Bombay writing to the Secretary, Economic Resources Board, on the 4th December 1939, observes that "it is not easy to work these orders in practice. The business community contends that in addition to replacement costs they should be allowed at least the same margin of profit as they were making before the outbreak of war because as replacement costs increase the margin of profit tends to decrease."

BIHAR

District Officers have been empowered to control prices in Bihar in consultation with local Advisory Committees. The Provincial Government have specified the following articles in respect of which price control would be exercised:—

I.	II.	III.	IV.	V.	VI.
Rice	Fish	Salt	Mustard Oil	Ordinary lungis	Medicines
Dal	Goat's meat	Chillies	Kerosene Oil	Ordinary dhuties	Medicinal Supplies.
Flour	Mutton	Turmeric	Matches	Ordinary saris	
Wheat	Beef	Onions		Ordinary shirting	
Gur	Milk	Spices		Gamcha	
Sugar	Ghee	Sattoo			
	Butter	Chura			

The most important work done in connection with price control in Bihar is the collection as quickly as possible of the latest wholesale price quotations of principal commodities which are imported into the Province mainly from Bengal. The District Officers only supervise the trend of prices and their work is mainly limited to preventing any undue rise in the prices of specified commodities. The Controller of Prices and Supplies, Bihar, in his letter to the Secretary, Economic Resources Board observes that "indeed it is the only practical way at present, but the Provincial Government recognise that it is not enough". But Bihar depends on outside markets for almost all the "essential" or specified commodities and as these prices fluctuate greatly from day-to-day, the Government consider that price control by fixing maximum prices for any fixed period of time would be unfair to traders and would also cause considerable dislocation in the smooth working of Bihar markets.

BENGAL

The control of prices in Bengal is vested in the Controller of Prices who has been authorised to fix the maximum wholesale and retail prices of "essential commodities", to vary the list of articles to be brought under price control schemes and generally to supervise all matters connected with price control. The fixation of prices for Calcutta is done by the Controller of Prices in consultation with the Advisory Council consisting of representatives of trade, commerce and public experts. The wholesale and retail prices of certain commodities including medicinal supplies are fixed for Calcutta from time to time and are published immediately for the guidance of the buying and selling public.

The District Magistrates have been similarly appointed Controller of Prices for their respective districts and they have been empowered to fix prices in consultation with Advisory Committees representing various interests.

control of prices would be vested. Generally speaking the Deputy Commissioner or the Sub-Divisional Officer, as the case may be, is the chairman of each committee. The chairman is empowered to nominate members representing consumers and traders respectively. The chairman of local or municipal boards are also ex-officio members of the committee and the chairman has the right to co-opt such other members as he thinks advisable.

These Advisory Committees are in charge of all matters relating to price control in the areas for which they function. It is left to the Deputy Commissioner to decide, with the help of these committees, what foodstuffs and other articles need have their prices fixed in each area; and the instructions issued to the Deputy Commissioners by the Special Officer in charge of price control state that "it is not necessary to fix a price if the ruling price is reasonable, in which case it may be left to stand by itself."

Assam generally receives a large bulk of its goods from Calcutta and the prices fixed in Assam have therefore to be based more or less on prices ruling in Culcutta. The circular letter issued by the officer on Special duty to the Deputy Commissioners on the 2nd of October 1939 states that "the chief problem in this Province is to ensure that regular supplies are duly sent from Calcutta and this matter is being taken up in consultation with the Government of Bengal".

Regarding the actual working of the price control scheme enquiries were invited by the Assam Government from all the District Officers; and towards the end of November, the situation, as generally reported, was that in most of the districts price control by fixing maximum prices had been suspended, because it was generally agreed that there was no need of it. But by the beginning of December prices began to rise again, largely in sympathy with the rise in Bengal and maximum prices had to be fixed again in some districts.

It should however be noticed that, generally speaking, prices have not been fixed for grain produced in Assam because in most cases it appeared that the rise in prices was a necessary result of the rise in prices in other provinces.

The list of prices of controlled or uncontrolled commodities has not yet been received by the Economic Resources Board, but the letter of the Deputy Secretary to the Assam Government received on the 11th of December states that "this Government have already asked the District Officers to furnish a report as to how the control schemes are working and the prices of controlled commodities are moving in their area and that when their replies have been received a report will be submitted."

The rise of prices was no longer confined to the imported articles. The price of indigenous food-stuffs and other necessaries of life also jumped up. Under the circumstances it became inevitable for the Provincial Governments to do something. It must be said to the credit of the Provincial Governments that they gave their earnest attention to the problem and did all that they could as soon as circumstances permitted. But as we all know the earliest action of a bureaucratic government does take considerable time. The machinery to ease the situation could not be set up until the tide of rising prices had reached its peak and had exhausted its power to rise, and of itself was showing clear tendencies to recede.

The intentions of most Provincial Governments were honourable and they, I believe, really wanted to help the consumers but they could not act promptly owing to their own inherently rigid structure. The situation has been well described by poet Ghalib who says:

میں نے مانا کہ تغافل نہ کروگے لیکن
خاک ہوجائینگے ہم تمکو خبر ہونے تک

which means:

"I admit that you will not remain indifferent,
But I shall be buried in the earth before the news reaches you".

Almost within a fortnight of the declaration of war some sort of machinery was set up nearly in every province to check excessive profiteering. Before discussing the problem of price control it seems desirable that we should acquaint ourselves with the machinery that has been set up for this purpose in the different provinces. Ordinarily it is almost impossible for an academic economist to get the necessary information about the activities of all the provincial governments in any reasonable time. I have been fortunate to have access to the memoranda prepared by the Economic Advisor to the Government of India describing the action taken by the Provincial Governments to control prices. In view of the difficulties of the academic economists to get such handy reliable information, I feel that an apology is hardly necessary for giving a summary of the activities of the various Provincial Governments regarding the control of prices, so that the matter could be realistically discussed later on.

I.

A Summary of Price Control Measures in Various Provinces.

ASSAM

The Assam Control of Prices Order was passed on the 11th of September, 1939. This Order provided for the establishment of local advisory committees in whom the

CONTROL OF PRICES IN INDIA.

BY

ANWAR IQBAL QURESHI.

The advent of the war has created many problems for economists to consider. One of these problems which is being prominently discussed these days is how to control the tide of rising prices.

The Government of India was prompt enough to relise the implications of the situation that was created by the declaration of the war, and issued an ordinance to control prices, especially the prices of the necessaries of life, and to discourage profiteering. Under this Ordinance rights were given to the Provincial Governments to control the prices of the necessaries of life. The Government of India reserved to itself the right to control the prices of imported articles.

The very moment the news of the declaration of war reached India, the prices of almost all commodities began to rise very hectically, and a panic was created in the country. There was no economic justification for this phenomenal rise of prices at this early stage of the war. But who cares for economic calculations at periods of crisis? The merchants wanted to make as easy money as possible. This was but natural. It has been alleged that merchants and shopkeepers withheld stocks and were guilty of exploiting the situation. Many consumers were equally guilty on the same charges. They aggravated the situation by buying far in excess of their normal demand with a view to hoard as much as possible. But in my opinion the chief culprits were the big merchants who were trying to corner the market by buying all the possible stock from small traders. A major part of the hectic buying that was going on during the first and second weeks of the war was mainly by the big merchants with a view to hoard and to exploit the consumers later on. Cases on a very large scale have come to the notice of the writer in which merchants in big towns sent their agents to the interior where the prices had not risen so much, to buy all the available stocks from the small shopkeepers.

A few days after the declaration of the war the panic grew so great that prices began to rise almost every hour especially of medical and pharmaceutical products, the main source of supply of which was Germany, from where goods could no longer be imported because of the war.

BOARDS OF RESEARCH

Qazi Mohammad Husain, M.A., LL.B. (Cantab.),

Pro-Vice-Chancellor, (President).

MEMBERS.

Faculty of Theology

1. Justice Nawab Nazir Yar Jung Bhdr,
   LL.D. (Dublin), (Dean).
2. Abdul Haq,
   B.Litt., D.Phil. (Oxon.).
3. Zahiruddin Ahmed,
   D.Litt. (Egypt).
4. Muhammad Hamidullah,
   M.A., LL.B. (Osmania), D.Phil. (Bonn), D.Litt. (Paris).
5. Maulana Manazir Ahsan Gilani,
   (Secretary).

Faculty of Arts

1. Hosain Ali Khan,
   B.A. (Oxon.), Bar-at-Law. (Dean),
2. Haroon Khan Sherwani,
   M.A. (Oxon.), Bar-at-Law.
3. Muhammad Nizamuddin,
   Ph.D. (Cantab.).
4. Khalifa Abdul Hakeem,
   M.A., LL.B. (Punjab), D.Phil. (Heidelberg).
5. Abdul Haq,
   B.Litt., D.Phil. (Oxon.), (Secretary).

FOREWARD

For various reasons it has been thought advisable to divide the 'Journal of the Osmania University' into two separate volumes; one dealing with Scientific subjects; the other relating to Arts and Theology. The present issue deals only with the latter. Articles, as before, are published both in Urdu and English languages with this provision that the synopses of articles written in one language is given in the other, so as to extend the scope of their usefulness.

CONTENTS.

JOURNAL

OF

OSMANIA UNIVERSITY

(FACULTIES OF THEOLOGY & ARTS)

VOL. VII.,

1349 Fasli

1939—40 A.D. 1358—59 A.H.

ISSUED BY THE BOARDS OF RESEARCH (THEOLOGY & ARTS),

OSMANIA UNIVERSITY

HYDERABAD-DECCAN

JOURNAL

OF

OSMANIA UNIVERSITY

(FACULTIES OF THEOLOGY & ARTS)

VOL. VII.

1349 Fasli

1939—40 A.D. 1358—59 A.H.

ISSUED BY THE BOARDS OF RESEARCH (THEOLOGY & ARTS),
OSMANIA UNIVERSITY
HYDERABAD-DECCAN

PRINTED AT THE OSMANIA UNIVERSITY PRESS.
(ENGLISH SECTION)